ہمارا ادب

1986

نمبر



ہمارا ادب

۸۷—۱۹۸۶ء

شخصیات نمبر ۳

نگران و مدیر اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

ترتیب

محمد احمد اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر

ناشر: سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز۔

مطبع: فوٹو لیتھو ورکس۔ دہلی

کتابت: غلام نبی کول۔ ملارٹہ

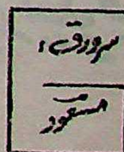
تعداد: ۵۰۰

قیمت:

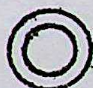


مضامین میں ظاہر کی گئی آراء
سے اکیڈمی یا ادارے کا کُلّاً یا جزواً
اتفاق ضروری نہیں۔





ترتیب





میرواعظ مولانا محمدؐ یوسف



آغا سیّد یوسف الموسوی



پنڈت ایشور کول



پنڈت مکند رام شاستری



خوشی محمد ناظر



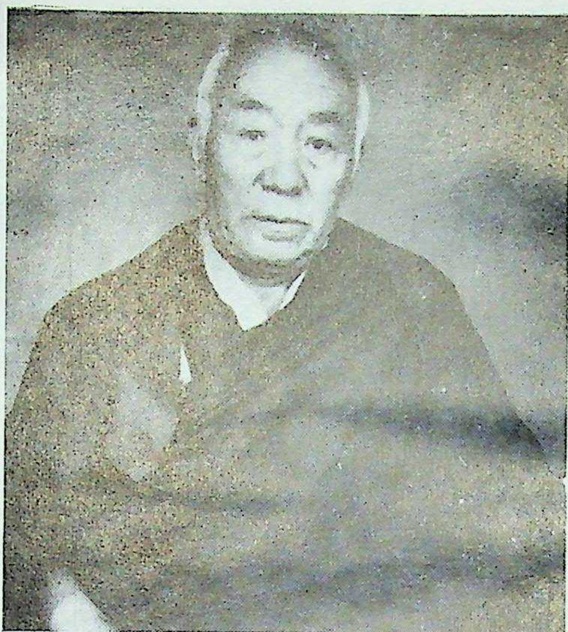
جیوتشی وشویشور



پریم ناتھ پردیسی



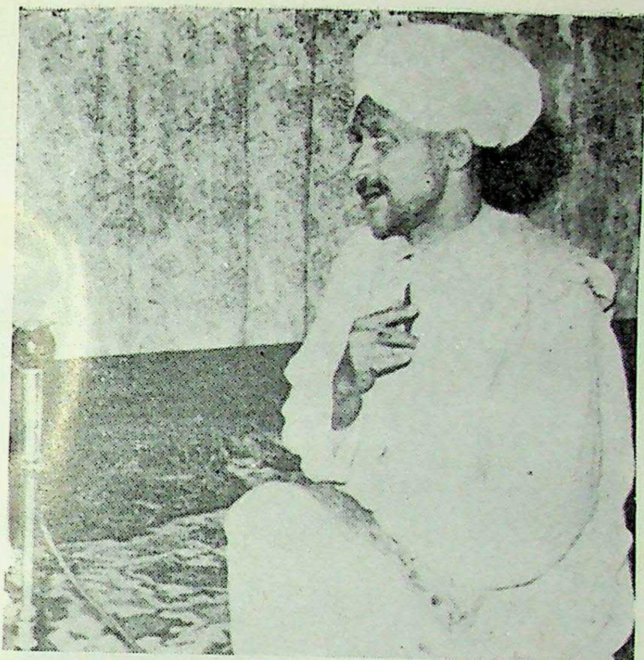
دیوان نرسنگداس نرگس



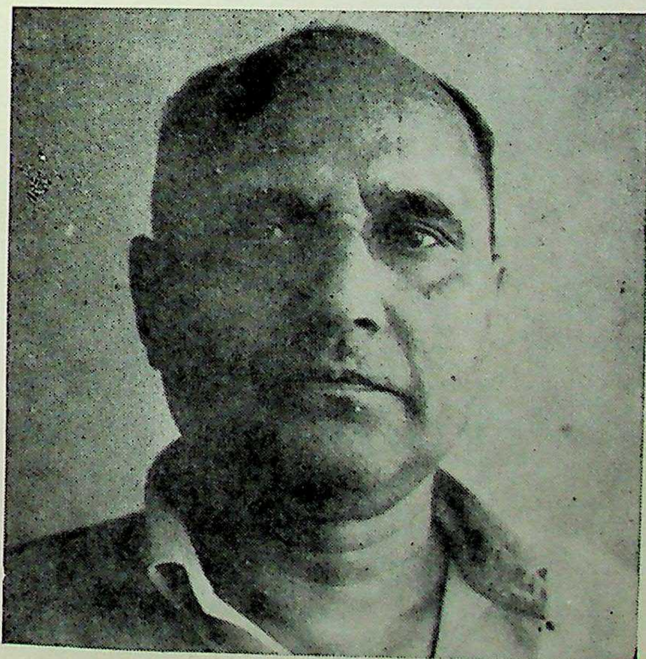
گیشے ایشے ٹنڈوپ



پروفیسر سری کنٹھ توشخانی



تظام الدّین (نظہ صاؒب)



ٹھاکر پونچھی

پیش گفتار

خاکہ نگاری اردو میں ایک مختلف، ممتاز اور منفرد صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اردو کے کچھ چوٹی کے مشاہیر نے اس صنف میں طبع آزمائی کر کے اس پر ایک طرف تو اپنے طرز اور شخصیت کے نقوش چھوڑے ہیں اور دوسری طرف اس کے تخلیقی امکانات کو دریافت کر لیا ہے۔

سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، رشید احمد صدیقی، خواجہ احمد فاروقی، سعادت حسن منٹو۔ صباح الدین عمر عبدالرحمن اور دوسرے بہت سے قدر اول کے ادیبوں نے اس فن میں اپنے اپنے مزاج کے مطابق نئے رنگوں اور روشنیوں کا اضافہ کیا۔ اردو کے سب سے بڑے رسالے 'نقوش' لاہور کے شخصیات نمبر اس صنف کی دستاویزی مثالیں ہیں۔ خود اس رسالے کے مدیر محمد طفیل ثم محمد نقوش نے اردو میں صرف ایک خاکہ نگار کی حیثیت سے اپنی الگ حیثیت قائم کی۔

خاکہ نگاری کے تجربات میں اردو میں جو روایت استوار ہوئی ہے، اس کا رخ ظاہر سے باطن کی جانب ہوتا ہے۔ خاکہ نگار اپنے موضوع کے جنم، بالغ اور مرن کی جزئی اور خالصتاً خارجی تفصیلات کی کھتونی میں ہی الجھ کر نہیں رہ جاتا۔ یہ کام تو ایک اخباری رپورٹر یا وفات نامہ (obituary) کے کالم نگار کا ہے۔ مستند خاکہ نگار اپنے قلم کو ایک سرچ لائٹ (Search light) میں تبدیل کر کے اپنے مشاہیر کا رخ زیر کار شخصیت کے نمایاں ابھاروں سے ہٹا کر ان پوشیدہ کونوں کھدروں کی طرف

جاتا ہے جہاں سے اُس خاص شخصیت کی انگ... تے پھوٹتے ہیں۔ وہ مہک جو اس کو ہجوم میں امتیاز اور انفرادیت بخشتی ہے۔ خاکہ نگاری رنگوں کی کثرت کی بجائے ان کی کفایت کا متن ہے۔ شوبھا سنگھ کی تصویر کے جاذب رنگوں کی بجائے حسین کی مدر ٹریسا کے ضرب ہو قلم شخصیت کا بہتر عرفان پیدا کرتے ہیں۔ یہی بات تحریری خاکوں کے لئے بھی صحیح ہے۔ ایم الیف حسین کی ایک اور تصویر میرے ذہن میں چمکتی ہے۔ اس میں گاندھی جی چل رہے ہیں لیکن ان کے ہاتھ میں لاٹھی روشنی کی تیز کرن بن گئی ہے۔ یہ stroke تصویر کو اس قدر بصیرت افروز بناتا ہے کہ الفاظ معانی کی ہیبت سے دم توڑ دیتے ہیں۔

قدرت نے پھولوں کو رنگ بھی دیا اور مہک سے بھی شرابور کیا۔ لیکن ان کے چہرے ایک جیسے ہوتے ہیں اور کسی خاص ذات species کا کوئی ایک پھول بھی سارے قبیلے کا ترجمان بنتا ہے۔ اسی طرح طائروں اور جانوروں میں انفرادی شناخت کے خدوخال نظر بھی آئیں مگر ان کا یکساں اور ہم آہنگ کردار انہیں انفرادیت کے انعام سے محروم کر دیتا ہے۔ آلِ آدم کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جڑواں بچوں کے سوا باقی تمام انسانی چہرے بشرے سے ایکدوسرے سے الگ اور علیحدہ ہوتے ہیں۔ جڑواں بچوں کی یکسانیت بھی ظاہری مشابہت سے آگے نہیں بڑھتی اور وہ اپنے عادات، اطوار اور مزاج، مذاق میں ایکدوسرے کی ضد ہو سکتے ہیں۔ خود ایک انسان کی انگلیوں کے نشان اسکی امتیازی مہر ہوتے ہیں اور اربوں انسانوں میں مکرر نہیں ہو سکتے۔ یہ اشارہ قدرت کی حیرت انگیز اور لامحدود طباعی اور بوقلمونی کا ثبوت بھی ہے اور اس حقیقت کا بھی کہ انسان کا شرف اس کی اپنی انفرادیت کے سراغ اور تکمیل میں ہے۔ انسان نے اپنی وحشی خصوصیات کو چھپانے کیلئے اپنی فطرت سے ایک باقاعدہ جنگ چھیڑ دی ہے اور انسانوں نے ہمیشہ اصلی چہروں پہ نقلی چہرے (Mask) پہننے کے فن کو عروج تک پہونچایا ہے۔ خاکہ نگار کا اصل کام اسی مصنوعی قلعہ بندی میں شگاف پیدا کر کے اصل شخصیت کو ابھارنے اور Expose کرنے کا ہے۔ اسمیں خارجی تفصیلات بس وہیں حد تک ہی مددگار ہو سکتی ہیں۔ وہ جو غالب نے کہا تھا قطرے کو گوہر کی منزل

طے کرنے تک مگرمچھوں کے جبڑوں کے کشمکش جیسے مراحل سے گزرنا پڑتے ہیں۔ وہی خاکہ نگار کیلئے بھی صحیح ہے۔ اردو میں منٹو، رشید احمد صدیقی اور محمد طفیل نے اپنے شوخ اور سنجیدہ طرزوں میں اس مشق کو برتا ہے اور انکے کچھ خاکے اردو کے اعلیٰ ادب میں شامل کئے جا سکتے ہیں

کشمیر میں خاکہ نگاری کی روایت مرحوم شمیم احمد شمیم نے اپنے ہفت روزہ "آئینہ" میں شروع کی اور ابتک اسی اخبار میں شایع شدہ خاکے اس صنف میں ہمارے بہترین قلم پارے ہیں۔ "آئینہ" میں برسوں تک ہر شمارے میں ایک شخصیت کا تعارف ہوتا تھا اور پھر تو اسکے کئی شخصیات نمبر الگ سے شایع ہوئے جن میں ان سطور کے لکھنے والے نے بھی اپنی بساط کے مطابق کچھ خاکے تحریر کئے۔ واقعہ یہ ہے کہ شمیم کے جواں مرگ ہو جانے کے بعد اب صرف راقم کو ہی یہ علم ہے کہ "آئینہ" میں شایع شدہ خاکوں میں سے کون کس کے قلم کا شگوفہ ہے۔ مجھے بڑی عاجزی سے یہ بات تحریر کرتے ہوئے ایک مسرت کا احساس ہوتا ہے کہ شمیم اپنی لامثال خاکہ نگاری کے باوجود اس خاکسار کے خاکوں کو بہت پسند کرتے اور بڑے چاؤ سے شامل اشاعت کرتے تھے۔

"ہمارا ادب" میں ہم نے شخصیات نگاری کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اسمیں اگرچہ بنیادی مقصد خاکہ نگاری کو اسکی تخلیقی حیثیت سے ہی استعمال کرنیکا تھا مگر ہمیں اعتراف ہے کہ ہمارے ابتک کے شایع شدہ تین نمبروں میں ہمارا مقصد کُلی طور پر پورا نہیں ہو سکا ہے۔ ہمارے کچھ خاکہ نگار شخصیات کے کھالنے کو اس کے ذہن کے گرداب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بڑی شخصیت پر لکھتے ہوئے اسکی پیچیدہ نفسیات کی بجائے اسکی لکھی ہوئی نظموں کو نقل کرنے پر توجہ دیجاتی ہے اور ان شایع شدہ نظموں کو صفحہ در صفحہ پیش کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان خاکوں کو پڑھنے کے بعد یہی لگتا ہے کہ آپ نے اس شخص کو پورے میک اپ میں اتاری ہوئی فوٹو میں دیکھ لیا ہے اور بس۔ حالانکہ خاکہ پڑھنے کے بعد تو ایسا محسوس ہونا چاہیئے تھا کہ آپ نے اس شخص کو صرف اسکی نکر (nicker) میں دیکھا ہے اور اسکے ذہن کے اندرون میں چھپے ہوئے

اُسکے اعلٰی بشرے اور رویوں کا ایسا سُراغ لگالیا ہے کہ جب کوئی خاص صورتحال سامنے آئے تو آپ یہ پیش قیاسی کر سکیں، اُس شخصیت کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ بہر حال یہ ہم سب کا عجز ہے۔
خاکہ نگاری ایک بہت ہی مشکل فن ہے۔ یہ ایک تجرید کو مجسم کرنے اور ایک ذرّے کا دل چیر کر اُس سے ستارہ طلوع کروانے کی سی دشواریاں رکھتا ہے۔ ہمارے نمبروں میں خاکہ نگاری کی ابتدائی صورتیں نظر آتی ہیں اور بہت شاذ و نادر ان میں کردار نگاری کا ذائقہ پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں بھی ان سوانح حیات کا جواز موجود ہے۔ کشمیر نے پچھلی اور رواں صدی میں کچھ واقعی بڑی شخصیات پیدا کیں جن کے ہماری زندگی پر چھوڑے ہوئے نقوش آہستہ آہستہ اسی طرح اُبھر رہے ہیں جس طرح سورج طلوع ہونے کے وقت جنگلوں میں چھُپی ہوئی چٹانوں کے خاکے اُبھرتے ہیں۔ ان خاکوں کو سوانحی مضامین کہنا زیادہ صحیح ہوگا جن میں ان شخصیات کے تاریخی محل وقوع وغیرہ کے متعلق خام معلومات اکٹھی کی گئی ہیں، جو ان شخصیات پر کام کرنیوالے بہتر قلمکاروں کو آگے بہت کام آسکتی ہیں ـــــ ایک اور بات جو ان مضامین کی خصوصیت ہے کہ اکثر قلم کاروں نے اپنے موضوعات پر مبصروں کی بجائے وکیلوں کی طرح بحث کی ہے جیسے وہ کسی عدالت میں دائر کسی استغاثے میں ان کا دفاع کر رہے ہوں۔ اسطرح اس شخصیت کے ارد گرد کُہرے کو دور کرنے کی بجائے اسکو اپنے ذاتی تعصب کے اندھیارے میں اور زیادہ گم کر دیا گیا ہے۔ خاکہ نگار کا فن یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی دید گاہیں بدلتا رہا اور شخصیت کو ایک ڈاکٹر کی طرح دیکھے۔ انسان نور اور نار، اور روشنی اور سائے سے اپنی شناخت بنتے ہیں ـــــ بہرحال۔ ان مضامین میں اگر کسی شخصیت کے بارے میں پہلی بار کچھ نئی باتیں سامنے لائی گئی ہوں اُن کا مقصد صرف اسکی بہتر تفہیم پیدا کرنا ہے اور اس کا مقصد نہ کسی کی دلآزاری ہے اور نہ اسکو غلط رنگوں میں پیش کرنا ہے ـــــ یہ کہنے میں بھی حرج نہیں کہ اکثر مضامین میں بڑی حد تک قطع و برید کی گئی ہے۔ اسکے باوجود اگر کسی ناخوشگوار سچائی کا اشارہ کیا گیا ہو تو وہ ارادتاً نہیں بلکہ اتفاقاً رہا ہوگا۔

محمد یوسف ٹینگ (مدیر اعلٰی)

سرینگر

پیش لفظ

شخصیات نمبر کی تیسری جلد پیش خدمت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ اپنے لوگوں کے لئے کچھ کرتے ہیں سب سے زیادہ خوش بخت ہیں۔ کشمیر میں بھی ایسی شخصیات کی کمی نہیں ___ اس جلد میں بھی حسب سابقہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی ایسی شخصیات کو شامل اشاعت کیا گیا ہے جنہوں نے اپنے وطن کو، ہموطنوں کو، یہاں کے ادب، علوم و فنون اور ثقافت کو کچھ نہ کچھ ضرور دیا۔ دنیا میں رہ کر کوئی بڑا کام سرانجام دینا بڑی بات ہے۔ بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دینے والے میں بھی کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے جو اسے بشر کے درجے سے آگے نہیں جانے دیتی۔ کیونکہ اسی میں اس کی عظمت ہے۔ کچھ ایسی شخصیات بھی ہیں جنہوں نے کشمیر کے حوالے سے تاریخ میں بھی جگہ پائی ہے۔ اس جلد میں کچھ ایسی شخصیات کو بھی جگہ ملی ہے جو ہماری تحریک آزادی میں بھی شامل ہیں۔ وقت نے اُن سے جو رول ادا کروانا چاہا، کروا لیا۔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔

اس جلد میں شامل کچھ شخصیات کا تعلق ماضی قریب سے ہے۔ ایک

تو اللہ سلامت رکھے بقید حیات ہیں۔ جیسا کہ گذشتہ جلدوں میں بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ایسا اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ لوگوں، حتیٰ کہ ہم عصروں، کے ذہنوں سے بھی واقعات بڑی تیزی سے اترتے جا رہے ہیں۔ جو کل حقیقت تھی آج فسانہ بنتی جا رہی ہے۔ اس لئے اگر بروقت صحیح واقعات قلم بند ہو جائیں تو کم از کم کل کے قاری کے لئے ریکارڈ نہ صرف یہ کہ محفوظ بلکہ درست صورت میں جمع رہے گا۔

ہم نے اس جلد کے لئے بھی ریاست کے تینوں خطوں کے اہل قلم حضرات سے کم از کم تیس شخصیات پر مضامین لکھنے کی درخواست کی تھی۔ ظاہر ہے کہ درخواست ایسے لوگوں سے کی گئی تھی جن کا ان شخصیات سے کسی نہ کسی مرحلے پر کسی نہ کسی طرح کا تعلق یا دلچسپی رہی تھی ــــ جیسا کہ اس جلد میں شامل مضامین سے ظاہر ہے ہمیں سبھی مضامین نہیں ملے۔ چند اس قابل نہ تھے کہ انہیں شامل اشاعت کیا جاتا۔ اس لئے اس جلد میں بھی کچھ لوگوں سے ایک کے بجائے دو دو مضامین لکھوائے گئے تاکہ یہ جلد بھی بروقت آپ تک پہنچ پائے۔

اس سال بھی سبھی شخصیات کی تصاویر حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن چند ایک کی تصاویر پھر بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ جن لوگوں نے تصاویر بہم کیں اُن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتا ہوں۔

اُمید ہے کہ اس جلد کے بارے میں بھی آپ ہمیں اپنی قیمتی آراء سے مستفید فرمائیں گے تاکہ اس سلسلے کی چوتھی جلد ترتیب دیتے وقت اُن سے بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔

• ــــ محمد احمد اندرابی

رشید تاثیر

میرواعظ مولانا یوسف شاہ

میرواعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ کا نام ریاست جموں و کشمیر کے صفِ اوّل کے فرزندوں اور رہنماؤں کی فہرست میں شامل ہے جنہوں نے اس ریاست کے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی افق پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑے ہیں۔ میرواعظ یوسف شاہ اپنے دورِ حیات میں محبوب و معیوب خلائق رہے ہیں۔ کہیں اُن کی پاک دامنی، بےلوث قیادت، پارسائی اور فہم و بصیرت کی قسمیں لی جاتی تھیں اور کہیں اس کے متضاد نقطہ نظر پیش کیا جاتا تھا۔ اُن کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہر دور میں اولوالعزم شخصیات کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہا ہے اور یہی انکی برگزیدگی کی دلیل ہے۔

میرواعظ مولانا یوسف شاہ ریاست جموں و کشمیر کے جید عالم، سیاستدان، مفکر اور ریفارمر تھے۔ آپ میرواعظ رسول شاہ مرحوم کے دوسرے صاحبزادے تھے۔ مولوی رسول شاہ صاحب کے چار فرزند تھے جن میں سب سے بڑا بیٹا مولوی محمد حسن تھا جو شافعی مسلک سے منسلک تھا۔ دوسرا میرواعظ یوسف شاہ، تیسرا مولوی محمد یحییٰ شاہ اور چوتھا مولوی محمد شاہ ۔۔۔ یہ تینوں حنفی مسلک سے وابستہ تھے۔

میرواعظ یوسف شاہ ۱۴ ستمبر ۱۸۹۴ء کو محلہ زالڈگری، راجوری کدل، سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ علوم مشرقیہ سے مولوی فاضل (آنرز ان عربک) کا امتحان پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ ان کے ساتھ ہی ریاست کے دو اور جید عالم دین مولانا سید میرک شاہ اندرابی اور مولانا عبدالکبیر بیرنہ نے بھی دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ یہ دونوں میرواعظ کے ہمعصر اور ہم مکتب رہے اور تینوں نے مشہور عالم محدث اور محقق مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رح سے درس و تدریس حاصل کی۔ مولانا عبدالکبیر صاحب بعد میں "مدینۃ العلوم" حضرت بل سری نگر کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ن مولانا سید میرک شاہ اندرابی پنجاب یونیورسٹی لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ریٹائرمنٹ کے بعد سکھر (سندھ) کی ایک دینی درسگاہ میں شیخ الحدیث کے عہدے پر تعینات رہے۔ ان تینوں عالموں میں مولانا سید میرک شاہ اندرابی واحد فرد تھے جو انگریزی زبان کی مہارت رکھتے تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنے قیام پاکستان کے دوران کشمیری زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے جو اب سری نگر میں ان کے پوتوں کے پاس غیر مطبوعہ صورت میں محفوظ ہے۔

ن جامعہ مدینۃ العلوم کے نام سے اوقاف اسلامیہ کشمیر کے اہتمام سے حضرت بل کے احاطے میں ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ (۴ جولائی ۱۹۲۶ء) بروز پنجشنبہ کو ایک دینی درسگاہ کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا سنگ بنیاد امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے رکھا۔ طلباء کے لئے اقامت گاہ، خورد و نوش، نصابی کتب اور دیگر سہولیات کی فراہمی اوقاف اسلامیہ نے اپنے ذمے لی جسے وہ آج تک نبھا رہی ہے۔ مدینۃ العلوم کے ساتھ ہی ایک کتب خانہ "شیر کشمیر لائبریری" کے نام سے ۱۹۴۸ء میں بھی قائم کیا گیا جس میں اس وقت مختلف علوم و فنون کی کم و بیش ہزار کتابیں اور قلمی نسخے ہیں۔ ان میں ½42" × 27" سائز کا ایک قرآن مجید بھی شامل ہے۔ (ایڈیٹر)

۱۹۲۹ء کے موسم بہار میں میرواعظ یوسف شاہ دیوبند سے فارغ ہو کر سرینگر واپس آئے۔ اس وقت وادی کی ساری فضا تناؤ، ذہنی کشمکش اور گھٹن سے دوچار تھی اور پچھلی ایک صدی کے دوران پہلی بار چند دردمند افراد نے کشمیری قوم کی بے بسی اور لاچاری کی داستان بیرونی دنیا کو سنانے کے لئے ایک میمورنڈم مرتب کرکے وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کو پیش کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔ میمورنڈم پر دستخط کرنے والوں میں خواجہ سعدالدین شال، خواجہ محمد مقبول پنڈت، خواجہ نورالدین نقشبندی، خواجہ حسن شاہ نقشبندی، میرواعظ کشمیر (کلاں) مولوی عمر صاحب، میرواعظ کشمیر (خورد) مولوی احمداللہ ہمدانی، خواجہ حسن شاہ جلالی اور خواجہ حسن شاہ جہاندی شامل تھے۔ میمورنڈم کو ریاست میں متعین برطانوی ریذیڈنٹ کے ہیڈ کلرک منشی سراج الدین کی وساطت سے ریذیڈنٹ کے ذریعہ لارڈ ہارڈنگ تک پہونچایا گیا جس کو وائسرائے نے اپنے ریمارکس کے ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ کو بھیجا۔ مہاراجہ میمورنڈم پر دستخط کنندگان سے سخت ناراض ہوا۔ ردعمل کے طور پر ان میں سے کئی جلاوطن کئے گئے۔ چند ایک کی جاگیریں ضبط ہوئیں اور کئیوں نے معافی مانگ کر خلاصی حاصل کی۔

اس واقعہ کے تقریباً دو سال بعد ۱۹ اپریل ۱۹۳۱ء کو جموں جیل میں توہین قرآن کریم کے سانحہ نے تمام ریاست کو ہلا کے جھنجوڑا اور سالمیان ریاست نے متحد ہونے کے لئے عملی اقدام شروع کئے۔ ۲۵ جون ۱۹۳۱ء کو خانقاہ معلیٰ سری نگر کے احاطہ میں ریاستی مسلمانوں کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد ہوا جس میں مسلمانوں کے نمایندے چنے گئے۔ چنانچہ ان حالات کے تحت میرواعظ یوسف شاہ نے دینی امور سے زیادہ سیاسی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کی اور اس اجلاس میں آپ نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ اسی اجلاس کے اختتام پر رام پور کے ایک پٹھان عبدالقدیر* نے

---

* عبدالقدیر کو بعض لکھنے والے ایشاور اور بعض امروہہ کا باشندہ بتاتے ہیں۔ (ادارہ)

مہاراجہ ہری سنگھ کی ذات اور حکومت کیخلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا جس کی پاداش میں اسے زیر دفعہ ۱۲۴ رنبیر پینل کوڈ کو گرفتار کر کے اس پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس مقدمہ کی سماعت سری نگر سنٹرل جیل میں ہونے لگی۔ ۱۳، جولائی ۱۹۳۱ء کو مقدمہ کی سماعت شروع ہونے سے قبل ہی مقدمہ کی کاروائی سے دلچسپی رکھنے والے کشمیریوں پر بلا وجہ بے تحاشہ گولیاں چلا کر مہاراجہ کی حکومت نے اپنی بربریت کا ثبوت فراہم کیا جس کے نتیجہ میں بائیس ۲۲ بے گناہوں نے جام شہادت نوش کیا جنہیں موقعہ پر جمع دوسرے لوگوں نے جامع مسجد سری نگر پہونچایا جہاں میر واعظ یوسف شاہ نے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے حکومت کشمیر کو دھمکی آمیز لہجہ میں انتباہ کیا کہ اگر اس نے شہداء کے نماز جنازہ، کفن دفن یا جلوس میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی حکومت نے اپنی پالیسی میں لچک پیدا کی۔ اس طرح میر واعظ یوسف شاہ کی ہدایت پر شہداء کو خانقاہ نقشبندیہ سری نگر کے احاطہ میں ان کے فتویٰ کے مطابق جنگ اُحد کے شہیدوں کی طرح چند ایک کو دو دو کر کے ایک ہی قبر میں سپرد خاک کیا گیا۔

۲۴، ستمبر ۱۹۳۱ء کو اسلامیان کشمیر نے میر واعظ یوسف شاہ کی قیادت میں خانیار میں جمع ہو کر گرفتار شدہ قائدین کی رہائی کے حق میں ہتھیار بند مظاہرہ کیا۔ جو تاریخ کشمیر میں ’ نارتھ پلٹن ‘ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے نوشتۂ دیوار پڑھ کر اپنے وزیر نواب خسرو جنگ، صاحبزادہ نورالدین خواجہ سلام شاہ گورنر کشمیر اور چیف آف دی ملٹری سٹاف بریگیڈیئر سدرلینڈ کو صورت حال کا جائزہ لینے اور مسلم نمائندوں سے تبادلۂ خیال کرنے خانیار بھیجا جہاں

باہمی گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ میرواعظ یوسف شاہ کی قیادت میں ایک وفد مہاراجہ سے مسائل پر براہ راست تبادلۂ خیال کرنے راج محل آئے۔ چنانچہ طے شدہ فیصلے کے مطابق میرواعظ یوسف شاہ کی قیادت میں خواجہ سعدالدین شال اور مولوی عبداللہ وکیل، نواب خسرو جنگ کے ساتھ مہاراجہ ہری سنگھ سے ملنے گئے جہاں مہاراجہ نے ہاتھ میں پستول لئے خواجہ سعدالدین شال کی طرف روئے سخن کر کے کہا:

"کیا تم بغاوت پر اتر آئے ہو؟ کیا تم لوگ میری حکومت کیخلاف جنگ کرنا چاہتے ہو؟ یاد رکھو اگر میں چاہوں تم سبوں کی اسی وقت اسی جگہ سر سے پاؤں تک کھال کھنچوا سکتا ہوں اور مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مگر میں نے تخت نشین ہوتے وقت اعلان کیا ہے کہ میرا مذہب انصاف ہے۔ اپنے اس قول کی خاطر تم لوگوں کو معاف کرتا ہوں۔ مجھے اپنی رعایا کے دکھ درد کا پورا پورا علم ہے۔ وہ میرے بچے ہیں۔ میں بغیر جبر و دباؤ کے اُن سے خود ہی دریافت کروں گا اور اُن کی شکایات کا ازالہ بھی کروں گا۔ مگر میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ میری رعایا کو بغاوت پر اُکسایا جائے۔ میں ایسے لوگوں کو ایک ایک کر کے گولی سے اُڑا دوں گا۔"

یہ سب باتیں مہاراجہ نے غضب ناک لہجہ میں ایک ہی سانس میں کہہ ڈالیں۔ میرواعظ یوسف شاہ نے جرأت سے کام لے کر اس کی بات کاٹتے کچھ کہنا چاہا۔ چیف آف دی آرمی سٹاف سدرلینڈ نے مداخلت کرتے کہا — "حضور مجھے اجازت بخشی جائے، میں ان سبوں کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا کے چھوڑوں گا۔" اس موقعے پر نواب خسرو جنگ نے مہاراجہ سے کہا "میں نے انہیں یہ کہہ کر یہاں لایا ہے

کہ یہ اپنی شکایات آپ کے سامنے پیش کریں اور ان میں مسلمانوں کے مذہبی پیشوا میرواعظ بھی ہیں"۔ میرواعظ کا نام سنتے ہی مہاراجہ نے طرزِ کلام بدلا۔ اور تفصیلات میں یہ طے پایا کہ خانیار میں جمع شدہ اجتماع میں شامل لوگوں کو اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جانے کے لئے کہا جائے۔ اس کے بعد شکایات پر غور کیا جائے گا۔ اس موقعہ پر میرواعظ یوسف شاہ نے جس خوش اسلوبی اور احسن طریقہ سے عوامی نمائندگی کا رول ادا کیا وہ داد و تحسین کا مستحق قرار پایا۔

مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ اس ڈرامائی ملاقات کے فوراً بعد شیخ محمد عبداللہ اور دیگر نمایندے رہا کئے گئے۔ میرواعظ اس زعم میں رہے کہ ان کی رہائی اُن کے حُسنِ تدبر سے عمل میں آئی۔ بہت جلد تحریک کے ابھرتے ہوئے قائد شیخ محمد عبداللہ اور میرواعظ یوسف شاہ کے درمیان پالیسی اور ذاتی نوعیت کے معاملات پر اختلافات نمودار ہوئے۔

مسلمانوں کے درمیان یہ رخنہ کوئی پردۂ درون والی بات نہ رہی۔ حکومت نے اس سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی خاطر میرواعظ سے یہ کہہ کر قربت حاصل کی کہ مذہبی پیشوا ہر مہذب سلطنت میں نہ صرف عزت و احترام کے مستحق قرار پائے ہیں بلکہ وہ صاحب الرائے ہوتے ہیں۔ انکی بالغ النظری اور مشوروں سے ملکی مسائل حل ہوتے ہیں۔ اس طرح میرواعظ کو ریاستی وزیراعظم ہری کرشن کول نے شیشے میں اتار لیا اور مہاراجہ ہری سنگھ کی ہدایت پر انہیں ترغیب دی گئی کہ وہ وائسرائے کے نام مندرجہ ذیل مرقوم تار پر اپنے دستخط ثبت کریں:-

"یہاں کے حالات پُرسکون ہیں۔ ہم مہاراجہ بہادر کے وفادار ہیں۔ اور اپنے تمام اندرونی مسائل اُن سے مل کر طے کرنا چاہتے ہیں"۔

اس کے بعد انہیں چھ سو روپے سالانہ وظیفہ عطا ہوا اور خلعت شاہی

سے نوازا گیا (جو نو گز والے ولایتی مخمل کے ۲ تھان، چار تھان پشمینہ ریشم، چاندی کی ایک طشتری اور ایک دوسرہ پشمینہ پر مشتمل تھا)۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیریوں کی تحریک نے مہاراجہ ہری سنگھ کے اوسان خطا کر دئے تھے۔ وہ اپنے آقاؤں کو یقین دلانے کے لئے کوئی بھی حربہ استعمال کرنے سے پس و پیش کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میر واعظ کی سادہ لوحی سے مہاراجہ کی مراد بر آئی۔ انہوں نے کاغذ کے پرچے میں چھپی ڈپلومیسی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ ؎

قوموں کی زندگی میں ایسے بھی مقام آئے

لمحوں نے خطا کی ہے قرنوں نے سزا پائی

حالانکہ بہت پہلے ان کے والد گرامی میر واعظ رسول شاہ کی علمی ثقافتی اور عوامی خدمات کے اعتراف میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے سرکاری خزانہ عامرہ سے انہیں ایک معقول رقم بطور وظیفہ مقرر کرنے کی پیشکش کی تو اس مرد قلندر نے یہ کہہ کر وظیفہ لینے سے انکار کیا۔ "مجھ پر اللہ کا کرم کافی ہے، وہی رزاق ہے"۔ بہر کیف دیر آید درست آید کے تحت مرحوم میر واعظ کی اس لغزش کو نظر انداز کیا جانا چاہیئے۔ کیوں کہ بعد ازاں انہوں نے عوامی نکتہ چینی کے پیش نظر جامع مسجد کے ایک جلسہ میں اسے "عطائے شما بلقائے شما" کہہ کر واپس کیا جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

حق تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس جدوجہد کے سامنے مہاراجہ ہری سنگھ کو جھک کر گلانسی کمیشن قائم کرنا پڑا جس سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی یکساں فائدہ حاصل ہوا۔ پریس اور پلیٹ فارم کی آزادی نے ریاستی عوام کو اپنی سیاسی اور معاشی راہیں استوار کرنے میں بڑی مدد دی۔ کشمیری پنڈتوں کی جماعت

یوں کہ سبھا نے کھلے عام سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔

ریاستی مسلمانوں نے اپنے سیاسی وجود کو زندہ رکھنے کے لئے آل جموں و کشمیر مسلم پولیٹیکل کانفرنس کے نام سے ایک جماعت تشکیل دی جس کا پہلا سالانہ اجلاس ۱۴، ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء کو شاہی مسجد سری نگر کے احاطہ میں منعقد ہوا۔ مولانا یوسف شاہ نے اس جماعت سے علیحدگی تو نہیں البتہ بے دلی کا مظاہرہ ضرور کیا۔ اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ صدر اور چودھری غلام عباس خان سیکریٹری منتخب ہوئے۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو خانقاہ نقشبندیہ سری نگر میں میرواعظ یوسف شاہ کے خلاف ایک مجلس وعظ میں مسلمانوں کے درمیان تصادم کے بعد میرواعظ یوسف شاہ نے مسلم کانفرنس سے علیحدگی کا اعلان کیا اور تقسیم مساجد کا فتنہ کھڑا ہوا۔ نتیجہ کے طور پر جامع مسجد میرواعظ یوسف شاہ، خانقاہ معلی میرواعظ ہمدانی اور شاہی مسجد* شیخ محمد عبداللہ کی تحویل میں دی گئی۔ میرواعظ کے حامی "بکرے" اور شیخ محمد عبداللہ کے طرفدار "شیر" کہلانے لگے۔

میرواعظ یوسف شاہ کچھ عرصہ تک بڑی خاموشی سے باہمی کشیدگی اور نفاق کی اس فضا کا مشاہدہ کرتے رہے۔ بالآخر حالات کے اکسانے پر انہوں نے خواجہ محمد عبداللہ لسّو کے مکان واقع مہاراج گنج سری نگر میں اپنے حامیوں کی ایک میٹنگ طلب کر کے آزاد مسلم کانفرنس کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت کا اعلان کیا۔ ۱۹۳۵ء میں اس جماعت کے آفیشل آرگن کی حیثیت میں ہفت روزہ "اسلام" زیر ادارت محمد امین اور مولوی غلام نبی مبارکی اجراء کیا۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ بہت حد تک ریاستی سیاست سے کنارہ کش ہی رہے اور خود کو وعظ خوانی تک محدود رکھا۔ البتہ اپنے قائدانہ سیاسی حقوق کے تحفظ کی خاطر کبھی کبھار ہفت روزہ "اسلام" میں ایک آدھ سیاسی بیان، جو اکثر و بیشتر حالات حاضرہ کے رواں تبصرہ سے

* شاہی مسجد سکھ دور سے لیکر سنہ ۱۹۳۲ء تک سرکاری حکم کے تحت بند تھی۔ گلینسی کمیشن کی سفارشات کے تحت اسے بحال کیا گیا اور مسلمانوں کے سب سے بڑے رہنما کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ نے اسے حاصل کیا۔

زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا شائع کرکے اپنے سیاسی وجود کی غمازی کرتے رہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۷ جون ۱۹۳۷ء کو یووک سبھا کے صدر پنڈت شیونرائن فوطمیدار نے اپنے متعصب ذہن اور کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیتل ناتھ کے احاطہ میں ایک تقریر کے دوران خیر البشر سرور کائنات رحمۃ للعالمین جناب حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں کچھ ناشایان الفاظ کہے۔ فوطمیدار کی غیر مناسب تقریر ۸ جون ۱۹۳۷ء کے روزنامہ "مارتنڈ" سرینگر میں شائع ہوئی۔ تقریر میں شامل ایک غیر ذمہ دارانہ اور گستاخانہ جملے سے مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہونا لازمی تھے۔ ریاست کے مسلم حلقوں میں اس پر زبردست تشویش کا اظہار کیا گیا۔ حالات بگڑ گئے اور فضا فرقہ وارانہ تناؤ سے آلودہ ہوگئی۔ حکومت نے امن و قانون کو برقرار رکھنے کے لئے شہر سرینگر کی حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی اور جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کرکے مزید کوئی کاروائی کئے بغیر خاموشی اختیار کی۔ اس نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ حکومت کی بے حسی کے خلاف مسلمانوں نے جامع مسجد میں زبردست مظاہرہ کیا اور میرواعظ یوسف شاہ کو جذبات سے مغلوب عوام نے ایک جلوس کی قیادت کرنے پر مجبور کیا۔ مولانا نے دفعہ ۱۴۴ توڑنے کے لئے یہ شرط رکھی کہ لوگ پرامن طور پر احتجاجی جلوس میں شامل ہوں گے اور صرف توہین رسول ﷺ کے مجرم کو سزا دینے کا مطالبہ کریں گے۔ غرض جوں ہی جلوس بہوری کدل کے قریب پہنچا، پولیس نے تشدد کے ذریعہ اہل جلوس کو منتشر کرنا چاہا جس کے نتیجے میں ایک نوجوان پولیس کی گولیوں سے شہید ہوا۔ اہل جلوس نے شہید کی نعش اپنے ساتھ لی اور میرواعظ کی قیادت میں آگے بڑھے۔ بہانہ محلہ کے قریب پولیس نے جلوس کو تتر بتر کرنے کے لئے کامیاب حملہ کیا۔ میرواعظ یوسف شاہ اپنے پانچ ساتھیوں سمیت گرفتار کئے گئے۔ شیخ محمد عبداللہ جو بھدرواہ میں تھے،

نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک بیان میں کہا:

"مذہب کسی کی میراث نہیں۔ اگر میر واعظ دوپہر کا کھانا جیل میں کھاتے ہیں تو رات کے کھانے پر ہم اُن کے شریکِ دسترخوان ہوں گے"۔

حالات سے خوفزدہ ہو کر "مارتنڈ" نے تقریر کے اس حصے کو رپورٹر کی غلط رپورٹنگ قرار دے کر اس کی تردید کی اور پنڈت شیو نرائن فوطیدار نے معافی مانگی۔ درحقیقت جو طوفان فوطیدار کی شر انگیز تقریر سے اٹھ کھڑا ہوا اس سے فوطیدار کی ساری شوخی فرو ہوئی اور وہ مسلم کانفرنسی رہنماؤں کی قدم بوسی میں اپنی بقا و سلامتی تلاش کرنے لگا۔ شیخ صاحب نے اپنے دوسرے بیان میں کہا: "وہ جھوٹ تھا اور سچ کا سورج نکلتے ہی زائل ہوا"۔ بخشی غلام محمد پنڈت شیو نرائن فوطیدار کو موٹر کار میں اپنے ساتھ بٹھا کر پورے شہر کا چکر لگایا جو فوطیدار کی معذرت خواہی کی دلیل تصور کی گئی۔

میر واعظ یوسف شاہ کو قید خانے میں زبردست جسمانی اذیت پہنچائی گئی اور انہیں ذاتی مچلکہ دے کر رہائی پانے کی پیشکش کی گئی۔ حکومت نے میر واعظ کے خلاف ایک بیان جاری کیا جس کو "ہفت روزہ" اسلام" نے شائع کرنے سے انکار کیا جس کی پاداش میں ہفت روزہ "اسلام" پر پابندی عائد کی گئی۔ اس واقعہ کے تقریباً پندرہ دن بعد میر واعظ کو غیر مشروط طور پر رہا کیا گیا۔ اس سب کے باوجود پنڈت شیو نرائن فوطیدار کو مسلمان کسی مجلس میں اپنے ساتھ بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ نمائش گاہ میں ایک سرکاری دعوتِ عصرانہ پر مسلمانوں کے احتجاج پر فوطیدار صاحب کو باہر نکالا گیا۔ بالآخر نومبر سنہ ۳۷ء میں پنڈت بابو کاک در اور خواجہ عبدالرحیم بانڈے کی وساطت سے پنڈت شیو نرائن فوطیدار نے حضرت بل

میں خواجہ عبدالرحیم بانڈے کے دولت خانے پر میرواعظ یوسف شاہ سے معافی مانگ کر آئندہ اس قسم کا کلام کرنے سے اجتناب کرنے کا وعدہ کر کے خلاصی پائی۔

۱۹۳۹ء میں شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقائے کار نے مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ریاستی حکومت نے جموں و کشمیر آرمز ایکٹ جس کے تحت راجپوتوں کو مسلح کرنا مقصود تھا، اور دیوناگری رسم الخط رائج کرنے کے بارے میں اقدامات شروع کئے جس کی بنا پر پنڈت پریم ناتھ بزاز اور شیخ محمد عبداللہ کے درمیان اختلافات نے حتمی صورت اختیار کی اور پریم ناتھ بزاز نیشنل کانفرنس سے الگ ہو گئے۔ اسی دوران طویل خاموشی کے بعد میرواعظ یوسف شاہ نے حکومت کے ان اقدام کی سخت مخالفت کی۔ بالفاظ دیگر شیخ محمد عبداللہ کے نظریہ کی ہمنوائی کی جس کو وادی کے سیاسی مبصرین نے ایک صحت مند شگون قرار دیا۔

ریاستی سیاست کے اس مدوجزر میں جموں کے قائدین میں سردار گوہر الرحمن لودھی پہلا فرد ہے جس نے مسلم کانفرنس کے احیائے نو کی ضرورت پر جموں اور سرینگر میں تقاریر کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ ان کی پیش کردہ وزن دار دلائل اور سیاسی صورت حال پر تبصروں نے چودھری غلام عباس جیسے منجھے ہوئے سیاستدان کو جس نے نیشنل کانفرنس کی پالیسیوں سے اختلاف رائے کرتے ہوئے اس جماعت کی عملی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کی تھی، از سر نو مسلم کانفرنس کے احیائے نو پر غور و فکر کرنے پر اکسایا۔ اور انکی سعی نے ایک بار پھر مولوی یوسف شاہ کو نہ صرف میدان سیاست میں آنے کے لئے تیار کیا بلکہ مہاراجہ کا مقرر کردہ چھ صد روپے سالانہ وظیفہ واپس کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ چنانچہ ۱۵ جون سنہ ۱۹۴۱ء کو جامع مسجد سرینگر کے اندرونی احاطہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا

جس میں مسلم کانفرنس کے احیائے نو کے اعلان کے ساتھ ہی مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے عہدیداروں کے ناموں کا بھی اعلان کیا گیا۔ چوہدری غلام عباس خان صدر، قریشی محمد یوسف جنرل سیکرٹری، حکیم قدرت اللہ۔ عبدالغفار آہنگر، محمد اسماعیل ساغر۔ اللہ رکھا ساغر، شیخ احمد دین بانہالی۔ شیخ محمد امین، چوہدری محمد عبداللہ بھلی۔ چوہدری عبداللہ خان، محمد اسلم ایڈووکیٹ، عبدالغنی ولنہ ضیاء الدین پونچھی، ضیاء الدین وترہ سیلی ممبران نامزد ہوئے۔

اس اجلاس میں چوہدری غلام عباس خان نے اپنے خطبہ صدارت میں ریاستی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے میرواعظ مولوی یوسف شاہ کی اعلیٰ ہمتی، جرأت، وصف قیادت اور فہم و فراست کی سراہنا کرتے ہوئے اُن سے عوام کی جانب سے اپیل کی کہ وہ حکومت سے پانے والے چھ سو روپے کی حقیر رقم کے عوض اگر چاہیں تو ہم آپ کی روشن ضمیری اور بے لوث قیادت پر چھ لاکھ روپے نچھاور کر سکتے ہیں زوردار تالیوں کی گونج میں میرواعظ مولانا یوسف شاہ نے اپنی تقریر کے آغاز میں ہی اُن تمام الزامات کی تردید کی جن میں وظیفہ کا شانِ نزول "قوم کشی" قرار دیا جارہا تھا۔ آپ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

"چھ سو روپے کی رقم میرواعظ خاندان کی علم دوستی اور اعتراف فضیلت کا صلہ ہے جو وظیفہ نہیں بلکہ جاگیر ہے۔ آج میں مسلمانوں کے مفاد اور اتحاد کی خاطر اس جاگیر کو بھی واپس کر رہا ہوں۔" علمائے شما بقائے شما"۔

مسلم کانفرنس کی نشاۃ ثانیہ کے بعد میرواعظ یوسف شاہ نے اپنی سیاسی سرگرمیوں کے دوش بدوش نیشنل کانفرنس اور اس کے سیاسی نظریہ کی مخالفت میں زوردار مہم شروع کی۔ اسی دوران ایک جیبی سیاح شیخ عثمان ڈوسہدوستان کی

سیاحت کرتے کشمیر آیا۔ اُن کے اعزاز میں مسلم کانفرنس کے زیر اہتمام اسلامیہ ہائی سکول سری نگر کے احاطہ میں میر واعظ کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں شیخ عثمان ڈو نے کہا ۔ "میں چین کے بیس کروڑ مسلمانوں کا لیڈر ہوں، اور چینی مسلمانوں کی طرف سے اسلامیانِ ہند کے لئے خیر سگالی کے جذبات لے کر آیا ہوں" کشمیر کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا "چونکہ خطۂ کشمیر نہ صرف ایک مسلم اکثریتی علاقہ ہے بلکہ چین کی سرحدوں سے ملحق ہونے کے باعث ہمارا قریب ترین پڑوسی ہے۔ اس لئے ہمارے دوستانہ جذبات خلوص اور عقیدت کا موجب مستحق ہے"۔

چند دن بعد جب شیخ عثمان ڈو کو نیشنل کانفرنس کے لیڈر جناب شیخ محمد عبداللہ سے ملنے کا اتفاق ہوا اور اُن سے کہا کہ میں یہاں آپ کا مہمان بن کر رہنا چاہتا تھا لیکن مجھے بتایا گیا کہ ریاستی حکومت نے آپ اور آپ کے رفقاء کو قید کر لیا ہے ۔ بعد ازاں انہوں نے ان باتوں کو نیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں بھی دہرایا ۔ اس پر نیشنل کانفرنس کی ساری تنظیم نے میر واعظ اور ان کی جماعت پر الزام تراشی کر کے جوابی تقاریر کا سلسلہ شروع کیا جس کی تان ۱۲ ، اکتوبر ۱۹۴۲ء کو نمازِ عید الفطر کے موقع پر عید گاہ سری نگر میں دونوں جماعتوں کے حامیوں کے درمیان ایک خونریز جھڑپ اور دنگہ فساد پر ٹوٹی ۔ فتنہ و فساد کے اس ماحول میں میر واعظ یوسف شاہ نے اپنے ایک بیان میں نیشنل کانفرنسیوں پر چوٹ کرتے ہوئے کہا :

"ان کے خلاف جہاد فرض ہے یہ ہل والے جھنڈے کی آڑ میں بیل کو نشان بناتے ہیں"۔

جواب میں جناب شیخ محمد عبداللہ نے مولوی صاحب کے بارے میں کہا ،

"کبھی مرزائیت کی آڑ میں، کبھی داڑھی کا فسانہ چھیڑ کر اپنی جماعت کو فساد پر آمادہ کرتا ہے اور اکساتا ہے۔ مولوی یوسف شاہ نے حکومت کا چھ سو روپے کا وظیفہ واپس کر کے اس سے زائد رقم کسی دوسری طاقت سے حاصل کر کے حکومت کشمیر کو چیلنج کیا ہے۔ اور اپنے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے وزیر اعظم کو دعوت جنگ دی ہے۔"

افراتفری اور فتنہ و فساد کے اس ماحول میں جہاں ایک نیشنل کانفرنسی جیالہ بجوج ہوا وہاں شہر سرینگر کے تقریباً جملہ آشپازوں نے میرواعظ کا ساتھ دے کر نیشنل کانفرنسیوں کا وقتی طور پر قافیہ تنگ کیا۔ ان حالات سے نمٹنے کے لئے نیشنل کانفرنس کے جنرل سیکرٹری مولانا محمد سعید مسعودی کے پلان کو روبہ عمل لاتے طے پایا کہ آشپازوں کو شہر سری نگر میں نیشنل کانفرنس کے حامیوں کے حلقوں میں اس وقت تک کام کرنے کی اجازت نہیں دی جائے جب تک کہ وہ مجاہد منزل کی سند حاصل نہ کریں۔ چنانچہ مجاہد منزل سے جو اسناد مولانا محمد سعید مسعودی کے دستخطوں سے اجرا ہوئیں، ان کی عبارت یوں تھی:

"معززین محلہ کے یقین دلانے پر اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ .... ولد .... ساکن .... کا چال و چلن اچھا ہے اور اس نے لوٹ مار اور دنگہ فساد میں حصہ نہیں لیا، اس لئے خدمات لینے میں کوئی خطرہ نہیں۔

بقلم خود محمد سعید مسعودی
سیکرٹری مجلس انتظامیہ اوقاف

عہد قدیم سے میرواعظ خاندان کے احباب خاص عرس ہا کے موقعوں پر درگاہ حضرت بل میں وعظ پڑھا کرتے تھے۔ یوم شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عرس پر پروگرام

کے مطابق میر واعظ کی آمد پر مخالف جماعت کے کارکنوں نے وہ منبر (ممبر) ہٹا ڈالا جس پر بیٹھ کر وہ وعظ پڑھا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اس پر زبردست ہنگامہ شروع ہوا، اور زیارت موئے مقدس رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض یاب ہونے والے مسلمان باہم دست و گریباں ہوئے۔ الاماں کی صدائوں اور ہو کے اس عالم میں انتہائی خاموشی کے ساتھ مولانا یوسف شاہ پیادہ پا نسیم باغ کے راستے راجہ بری کدل تک واپس پہنچے۔ یہ خبر سنتے ہی مولانا مسعودی نے حضرت بل کے سٹیج پر نمودار ہو کر مندرجہ ذیل تحریری قرارداد زائرین کے سامنے پیش کی:

"مسلمانان شہر و علاقہ کا یہ اجتماع عظیم اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ مولوی یوسف شاہ فتنہ باز ثابت ہو چکا ہے اس لئے اُس کو آیندہ اس زیارتگاہ شریف میں منبر پر چڑھنے کا کوئی حق نہیں۔"

بغور جائزہ لیا جائے تو مولانا مسعودی جیسے زیرک، دین دار اور پختہ کار سیاستدان کے اس طرز عمل کو سراہا نہیں جا سکتا۔ یہ تو جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا معاملہ ہی کہلائے گا۔ برعکس اس کے میر واعظ یوسف شاہ نے اس موقعہ پر امن پسندی اور بردباری کا جو مظاہرہ کیا وہ یقیناً قابل داد اور قابل تقلید تھے۔

یکم اپریل ۱۹۴۳ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے گوپال سوامی آئینگر کی پالیسیوں سے اختلاف کر کے اسے برطرف کیا اور اس کی جگہ سر مہاراج سنگھ کو وزیراعظم بنایا۔ چودھری غلام عباس کی ہدایت پر ۹ اگست ۱۹۴۳ء کو مسلم کانفرنس نے یوم نجات کے طور پر منایا۔ اس موقعہ پر جامع مسجد سرینگر کے ایک عوامی جلسہ میں میر واعظ یوسف شاہ نے سیاہ کارناموں کے عنوان سے گوپال سوامی آئینگر کے دور وزارت کا کچا چٹھا[*] پیش کیا اور اسے بدترین فرقہ پرست کہا جبکہ اُسے چودھری

[*] ازروئے واقعات اس معرکے کے اصل غازی خالد کشمیر بخشی غلام محمد تھے۔ (ادارہ)

غلام عباس خان اپنی سوانح حیات "کشمکش" مطبوعہ لاہور میں کٹر کانگریسی قرار دیتے ہیں۔

سر مہاراج سنگھ کا دور وزارت ایک مختصر دور تھا جو ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء کو اختتام پذیر ہوا۔ ان کے عہد میں مسلم کانفرنس نے اپنے آپ کو دوبارہ منظم اور اپنی سیاسی بساط کا مظاہرہ کرنے کے لئے ۱۳، ۱۴، اور ۱۵ اگست ۱۹۴۳ء کو جامع مسجد سری نگر کے احاطہ میں سالانہ اجلاس منعقد کیا۔ اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے صدر انڈین سٹیٹس مسلم لیگ نواب بہادر یار جنگ بہادر سرینگر آئے۔ لیکن ریاستی حکومت نے انہیں شرکت کی اجازت نہیں دی۔ اور انہیں ریاست بدر کیا گیا۔ مسلم کانفرنسی زعماؤں نے یہ کڑوی گولی بڑے ٹھنڈے دل و دماغ سے حلق سے نیچے اتاری۔ اس اجلاس میں میرواعظ یوسف شاہ پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ اجلاس میں کئی قراردادیں پاس ہوئیں جن میں ریاست میں گاؤکشی پر سے پابندی ہٹانے، نومسلموں کی جائیداد ضبط کرنے کے احکام کی منسوخی، قانون اسلحہ کی ترمیم، ریاست میں اردو رسم الخط کی برقراری اور مطالبہ ذمہ دار نظام حکومت کا قیام شامل ہے۔ ان ہی دنوں مہاراجہ ہری سنگھ نے آئینی اصلاحاتی کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا۔ میرواعظ یوسف شاہ نے بحیثیت صدر مسلم کانفرنس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ ۸، مئی ۱۹۴۴ء کو مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کی دعوت پر بغرض سیاحت سرینگر آئے۔ یہاں پہنچکر انہوں نے مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو متحد کرنے کی کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۶، ۱۷، ۱۸ جون ۱۹۴۴ء کو مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس جامع مسجد سری نگر میں منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کے درمیان صلح وصفائی کی گفت وشنید کی تفصیلات بیان کرتے

ہوئے اس کی ناکامی کا ذمہ دار شیخ محمد عبداللہ کو ٹھہرایا جس سے وادی کی پُر امن فضا میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ اور دونوں جماعتوں کے حامیوں کے درمیان ایک اور بار دنگا فساد شروع ہوا جس کا اختتام مہاراجہ کشمیر کے دورہ مشرق وسطیٰ کے جنگی محاذ سے واپسی پر ہوا۔

ان دنوں دوسری عالمگیر جنگ اپنے شباب پر تھی۔ نیشنل کانفرنس نے مہاراجہ ہری سنگھ کا شاندار استقبال کیا اور نیا کشمیر کا آئینی مسودہ پیش کیا۔ بھلا اس موقعہ پر مسلم کانفرنسی زعما خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے ۱، ۲ و ۳ جولائی ۱۹۴۵ء کو پونچھ میں میر واعظ کی صدارت میں سالانہ اجلاس منعقد کیا جس میں ریاست کے لئے آزاد کشمیر کے عنوان سے اپنا مینی فیسٹو پیش کیا۔ اسی دوران وزیر سر بی۔ این راؤ کی جگہ پنڈت رام چندر کاک کو ریاست کا وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔ میر واعظ یوسف شاہ کا لب و لہجہ شروع میں رام چندر کاک کے خلاف رہا لیکن جب شیخ محمد عبداللہ اور وزیر اعظم میں ٹھن گئی اور تخلیہ کشمیر کی تحریک شروع ہوئی، رام چندر کاک نے میر واعظ کے قریب آنے کی کوشش کی۔ "اعلائے کلمۃ الحق" کے نام سے ایک پمفلٹ بھی شائع کیا گیا جس میں مہاراجہ بہادر کی تعریف کی گئی تھی اور ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی تھی۔ مولانا موصوف کے اس طرز عمل پر نہ صرف کشمیری مسلمانوں نے بلکہ غیر ریاستی مسلمانوں، مسلم لیگی دانش وروں، قائدین اور صحافیوں نے بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس فیصلہ کن مرحلہ پر جب وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک "کوئٹ کشمیر" تحریک کو توڑنے میں کامیاب نظر آ رہے تھے میر واعظ نے ریاستی سیاست پر چھا جانے کی خواہش میں وہ سب کچھ کیا جو ان کے لئے ممکن العمل تھا۔ چنانچہ مسٹر کاک کی فرمائش پر جاگیر دارانہ نظام کے حامی چند جموں نواسیوں کے ساتھ پنڈت جواہر لال نہرو کے خلاف نعرے لگوانے کے لئے اُن کے حامیوں سے

بھری کئی بسیں کوہالہ روانہ ہوئیں جنہوں نے کوہالہ پل پر پنڈت نہرو کے خلاف "گو بیک نہرو" کے نعرے لگائے۔ جب ۳ رجون ۱۹۴۷ء کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی آزادی کا پلان پیش کرکے دیسی ریاستوں کی آزادی کے حق کو تسلیم کیا تو گاندھی جی کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت کا وہ دعوت نامہ یاد آیا جس میں اس نے موہن داس کرم چند گاندھی کو کشمیر کی سیاحت کی دعوت دی تھی۔ یکم اگست ۱۹۴۷ء کو گاندھی جی سری نگر پہونچے اور ۳ راگست ۱۹۴۷ء کو مہاراجہ کشمیر سے مسئلہ الحاق پر گفت وشنید کے بعد واپس چلے گئے۔ ان کے جانے پر یہ افواہ گرم ہوئی کہ مہاراجہ کشمیر نے اصولاً ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق کرنا مان لیا ہے۔ جبکہ اس سے قبل اسے رام چندر کاک کے آزاد اور خود مختار ریاست کے نظریہ کا قائل سمجھا جاتا تھا۔ اس ضمن میں ریاست کے ممتاز صحافی میر عبدالعزیز ایڈیٹر ہفت روزہ "ملت" سری نگر (حال مقیم راولپنڈی۔ مدیر ہفت روزہ "انصاف") نے ۲۴ر نومبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں اپنی یادداشتوں کو قلمبند کرتے ہوئے کئی اہم انکشافات کئے ہیں:۔

"مسٹر بزاز پر نیشنل کانفرنسیوں نے جو قاتلانہ حملہ کیا تھا اس کا اثر ان کی ایک ٹانگ پر موجود تھا (شاید اب بھی ہو) اور وہ تھوڑا سا لنگڑا کے چلتے تھے اور تیز چل نہیں سکتے تھے۔ ورنہ ہم سردار عبدالرحمٰن قاسم مٹھا مالک ویکلی کشمیر ٹائمز کے گھر واقع آبی گذر پیدل ہی جا سکتے تھے۔ یہ سردار عبدالرحمٰن قاسم مٹھا سر سلیمان قاسم مٹھا میئر (MAYOR) بمبئی کے فرزند تھے۔ قوم پرست مسلمان تھے، انہوں نے کشمیر کا ہفت روزہ کشمیر ٹائمز جاری کیا۔ ان کے پرچے کے ایڈیٹر مسٹر گھنشیام کمار ریڈی مدراسی (جی۔ کے ریڈی) تھے جو سری نگر میں ایسوسی ایٹیڈ پریس

آف انڈیا کے نمائندے تھے اور اس خبر کے ماخذ وہی تھے۔

بزاز صاحب اور میں ٹانگے پر سوار ہو کر آبی گذر پہنچے مِیٹھا اور ریڈی اُٹھے اور ہمارا خیر مقدم کیا۔ مسٹر بزاز نے ریڈی کو انگریزی میں کہا کہ جو خبر کل تم نے مجھے سنائی تھی اب میر عبدالعزیز کو مفصل سنا دو۔ ریڈی مدراسی تھا اس کو مدراسی اور انگریزی ہی آتی تھی۔ ایک ہوشیار اخبار نویس کی طرح ریڈی نے مجھ سے کہا۔ "خبر استعمال کرو لیکن میرے نام کا حوالہ نہ آئے"۔ اس کے بعد گویا ہوئے۔ "یہ باتیں جو مسٹر بزاز نے تمہیں بتائیں مجھے رام چندر کاک وزیر اعظم نے کہی ہیں۔ اس کو محسوس ہوا ہے کہ مہاراجہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کاک سختی سے اسی بات پر قائم ہے کہ کشمیر کو نہ ہندوستان کے ساتھ جانا چاہیے اور نہ پاکستان کے ساتھ۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی کسی بات پر رام چندر کاک اور مہاراجہ میں اختلاف ہوتا رہا ہے رام چندر کاک روٹھ کر اپنے گاؤں کے بنگلہ واقع موضع وارا جاتے رہے ہیں۔ اور آخر میں مہاراجہ انکی بات مان لیتا رہا ہے۔ مسٹر کاک اب بھی روٹھ کر وارا گئے ہیں۔ ان کو توقع ہے کہ مہاراجہ میری بات مان لے گا۔ ہندوستان سے الحاق نہیں کرے گا اور نہ شیخ عبداللہ کے ساتھ سمجھوتہ کرے گا۔

ریڈی سے یہ باتیں سن کر ہم دونوں مِیٹھا اور ریڈی سے رخصت ہوئے۔ میں نے بزاز کو ان کے دفتر "ہمدرد" پر چھوڑا۔ میں نے ہمدرد کے دفتر (پولو گراؤنڈ) سے میر واعظ منزل فون کیا۔ دوسری طرف سے محمد یوسف کی آواز آئی۔ (میر واعظ مرحوم اپنی بات چیت

میں اور فون پر اپنا بھی نام بتاتے تھے) ۔ میں نے میرواعظ صاحب کو صورت حال سے مختصراً آگاہ کیا ۔ انہوں نے کہا کہ فوراً آجاؤ میں اتنی دیر میں دوسروں کو بھی بلاتا ہوں ۔ میں پندرہ بیس منٹ میں ٹانگے پر میرواعظ منزل، راجویری کدل پہونچا ۔ یہاں میرواعظ محمد یوسف، مولوی محمد امین ، عبدالسلام دلال، مولوی غلام رسول وغیرہ میرے منتظر تھے ۔ میں نے وہاں پہونچکر ساری بات سنادی ۔ دارا گاؤں نشاط باغ سے پرے واقع ہے سرینگر سے کوئی دس میل کے فاصلے پر ۔ احتیاطاً پہلے میرواعظ صاحب نے پرائم منسٹر ہاؤس فون کیا ۔ وہاں سے پتہ لگا کہ وزیر اعظم دارا گئے ہیں اور وہاں ٹیلیفون نہیں ہے ۔

روزوں کے دن تھے اور وہ بھی گرمی کے ۔ لیکن میرواعظ صاحب نے ہمت سے کام لے کر کہا " معاملہ اہم ہے ہمیں دارا ہی جانا چاہیئے " ۔ طے پایا کہ میرواعظ صاحب، میں اور عبدالسلام دلال دارا جائیں عبدالغفار گجری (غفار گورو) کو بطور محافظ میرواعظ صاحب کے ساتھ رکھا گیا ۔ کار مولوی محمد احمد صاحب (فرزند میرواعظ حال مقیم راولپنڈی) نے ڈرائیو کی ۔ احتیاطاً میرواعظ صاحب نے پاؤ بھر کھجوریں روزہ کھولنے کے لئے ساتھ رکھیں ۔ بارشیں ہوئی تھیں ۔ راستے کی بھی پوری واقفیت نہ تھی ۔ بہرحال ہم لوگ کوئی چھ کے قریب دارا پہونچے ۔ گاڑی گیٹ پر کھڑی کی ۔ رام چندر کاک اپنی میم کے ساتھ باغ میں ٹہل رہے تھے ۔ انہوں نے میرواعظ صاحب کو فوراً پہچانا ۔ کاک صاحب حیران ہوئے اور کشمیری

زبان میں آؤ بھگت کرتے ہوئے پوچھا کہ آج کیسے تشریف لائے؟ اور وہ بھی کس مقام پر؟

رام چندر کاک نے کرسیاں منگوائیں۔ احمد صاحب اور عبدالغفار گجری کار کے پاس ہی رہے۔ میرواعظ مرحوم، دلال مرحوم اور میں جب کرسیوں پر بیٹھے تو کاک صاحب بھی بیٹھے۔ بات چیت کشمیری میں ہوتی رہی۔

میرواعظ: سنا ہے آپ نے استعفیٰ دیا ہے؟

کاک: آپ سے کس نے کہا؟

میرواعظ: (میری طرف اشارہ کرکے) انہوں نے۔

کاک: یہ کون صاحب ہیں؟

میرواعظ: میر عبدالعزیز، ملت کے ایڈیٹر۔

کاک: (اچھل کر) اچھا اچھا۔ پریم ناتھ بزاز کے دوست اور اس کی طرح ہمارے مخالف ملت کے ایڈیٹر مسٹر عبدالعزیز اب تو صاف ظاہر ہے کہ یہ محض گپ ہے۔ پریم ناتھ بزاز کی اڑائی ہوئی۔ (کاک صاحب نے گپ کیلئے وہ لفظ استعمال کیا جو میں نے اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی کشمیری زبان میں نہیں سنا۔ انہوں نے کہا یہ پریم ناتھ بزاز کی ٹڈ ہے) پریم ناتھ بزاز کو "ٹڈ" پھیلانے کی عادت ہے' یہ تو غلط

؎ ٹڈ کشمیری میں فریب دینے یا جعل سازی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کشمیری کا اس سے ملتا جلتا ایک لفظ "ٹڈی" بھی ہے جس کے معنی گپ بھی ہیں۔ ممکن ہے کاک صاحب نے جو ٹھیٹھ کشمیری بولتے تھے، یہی لفظ استعمال کیا ہو۔ (ادارہ)

ہے، میں نے استعفیٰ نہیں دیا اور یہ میر عبدالعزیز صاحب، یہ بھی ہمارے خلاف ہیں۔ مہاراجہ نے کوئنٹ کشمیر میں جو اجلاس معززین کا بلایا تھا اس کو انہوں نے دربار عام کے تحت مضمون لکھ کر رگڑا۔ کاک صاحب ایک ہی سانس میں یہ ساری باتیں کہہ گئے اور اسے پریم ناتھ بزاز کی گھڑی گپ قرار دیا۔

اتنی دیر میں افطار کا وقت آیا۔ میر واعظ صاحب نے کھجوریں نکالیں۔ ہم نے روزہ کھولا۔ عبدالغفار اور چھوٹے میر واعظ کو بھی کھجوریں دیں۔ میر واعظ اور دلال صاحب نے شام کی نماز شروع کی۔ میں اُن دنوں باقاعدہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ اب میں اور کاک صاحب اکیلے آمنے سامنے بیٹھے تھے اور کاک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ سچ بتائیے یہ کس نے آپ کو کہا۔ اخبار نویس ہو کر میں دوسرے اخبار نویس (ریڈی) کا حوالہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنی پیشہ ورانہ اخلاقیات استعمال کر کے کاک صاحب پر جرح شروع کی۔ میں نے ان سے اچانک پوچھا کہ آپ نہ تو بیمار ہیں اور نہ دفتر میں چھٹی ہے۔ آپ تین دن سے یہاں کیا کر رہے ہیں۔؟ آپ اپنے دفتر میں کیوں نہیں ہیں؟ کیا یہ درست نہیں کہ آپ مہاراجہ سے روٹھے ہیں؟ استعفیٰ کا لفظ تو میر واعظ صاحب نے سہولتاً غلطی سے استعمال کیا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ الحاق کے مسئلہ پر آپ میں اور مہاراجہ میں شدید اختلاف پیدا ہوا ہے اور آپ روٹھ کر یہاں آئے ہیں؟" میں نے یہ ساری باتیں انگریزی میں کہیں۔ کاک صاحب اب کیسے بھاگ سکتے تھے۔ انہوں نے کہا: "مہاراجہ کو جو

مرضی ہے کرے لیکن میر عبدالعزیز، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ ہندوستان سے الحاق کرے گا تو میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا۔
اور نہ آپ مجھے وزیراعظم پائیں گے۔ میں پاکستان سے بھی الحاق نہیں چاہتا۔ ہمارے کشمیر کو اس جھگڑے سے الگ تھلگ رہنا چاہیئے۔
میرا تو خیال ہے کہ دس سال تک ہندوستان پھر ایک ہو جائے گا۔
دیکھو سارے ہندوستان میں فسادات ہو رہے ہیں۔ جموں و کشمیر میں کسی کو نکسیر تک نہیں پھوٹی"۔ اس پر میں نے کاک صاحب کو داد دی کہ یہاں ہندو مسلم فسادات نہیں ہوئے۔

کاک صاحب نے کہا "مسلم لیگ والے کہتے ہیں کہ ہم نیشنل گارڈ کو بھیج کر ریاست پر قبضہ کریں گے، ایسا نہیں ہو سکتا"۔

میں نے کاک صاحب سے کہا کہ یہ بے مقصد باتیں ہیں۔
اصل بات کی طرف آئیے۔ مہاراجہ کیا چاہتا ہے اور آپ کی بات کس حد تک مانتا ہے۔ کاک صاحب نے کہا "اگر مہاراجہ ہندوستان سے الحاق کرے گا تو میں اس سے اتفاق نہیں کروں گا"۔

اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد مہاراجہ نے رام چندر کاک کو وزارت عظمیٰ سے برطرف کر کے اپنے ہی مکان میں نظر بند کیا۔ میر واعظ یوسف شاہ کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھی گئی اور انہیں سرینگر میں رہنے کا پابند قرار دیا گیا۔ لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء میں مسلم لیگی لیڈروں کی خفیہ ہدایت پر ریاستی پولیس کو حکم دے کر وہ راولپنڈی پاکستان چلے گئے۔ اس کے بعد ہی کشمیر پر قبائلی سرداروں کو کشمیر پر یلغار کرنے کی دعوت دی۔ قبائلیوں کی پشت پناہی کے بعد آزاد کشمیر میں جموں اور کشمیر کے مہاجروں کے درمیان اختلافات نے انہیں دو مختلف راستوں پر کھڑا کیا۔ میر واعظ

یوسف شاہ نے مسلم کانفرنس سے علیحدگی اختیار نہ کرتے ہوئے بھی کشمیری بلاک کے نام پر کشمیریوں کے مفادات، انکی سلامتی اور تحفظ کے لئے کام کرنا شروع کیا۔ خواجہ ثناءاللہ بٹ مدیر روزنامہ "آفتاب" سری نگر (جو اُن دنوں مظفر آباد میں قیام پذیر تھے) کی ادارت میں ہفت روزہ کشمیر اجراء کیا گیا، جو کشمیریوں کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ آزاد اور خود مختار کشمیر کا مبلغ تھا، جس کی بناء پر ثناءاللہ بٹ کو حکومت پاکستان نے سرحد کے اس پار دھکیل دیا۔ حکومت پاکستان کے اس وقت امور کشمیر کے وزیر نواب مشتاق احمد گورمانی چودھری غلام عباس خان سے ریاستی عوام کے دیئے ہوئے خطاب "قائد ملت" سے بہت ہی چڑتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قائد ملت کہلانے کے مستحق صرف نوابزادہ لیاقت علی خان ہیں۔ غرض جب ۶ ,اکتوبر ۱۹۵۱ء کو نوابزادہ شہید ہوئے تو خواجہ ناظم الدین نے وزیر اعظم پاکستان کا عہدہ سنبھالا۔ نواب مشتاق احمد گورمانی نے چودھری عباس کی بالادستی کو ختم کرنے کے لئے میرواعظ یوسف شاہ کو یکم دسمبر ۱۹۵۱ء کو صدر آزاد کشمیر مقرر کروایا۔ جس سے میرواعظ کو سیاسی طور پر قابو میں بھی رکھنا مقصود تھا۔ لیکن صرف چھ ماہ اکیس دن کے بعد یعنی ۲۱, جون ۱۹۵۲ء کو حکومت پاکستان نے بڑی چالاکی سے اُن کے اس عہدے سے مستعفی ہونے کا ڈرامائی اعلان کیا۔ چنانچہ اس ضمن میں ثناءاللہ بٹ اپنی تصنیف "کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک" میں یوں رقمطراز ہیں :-

"...میرواعظ صاحب راولپنڈی گئے جہاں حکومت پاکستان کے جوائنٹ سیکرٹری برائے امور کشمیر نے انہیں ایک متبادل بجٹ پیش کیا اور انہیں بتایا کہ پاکستان کے اہلکاروں نے جو بجٹ تیار کیا ہے۔ اس میں آزاد کشمیر کی ترقی کے لئے زیادہ امدادی رقومات منظور کی جا رہی

ہیں۔ میر واعظ صاحب نے گفت و شنید کے دوران تھوڑے سے پس و پیش کے بعد جب بجٹ سے اتفاق کر لیا کہ حکومت پاکستان کی وزارت امور کشمیر جو بجٹ تجویز میں آزاد کشمیر کیلئے تیار کرے گی وہ میر واعظ صاحب کیلئے قابل قبول ہوں گی۔ چنانچہ اگلے دن جوائنٹ سیکرٹری نے میر واعظ صاحب کی قیام، اصغر مال روڈ راولپنڈی میں ٹیلیفون پر میر واعظ سے استدعا کی کہ وہ شہزادہ کوٹھی جہاں وزارت امور کشمیر کے دفاتر تھے تشریف لائیں تاکہ انہیں آزاد کشمیر کے نئے بجٹ کا گوشوارہ پیش کیا جاسکے۔ میر واعظ صاحب بعد دوپہر وزارت امور کشمیر کے سیکرٹریٹ گئے جہاں جوائنٹ سیکرٹری نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے انہیں اپنے کمرے میں لیجا کر آزاد کشمیر کیلئے نئے بجٹ کا انگریزی مسودہ دکھایا اور اسکے ساتھ ہی گوشوارے کی کچھ اہم باتیں پڑھ کر میر واعظ صاحب کو اطمینان دلایا۔ اس کے بعد جوائنٹ سیکرٹری نے میر واعظ صاحب کو بتایا کہ اگر وہ اسے قبول کرتے ہیں تو وہ اس کی منظوری دیدیں تاکہ اسے وزارت خزانہ کی منظوری حاصل کرنے کیلئے کراچی بھیجا جاسکے۔ میر واعظ صاحب نے جہاں جہاں جوائنٹ سیکرٹری نے انہیں بتایا کہ دستخط کرنے مطلوب ہیں، بڑی سادگی کے ساتھ دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ اسی روز شام کو آزاد کشمیر ریڈیو سے اعلان کیا گیا کہ آزاد کشمیر کے نگران صدر میر واعظ محمد یوسف صدارت سے مستعفی ہو گئے ہیں۔

آزاد کشمیر ریڈیو کے اعلان سے خود میر واعظ بھی ششدر رہ کر رہ گئے۔ کیونکہ انہوں نے کوئی استعفیٰ وغیرہ نہیں دیا تھا۔ چنانچہ جب ان کے سیکرٹری میر ہدایت اللہ نے اس بارے میں ریڈیو سٹیشن

اور امور کشمیر کے جوائنٹ سیکرٹری سے ٹیلی فون پر بات چیت کی تو انہیں بتایا گیا کہ میر واعظ صاحب واقعی استعفیٰ دے چکے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا ہے کہ انگریزی میں ٹائپ کئے گئے بجٹ کے جس مسودے پر میر واعظ صاحب کے دستخط لئے گئے تھے اُن میں اُن کا استعفیٰ بھی شامل تھا"۔

میر واعظ یوسف شاہ ایک اور بار ۱۹۵۶ء میں یکم جون تا ۶ ستمبر ۱۹۵۶ء میں تین ماہ چھ دن کے لئے صدر "آزاد کشمیر" کے عہدے پر تعینات رہے ہے۔ ۱۹۵۷ء میں میر واعظ پاکستانی پاسپورٹ پر الستر پہنچے اور سری نگر آنے کی چاہ میں وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک طویل مکتوب بھیجا جس میں ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں و کشمیر کے الحاق کی گومگوں الفاظ میں تائید کی گئی تھی۔ میر واعظ کا خط دہلی سے وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کو اُن کے ریمارکس کے لئے بھیجا گیا۔ بخشی غلام محمد نے مولوی محمد امین کو صلاح و مشورہ کے لئے اپنی کوٹھی پر بلایا۔ چونکہ مولوی محمد امین تپ دق کے عارضہ میں مبتلا تھے اور اس قابل نہ تھے کہ بخشی غلام محمد سے ملاقات کر سکیں انہوں نے اپنے فرزند علی جان کو بخشی صاحب کے پاس بھیجا۔ مجھے علی جان نے اس ملاقات کے بارے میں بتایا ہے:-

"بخشی غلام محمد کے سرکاری بنگلہ پر میں نے وہ خط پڑھا۔ لیکن بخشی غلام محمد نے خط کے ایک گوشہ پر لکھی انگریزی عبارت پر اپنا ہاتھ رکھا۔ خط پڑھ کر میں نے اُن سے کہا میں مولوی محمد امین صاحب سے اس ضمن میں بات کر کے ہی کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہوں گا۔ بعد ازاں میر واعظ منزل میں مشورہ کر کے بخشی صاحب سے کہا گیا کہ میر واعظ کو کشمیر آنے کی اجازت نہیں دی جائے"۔

مذکورہ مکتوب کا عکس ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے دوران خواجہ

غلام محمد صادق نے ریاستی پریس کے لئے ریلیز کیا، جو وادی کے تقریباً تمام اخبارات میں شایع ہوا۔ اور اسی مکتوب کا تذکرہ جناب شیخ محمد عبداللہ کی سوانح "آتش چنار" میں مرقوم ہے:

میر واعظ مولوی یوسف شاہ کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن حکیم کا کشمیری زبان میں تفسیر قرآن "بیان القران" کے نام سے خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن نشاط انصاری صاحب اور کچھ محققین اس ترجمے کو مرحوم غلام محمد حنفی سوپوری کے ساتھ جوڑتے ہیں، اور اس سلسلے میں ان کے مضامین شایع ہو چکے ہیں۔ جب میر واعظ مولانا یوسف شاہ کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو مرحوم میر واعظ صاحب اپنے دور کی دوسری اہم شخصیات کی طرح متضاد خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ نظر آتے ہیں اور یہی بات اُن کے منفرد اور ممتاز ہونے کی دلیل ہے۔ میر واعظ صاحب طویل علالت کے بعد ۱۶، رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۱ھ بروز جمعہ بمطابق ۵، اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ۷۸ سال ۲۱ دن کی عمر میں اس دار فانی سے راولپنڈی پاکستان میں داعئ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی وفات پر وادی کشمیر میں کئی دن تک ماتم منایا گیا۔ تعزیتی جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے، جن میں سب سے بڑا اجتماع جامع مسجد سری نگر کے احاطے میں ہوا جہاں جناب شیخ محمد عبداللہ، مولانا محمد سعید مسعودی، خواجہ غلام محی الدین قرہ اور دوسرے قومی اور مذہبی رہنماؤں نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ شیخ محمد عبداللہ نے تو یہ کوشش بھی کی کہ ان کے جسد خاکی کو سری نگر لایا جائے اور اس سلسلے میں پاکستان کے صدر سے بھی رابطہ قائم کیا۔ لیکن انکی سعی کامیاب نہ ہوئی اور میر واعظ کو راولپنڈی میں سپرد خاک کیا گیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)



کتابیات

(۱) "کشمکش" چودھری غلام عباس خان

(۲) "آتشِ چنار" ـ سوانح شیخ محمد عبداللہ ـ ترتیب محمد یوسف ٹینگ

(۳) پی ایل او ـ خواجہ عبدالصمد وانی' مدیر کشمیر راولپنڈی

(۴) تحریک حریت کشمیر ـ اوّل' دوم' سوم ـ رشید تاثیر

(۵) "کشمیر فائٹ فار فریڈم" ـ محمد یوسف صراف

(۶) 'فریڈم سٹرگل' ـ پنڈت پریم ناتھ بزاز

(۷) "کشمیر ـ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۷ء" ـ ثناءاللہ بٹ مدیر آفتاب' سرینگر

(۸) 'قائد کشمیر' ـ بشیر احمد قریشی مطبوعہ لاہور ـ

(۹) 'کشمیری مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد' مرزا شفیق حسین مطبوعہ اسلام آباد (پاکستان)

(۱۰) شخصیات نمبر "ہمارا ادب" مطبوعہ کلچرل اکادمی مرتب محمد احمد اندرابی

• روزنامہ ہمدرد پریم ناتھ بزاز • ہفت روزہ 'السلام' سرینگر • صداقت سرینگر

• روزنامہ آفتاب' سرینگر • روزنامہ 'ہمدرد' غلام رسول عارف • ہفت روزہ محافظ' سری نگر • ہفت روزہ 'انصاف' راولپنڈی • ہفت روزہ کشمیر راولپنڈی

• ہفت روزہ پاک کشمیر راولپنڈی • ہفت روزہ 'قائد' مظفر آباد



اکبر حیدری

آغا سیّد یوسف الموسوی

شیعہ مسلمانوں میں آپ عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ریاست جموں وکشمیر میں عوام کے ہر طبقے میں آغا صاحب کے نام سے مشہور اور ہر دلعزیز تھے۔ آغا صاحب ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی ۳۷ ویں اور حضرت شمس الدین محمد عراقی کی چودھویں پُشت سے تھے۔ راقم حروف کے استفسار سے اپنی تاریخ ولادت ۱۳۲۲ھ ہجری مطابق ۱۹۰۵ء بیان کی تھی۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار جناب آغا سید محمد صاحب قبلہ سے حاصل کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۳۵۳ھ ہجری میں مزید تحصیل علوم کے لئے عراق تشریف لے گئے اور نجف اشرف میں بڑے بڑے علمائے دین سے دینی علوم حاصل کئے۔ ان میں سید ابوالحسن اصفہانی، آقا حسین طباطبائی قمی، آقا ضیاء الدین عراقی، آقائے شیخ محمد اصفہانی، آقا میرزا ابوالحسن مشکینی، آقا ابراہیم الحسنی، آقا سید حسین طباطبائی البروجردی، آقا محسن الحکیم، آقا سید محمود الحسینی، شیخ محمد کاظم، آیت اللہ آقائے شیرازی، آقائے جمال مرسوی گلپائیگانی وغیرہ کے سے بزرگان دین اور افاضل زمانہ آپکی علی الاستعداد اور اعلیٰ صلاحیتوں کے قائل تھے۔ ان علمائے روزگار کے اجازات و اسناد آپ کے دینی علوم کے

سلسلے میں "ایقاظ العباد" میں شائع ہوئے ہیں۔ رہبر انقلاب ایران فقیہہ عصر آیت اللہ خمینی سے آپ کے مراسم خاص تھے۔ راقم الحروف نے آغا صاحب مرحوم کے نام کئی ایسے خط دیکھے ہیں جو علامہ خمینی نے اپنے دست خاص سے لکھے تھے۔

آغا صاحب شرافت کے پیکر تھے۔ چہرے سے روحانیت ٹپکتی تھی۔ دوست اور دشمن اپنے اور غیر ان کے تقویٰ، بزرگی، فضیلت، سیادت، حسن تدبر، سلامت طبع، دیانت داری اور سچائی کے معترف تھے۔ لوگ ان کے پاس سونے کے زیورات اور بڑی بڑی رقمیں بطور امانت رکھتے تھے۔ ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ جب لوگ اپنی اپنی امانتوں کو پھیرنے کے لئے کہتے تھے تو فوراً انہیں واپس کرتے تھے۔ بزرگی اس درجے کی تھی کہ بڑے بڑے امراء، روساء، وزراء اور حکام بلاتمیز مذہب و ملت آپکی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ وزیر اعظم بخشی غلام محمد اور دوسرے وزرائے اعلیٰ غلام محمد صادق، سید میر قاسم اور ڈاکٹر کرن سنگھ وغیرہ ان کے شریعت کدے پر جاتے۔ شیخ محمد عبداللہ ان کے تقدس و تقویٰ کے بے حد قائل تھے اور گاہ بگاہ ان سے ملتے۔

آغا سید یوسف نے انجمن شرعی شیعان جموں و کشمیر کی داغ بیل ڈالی۔ انجمن کی سرپرستی اور نگرانی ان کی ذات سے وابستہ تھی۔ انجمن کے تحت مذہب اثنا عشری کی ترویج ہو رہی ہے۔ انہوں نے بڈگام میں ۱۷، ربیع الاول ۱۳۷۰ ہجری کو باب العلم کی بنیاد ڈالی اور اسی سال سے اسمیں درس و تدریس کا کام بھی شروع کیا۔ مدرسے کا سارا انتظام انجمن شرعی کے تحت ہو رہا ہے۔ مدرسۂ باب العلم کے علاوہ آغا صاحب مرحوم نے پوری ریاست یعنی جموں، کشمیر اور لداخ میں دینی علوم کے مدرسے قائم کئے۔ مدرسے کی فلاح و بہبود کے لئے انہوں نے لاکھوں روپے کی مالیت کی اراضی وقف کردی۔ شہری اور دیہی علاقوں میں مدرسوں کے علاوہ آغا صاحب نے انجمن شرعی کے تحت امام باڑے اور مسجدیں تعمیر کیں ان میں بڈگام اور حسن آباد کا امام باڑہ قابل ذکر ہیں۔ بڈگام کا امام باڑہ

۱۳۷۵ھ ہجری میں لاکھوں روپے صرف کرکے تعمیر کیا گیا۔ اس میں فن سنگتراشی اور پیپر ماشی کے بہترین نمونے نظر آتے ہیں۔ ان پر محتشم کاشانی کے مرثیہ دوازدہ بند کے اشعار بڑی مہارت اور خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں۔

جناب آغا صاحب کا ایک بڑا کارنامہ جو انہوں نے اپنی زندگی میں انجام دیا یہ ہے کہ موصوف نے اپنے شریعت کدے میں شرعی عدالت قائم کی تھی۔ اس میں شریعت یعنی نظام مصطفےٰ ؐ کے تحت فیصلے ہوتے تھے۔ عدالت کی نظیر بر صغیر میں اور کہیں نہیں ملتی تھی۔ فریقین شرعی فیصلوں کے پابند رہتے تھے۔ اگر کوئی فریق فیصلے کا احترام نہیں کرتا تھا تو لوگ اس کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے اور اس کے خلاف سوشل بائیکاٹ کیا جاتا تھا۔ عوام کو ان فیصلوں پر اتنا اعتماد تھا کہ شیعوں کے علاوہ سنی حضرات اور غیر مسلم بھی ان کو قبول کرتے تھے۔ وراثت، وصیت، انتقالات اراضی، منقولہ و غیر منقولہ جائداد اور خرید و فروخت کے بیعنامے اسی شرعی عدالت میں رجسٹر کئے جاتے تھے۔

آغا صاحب کے انصاف کا یہ عالم تھا کہ اس مادی زمانے میں جہاں اخلاقی قدریں روز بروز پامال ہو رہی ہیں اور لوگ لقد نرائن کی پوجا کرتے ہیں وہ زرعی اصلاحات کے قانون کے خلاف تھے اور مالکان زمین کو کاشتکاروں سے زمین واپس دلاتے تھے یا انکو فریقین کی رضامندی سے معاوضہ دلاتے تھے۔ راقم حروف کی موجودگی میں غیر مسلموں نے درخواستیں دی تھیں کہ آپ کے مریدوں نے ہماری زمینیں ہتھیا لی ہیں اس لئے ہم آپ کی عدالت میں "اسلامی" انصاف کے تحت فیصلہ چاہتے ہیں۔ کاشتکاروں کو یہ خیال تھا کہ آغا صاحب ان کے ہم مذہب ہیں اور وہ ان کے مرید ہیں اس لئے فیصلہ انہی کے حق میں ہوگا۔ آغا صاحب فریقین کے مقدمے کی سماعت خود کرتے تھے اور نظام مصطفےٰ ؐ کے تحت غیر مسلم کے حق میں فیصلے صادر کرتے تھے۔ شرعی عدالت سے لوگ

سرکاری عدالتی جھگڑوں سے چھٹکارا پاتے تھے اور قانونی چارہ جوئی میں ان کا پیسہ اور وقت بچتا تھا۔ جب بھی نظامِ شریعت کے اصولوں کے خلاف ریاستی اسمبلی میں کوئی بل پیش ہوتا تھا تو آغا صاحب اُس کی مخالفت کرتے تھے۔ ان میں اسقاطِ حمل کا بل، نکاح کا بل اور شراب نوشی کا بل قابلِ ذکر ہے۔ موصوف دراصل اس بات کے حامی تھے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں شریعتِ محمدیؐ کے تحت عدل و انصاف کی بنیاد پر تمام قضیے نمٹائے جائیں اور غیر مسلمین کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

کشمیری مسلمانوں میں یہ رواج تھا کہ صرف خانہ نشین دختروں کو وراثت کا حق دار سمجھا جاتا تھا اور جن لڑکیوں کی شادی گھر سے باہر ہوتی تھی وہ حقِ وراثت سے محروم کی جاتی تھیں۔ آغا صاحب نے اس رسم کیخلاف رائے عامہ منظم کی اور اسے نظامِ اسلام میں ایک سنگین بے قاعدگی سے محمول کیا۔ ان کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت اب خانہ نشین اور غیر خانہ نشین لڑکیوں کو یکساں طور پر وراثت کا حق دار تسلیم کیا جاتا ہے۔

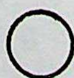
یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کشمیر اور ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے متبرک مقامات سرکاری اوقاف کے دائرہ اختیار میں آتے ہیں۔ پورے ہندوستان میں صرف شیعانِ کشمیر ہی ہیں جن کے مذہبی مقامات اوقاف ایکٹ کے حدِ اختیار میں نہیں آتے ہیں۔ آغا صاحب اس بات کے حق میں نہیں تھے کہ شیعوں کا بھی کوئی اوقاف اس ایکٹ کے تحت آجائے۔ موصوف خود شیعہ اوقاف کے صدر تھے اور تمام تعمیرات، دوکانات اور امام باڑوں وغیرہ کا حساب انہی کی نگرانی میں ہوتا تھا۔

راقم نے کئی مرتبہ بچشمِ خود دیکھا ہے کہ جو لوگ دُور دراز علاقوں سے اپنے قضیوں کو نمٹانے کے لئے آغا صاحب کی شرعی عدالت میں حاضر ہوتے تھے اور جن کے ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، وہ تاریخِ مقررہ سے ایک دن پہلے آتے تھے اور ان ہی کے شریعت کدے میں قیام کرتے تھے۔ ان کے قیام و طعام کا بندوبست آغا صاحب

ہی فرماتے تھے۔ اس طرح ایک بڑی تعداد میں لوگ انتہائی مہنگائی کے زمانے میں ان
کے دسترخوان سے فیض یاب ہوتے تھے اور قیام و طعام کی پریشانیوں سے فارغ
ہوتے تھے۔ ان کے شریعت کدے سے کوئی بھی سائل خواہ اس کا تعلق کسی بھی فرقے
سے ہوتا خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا۔ موصوف یتیموں اور بیواؤں پر ہمیشہ دستِ شفقت
رکھتے تھے۔ ہندوستان کے دینی مدرسوں اور طلباء کی امداد بھی کرتے تھے۔ اکثر یہ بھی
مشاہدے میں آیا کہ لوگ انکی عدالت میں خرید و فروخت اور مہر و بدل وغیرہ کے سلسلے
میں بڑی بڑی رقمیں اور بیش بہا زیورات بغیر کسی رسید یا شواہد کے رکھتے تھے تو آغا
صاحب بعد فیصلہ یہ چیزیں فریقین کو واپس کرتے تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل اور ان کی
شرعی عدالت کا ربط و ضبط اور تقدس دیکھ کر آزاد خیال اور تعلیم یافتہ لوگ بہت مرعوب
اور متاثر ہوتے۔ ایسے ہی ایک شخص نے آغا صاحب کی سوانح حیات مرتب کرنے کیلئے انجمن
شرعی کو ایک معقول رقم بطورِ نذرانہ پیش کی تھی۔

آغا صاحب کا انتقال ۱۰ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ۳۰ اگست ۱۹۸۲ء کو (شب دوشنبہ
ایک بجکر ۴۸ منٹ پر) ہوا۔ حکومت کشمیر نے اس دن عام تعطیل کا اعلان کیا تھا۔ جنازے
میں لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ اس وقت کے گورنر جناب بی۔ کے نہرو بھی
ان میں شامل تھے۔ شیخ محمد عبداللہ نے بھی ان کے انتقال پر پیغام تعزیت بھیجا تھا۔ وزیر
اعظم مسز اندرا گاندھی، ان کے انتقال کے بعد مرحوم کے شریعت کدے بڈگام گئی تھیں اور
وہاں ان کے لواحقین کو تعزیت دی تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایسی شخصیتیں بہت عرصہ بعد زمانے کو نصیب ہوتی ہیں۔



؎ جناب غلام رسول رینزو (حیدری)

مولوی محمد ابراہیم

سید میرک شاہ کاشانی

غالباً جولائی ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے کہ راقم الحروف مع اہل و عیال کے اپنے خسر مولوی احمد شاہ مرحوم متوفی ۱۱ شعبان ۱۳۷۱ھ (مطابق ۶ مئی ۱۹۵۲ء) بروز منگل کے ہمراہ نشاط و شالامار کی سیر پر تھا کہ ان کے ایمائے سے جو راسخ العقیدہ سنی مسلمان، خوش اعتقاد اور اولیائے و بزرگان کرام کے بے حد معتقد تھے، مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کی خدمت اقدس میں پہنچا۔ جناب میرک شاہ صاحب نے پرتپاک خیر مقدم کرنے کے بعد ہم ملاقاتیوں اور زائروں کی آؤ بھگت اپنی مخصوص کوٹھری میں قہوہ اور چائے سے کی۔ بعد ازاں نیچے اترے اور کوٹھری کے صحن میں بطرف مغرب ایک سبز چادر پوش قبر پر فاتحہ پڑھی جس میں ہم لوگوں نے بھی آپ کا ساتھ دیا۔ اس موقعہ پر راقم الحروف نے مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کا حلیہ ذہن میں قائم کیا جو امتداد زمانہ سے ممکن ہے قدرے مضمحل ہو چکا ہو۔ مرحوم ایک لاغر بدن، خشخشی داڑھی والے ایک مائل بہ پست قد بزرگ تھے۔ بیشتر داڑھی سفید ہو چکی تھی۔ مرحوم میرک شاہ صاحب کے ساتھ یہ راقم کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد فقیر ملت کے متعلق جو بھی سنا، وہ یقیناً

حدیثِ دیگراں بھی جس پر راقم کا بیان ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ہماری تمام تر معلومات ہم سے بہتر دیگر اشخاص کے بیانات و اقوال کا چربہ ہوتی ہیں۔

اس مختصر سی نشست کے بعد جو غالباً نصف گھنٹہ سے زیادہ ممتد نہ تھی میرک شاہ صاحب مرحوم کے متعلق میرا تاثر یہ تھا کہ آپ ایک ہنس مکھ، مرد با اخلاق، قانع، مردم شناس اور درویش منش شکل تھے۔ پہلی ہی صحبت میں بہت جلد اپنے ملاقاتیوں اور زائروں سے بے تکلف اور گھل مل جایا کرتے تھے۔ گندم نما جو فروش فقراء اور درویش کے بر عکس ظاہری نام و نمود اور ریاکاری سے مبرا اور پاک تھے۔ یہ دریافت کئے بغیر کہ زائر کون ہے اور کہاں سے آیا ہے، بے تکلف مہمان نوازی کیا کرتے تھے۔ راقم کے خیال میں مرحوم میرک شاہ صاحب کی یہ سب سے بڑی کرامت اور خوبی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم میں صاحب کرامات بزرگ تو بہت ہیں لیکن صاحب اخلاق اور اعلیٰ انسانی صفات کے مالک حضرات معدودے چند ہیں۔

تواضع اور انکساری مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کا وصف نمایاں تھی، جو صوفیاء اور اہل دل کے نزدیک خلاصۂ تصوف و روحانیت ہے۔ بقول سعدی شیرازیؒ

دلا گر تواضع کنی اختیار — شود خلقِ دنیا ترا دوستدار

تواضع کند ہوشمند گزین — نہد شاخِ پُر میوہ سر بر زمین

ایک اور وصف جو راقم نے مرحوم میرک شاہ صاحب کی ذات والاصفات میں خاص طور پر قابل ذکر پایا، وہ محسن کے احسان کی یاد ہے۔ آپ سے ذاتی طور پر نزدیک سے واقف کار اشخاص کی روایت کے مطابق فقیر ملت جناب میرک شاہ صاحب مرحوم پیشہ کے اعتبار سے نقاش یا کپڑوں پر کشیدہ کار تھے جو اپنے مکان واقع عراف کدل، سرینگر کشمیر میں بحسن و خوبی بجا لاتے تھے اسی دوران مرحوم عبدالقادر زنہ گیری المعروف بہ لالہ صاحب سے انہیں عقیدت

پیدا ہوگئی۔ مرحوم عبدالقادر نروہیمری ایک خاندانی سید تھے اور اُن کا شجرۂ نسب سادات کاشان سے تھا۔ کاشان ایران کا ایک شہور شہر ہے جس نے اسلام کے بہت سے بڑے اور عظیم اشخاص کو جنم دیا ہے۔ مرحوم میرک شاہ صاحب اپنے مرشد لالہ صاحب کی نسبت سے کاشانی کہلاتے تھے۔ بعد از وفات انہیں اپنے پیرومرشد کا اتنا احترام تھا کہ ہر زائر کو رخصت کرتے وقت مرحوم کی قبر پر ثواب فاتحہ کا ارسال کیا کرتے تھے۔ احسان یاد رکھنے کی جناب میرک شاہ صاحب میں یہ بہت بڑی خوبی تھی اور جسے راقم الحروف نے متذکرہ صدر مختصر سی ملاقات میں بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔

روایت کے مطابق میرک شاہ صاحب مرحوم بلا کسی رسم و رواج کے مرشد کی جگہ سجادہ نشین ہوئے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رسم زمانہ کے مطابق نہ تو دستار بندی کی گئی تھی اور نہ تقریب جانشینی کے سلسلے میں ان کے اعزاز میں کوئی جلسہ منعقد ہوا تھا۔ بلکہ بقول راوی یہ منصب مرحوم نے خود ہی سنبھال لیا تھا اور جس میں وہ عوام کی توقعات کے مطابق بہت حد تک پورے اترے تھے۔ گویا اس معاملہ میں اپنے متعلق مرزا اسداللہ خان غالب کی طرح خودنظری (اپنی اہمیت کا اندازہ خود لگالینا) کا درجہ حاصل تھا جب مرزا موصوف نے اپنے متعلق یہ کہا تھا۔

کوکبم را در ازل اوج قبولی بودہ است
شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

(روز ازل ہی سے میرے ستارہ کو قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ ثبوت یہ ہے کہ میری شاعری کی شہرت دنیا میں میرے بعد ہوگی)۔

مرحوم میرک شاہ ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۶ - ۱۹۱۷ء) میں محلہ صراف کدل (نزدیک ملارٹہ)

سرینگر، کشمیر کے قریب پیدا ہوئے۔ آپ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ انہوں نے بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک کشمیر میں عربی و فارسی کی مروجہ نصابی تعلیم میں قرآن کریم ناظرہ، پندنامہ شیخ فریدالدین عطار، کریما، نام حق، شروط الصلوٰۃ بدائع منظوم، گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، مخزن اسرار، حرف ہوائی اور معتزی وغیرہ ابتدائی کتب کی تحصیل کی تھی۔ آپ کے استاد ایک بزرگ سیف الدین صاحب تھے جو کاڈی کدل کے متصل ایک مکان میں مکتب داری کیا کرتے تھے۔ آغاز جوانی میں تمباکو نوشی سے شغف تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ میرواعظ مولوی احمد اللہ صاحب میرک شاہ صاحب کے مکان واقع صراف کدل میں تشریف لائے۔ میرک شاہ صاحب تمباکو نوشی کر چکے تھے۔ جب انہوں نے سنا تو فوراً منہ چادر سے ڈھانپ لیا اور اس وقت تک اسی حالت میں رہے جب تک مولانا گھر سے باہر نہ چلے گئے۔ میرواعظ مرحوم نے مناسب نہ سمجھا کہ درویش کے اس فعل سے تعرض کیا جائے۔ روایت کے مطابق میرک شاہ مرحوم آغاز میں میرواعظ خاندان کے معتقدین اور محبین میں سے تھے۔ اس سلسلے میں ایک بار انہوں نے مرحوم میرواعظ مولانا محمد یوسف شاہ صاحب کو شالامار کے موجودہ مقام پر وعظ خوانی کیلئے دعوت دی تھی۔ مرحوم میرواعظ محمد یوسف شاہ نے اس موقعہ پر تمباکو اور نشہ آور اشیاء کی حرمت پر ایک تقریر کی تھی جو مرحوم میرک شاہ کے حسب منشأ نہ تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۱ء کے بعد کشمیر کی سیاست جب دو دھڑوں یعنی مولوی محمد یوسف شاہ صاحب اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی پارٹیوں میں بٹ گئی تب فقیر ملت نے موخرالذکر کا ساتھ دیا تھا اور اس فیصلہ پر آخیر وقت تک ڈٹے رہے تھے۔ آپ کا والد (میرک شاہ) محلہ ملارٹہ سرینگر کے مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابی عرف مولانا سید مختار اللہ اندرابی کے نام پر تھا جو سنہ ۱۳۰۶ھ (۱۸۸۸ء)

میں بعہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ آنجہانی پیدا ہوئے تھے۔ آپ عالم متبحر اور علوم معقولات و منقولات کے بحر ناپیدا کنار تھے۔ راقم الحروف ایّام طالب علمی میں ان کا خوشہ چین رہ چکا ہے۔ راقم کا یہ قیاس اس حقیقت پر مبنی ہے کہ کشمیر میں نام بالعموم شہرت اور مرتبہ پر رکھتے جاتے ہیں۔ جب کسی بڑے آدمی کا نام لوگوں کے سامنے آتا ہے تو بالعموم اسے اختیار کرنے میں پس و پیش نہیں کی جاتی۔ غالباً یہی وجہ میرک شاہ نام کی بھی ہو۔

مرحوم میرک شاہ ابتدا ہی سے عابد و خلوت پسند تھے۔ انہوں نے عقد بھی کیا تھا لیکن جب دیکھا کہ زوجہ سے تعلقات انکی عبادت و خلوت میں مخل ہیں، تو بیوی کو طلاق دے کر اس کے اخراجات کا بندوبست کر دیا تھا۔ اس ازدواج سے اُن سے ایک لڑکی معرض وجود میں آئی تھی جس کی پرورش آپ کی بہن نے کی تھی اور ازدواج کا بندوبست بھی کیا تھا۔

کشمیر کے فقرا و درادیش کی طرح مرحوم میرک شاہ صاحب کہیں جاتے وقت گھوڑے پر سوار ہوا کرتے تھے اور باقاعدہ قمچی ہاتھ میں ہوتی تھی۔ محترم غلام قادر صاحب لالہ پوری ملازی کا بیان ہے کہ اُن کا ابتدائی نام عبدالرحمٰن تھا۔ اُن دنوں وہ زینہ کدل، سرینگر میں دکانداری کیا کرتے تھے کہ میرک شاہ کا گذر ہوا۔ اس موقعہ پر گھوڑے پر سوار تھے۔ اس وقت انہوں نے عبدالرحمٰن نام بدلا کر غلام قادر رکھ دیا، اور وجہ یہ بتائی کہ اوّل الذکر نام ان کے حق میں بھاری اور ثقیل ہے۔ راقم کے نزدیک اس تبدیلی کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ غلام قادر ان کے مرشد کا نام تھا، دوسرے یہ کہ مرحوم شیخ سید عبدالقادر گیلانی کے بے حد معتقد تھے۔ اس لئے عبدالرحمٰن کو جو اسلام میں عمارہ ترین نام متصور ہوتا ہے، غلام قادر میں تبدیل کر کے فقیر ملّت نے پیر دوستی اور محبت غوث اعظم

قدس اللہ سرہٗ کا مظاہرہ کیا ہے۔ مرحوم میرک شاہ صاحب کو تبدیلیٔ نام کا بے حد شوق تھا۔ خود آپ کے خلیفہ اور جانشین جناب محمد شاہ صاحب کا بیان ہے کہ ان کا حقیقی و اصلی نام محمد شاہ تھا، مرحوم نے اس کے شروع میں دین لگا کر اسے دین محمد شاہ کر دیا تھا۔ اور اسی لئے تب سے وہ خود کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔

مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی اپنے لقب کی طرح فی الحقیقت درویش تھے۔ انہیں دنیا اور اہل دنیا سے قطعاً بے رغبتی تھی۔ غالباً ۱۹۶۶ء کا واقعہ ہے کہ آپ الحاج مولانا سید قاسم شاہ بخاری صاحب کے دولتکدہ پہ تشریف لائے۔ معتقدین کو جب علم ہوا تو جم غفیر کی شکل میں بغرض زیارت میرک شاہ صاحب مولانا کے مکان پہ آ کر فقیر ملت کو بہ امیری نوٹوں کا ہدیہ پیش کرنے لگے۔ جناب میرک شاہ صاحب کاشانی نے ان سب سے لاتعلقی ظاہر کرتے ہوئے تمام کے تمام نوٹ سید محمد قاسم شاہ بخاری کی تحویل میں دیدئے اور اس نیاز سے کچھ بھی اپنے پاس محفوظ نہ رکھا۔ سعدی شیرازی نے بوستاں میں ابدال ؎ کے باب میں لکھا ہے: ؎

شنیدی کہ در روزگار قدیم | شدی سنگ در دست ابدال سیم
نہ پنداری ایں قول معقول نیست | چو قانع شدی سیم و سنگت یکیست

(تو نے سنا ہوگا کہ گذشتہ زمانے میں پتھر ابدال کے ہاتھ میں چاندی ہو جاتا تھا۔ اس بات کو خلاف عقل نہ سمجھ مطلب یہ ہے کہ جب قناعت اختیار کر لی تو پتھر اور سونا ایک ہو جاتا ہے)

؎ ابدال الف کے زبر سے اولیاء اللہ کی ایک جماعت ہے جن کے سبب حق تعالیٰ دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے یہ لوگ تعداد میں ستر ہوتے ہیں جن میں سے چالیس ملک شام میں ہوتے اور باقی تمام عالم میں۔ (ان میں سے جب ایک مرجاتا ہے تو دوسرا اس کی جگہ قائم ہو جاتا ہے +

ابدال کی صفت قناعت آپ پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرامیسری نوٹوں کو کاغذ کے پرزوں کی طرح خود سے دور پھینک دیا۔ یہ صفت دنیا طلبی سے اُن کی نفرت ظاہر کرتی ہے جو درویشانِ خدا مست کا خاصا ہے۔

مرحوم میرک شاہ کاشانی کی کرامت کے باب میں مولانا سید قاسم شاہ صاحب بخاری کے فرزند اور راقم کے عزیز شاگرد پروفیسر فاروق احمد بخاری کا بیان ہے کہ ایک بار والد موصوف مع چند اصحاب کے شالامار میرک شاہ صاحب کی قیام گاہ پر برائے ملاقات گئے۔ چلتے وقت دل میں سوچ رہے تھے کہ قبلہ میرک صاحب حسب دستور ان کی خاطر تواضع قہوہ سے فرمائیں گے جو از روئے صحت اُن کے حق میں مضر ہے۔ لیکن قیام گاہ پر پہنچ کر ان کے تعجب اور حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرک شاہ صاحب نے باقی رفقاء کے لئے قہوہ اور مولانا بخاری کے لئے دودھ لانے کی تاکید کی۔ یہ واقعہ جناب میرک شاہ صاحب مرحوم کے کشف قلوب کو ظاہر کرتا ہے۔

تاریخی و مذہبی اعتبار سے مرحوم میرک شاہ صاحب کی زندگی کا اہم ترین اور قابل ذکر کارنامہ موئے مقدس کی شناخت یا نشاندہی ہے۔ سنہ ۱۹۶۲ء کا سال تاریخ کشمیر میں زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال کے وسط میں کامراج منصوبہ کے تحت مرارجی ڈیسائی مرکزی وزارت سے اور بخشی غلام محمد مرحوم جموں و کشمیر میں وزارت عظمیٰ کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ ریاست میں بخشی صاحب کی جگہ اُن کے ایما سے خواجہ شمس الدین صاحب نے سنبھال لی تھی۔ خواجہ صاحب کا تعلق جنوبی کشمیر کے علاقہ اسلام آباد سے تھا۔ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء کے اختتام پر ایک رات پر اسرار طور پر درگاہ حضرت بل سے موئے مقدسِ نبوی راتوں رات اپنی جگہ سے اٹھا لیا گیا۔ جنوری ۱۹۶۳ء کے مہینہ میں زبردست

ہلچل مچ گئی اور عوام "ہائے سون موئے مقدس۔ ہائے سون موئے مقدس" کہتے ہوئے کوچہ و بازار میں نکل آئے۔ ایک شورش اور انقلاب کا سماں تھا۔ بالآخر مسلسل دو ہفتوں کی ہائے ہو کے بعد ایک صبح اچانک ڈرامائی طور پر یہ اعلان ہو گیا کہ موئے مقدس حجرۂ خاص میں پندرہ روز کی غیبوبت کے بعد دوبارہ اپنی جائے معہود پر لوٹ آیا ہے۔ تاہم لوگ اصلیت کے بارے میں گومگو کی کیفیت میں تھے، اس وقت وادیٔ کشمیر میں صرف شفیر ملت جناب میرک شاہ صاحب ہی ایسے تھے جن کی بزرگی اور بے لوثی سب پر عیاں تھی۔ چنانچہ فیصلہ کے مطابق موئے مقدس کی نشاندہی کے لئے انہیں طلب کیا گیا۔ اسی چیز کے پیش نظر مرحوم میرک شاہ صاحب نے موئے مقدس نبویؐ کی شناخت بروز بدھوار، ۱۹ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ (۱۳ فروری ۱۹۶۳ء) کو ایک مجمع عام میں کی۔ اس موقعہ پر مرحوم کے خلیفہ جناب زین محمد شاہ بھی ہمراہ تھے۔ اس کے دو روز بعد یعنی ۲۱ ماہ رمضان ۱۳۸۲ھ (۱۵ ماہ فروری ۱۹۶۳ء) کو حسب دستور نشاندہی کا طریقہ عمل میں لایا گیا۔

بروایت سجادہ نشین یہ روز شاہ ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عرس پاک یا شہادت کا تھا، کیوں کہ بقول مؤرخین خلیفہ چہارم عبدالرحمٰن ابن ملجم کے ہاتھوں، ۱۷ رمضان المبارک، روز جمعہ ۴۰ھ (۲۴ جنوری ۶۶۱ء) کو اس کی زہر پلائی تلوار سے زخمی ہوئے تھے اور اس واقعہ کے چار روز بعد یعنی ۲۱ رمضان المبارک بروز منگل ۴۰ھ (۲۸ جنوری ۶۶۱ء) کو اپنے مولیٰ سے جا ملے تھے۔ اس شناخت پر کچھ حلقوں میں میرک شاہ صاحب پر چہ مے گوئیاں بھی ہوئیں۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد جب درگاہ کی قدیم عمارت جو خالص کشمیری فن تعمیر کی حامل تھی اور باقاعدہ پلیٹ فارم تھی، شہید کر کے موجودہ جدید آستان کی بنیاد ڈالی گئی، تو بہ استدعائے مرحوم شیخ محمد عبداللہ متولی آستان، میرک شاہ صاحب سنگ بنیاد ڈالنے والے بنے

اس موقعہ پر چاندنی کی کرنی ان کے ہاتھ میں تھمائی گئی تھی جس کے ذریعہ انہوں نے اس کی نیو میں اپنے نازک اور ضعیف ہاتھوں سے مسالہ ڈالا تھا۔ میرک شاہ صاحب کے دیگر کارناموں میں آپ کی قیام گاہ کے پاس موجودہ مسجد شریف کی تعمیر و تاسیس ہے جو ان کی خدا دوستی اور متشرع ہونے کا بہترین ثبوت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ مرحوم کے خلیفہ جناب دین محمد شاہ صاحب بھی رکن اسلام یعنی نماز کے شدت کے ساتھ پابند ہیں۔ راقم نے انہیں بچشم خود اپنے خلوتی کمرہ میں مصروف نماز ظہر پایا ہے۔ اختتام صلوٰۃ پر راقم سے اُن کا پہلا سوال بھی ادائیگی نماز کے باب میں تھا۔ اس سے فی الواقع اپنے نام کی طرح آپ سے دینداری اور پرہیزگاری مترشح ہوتی ہے اور یہ کہ جناب میرک شاہ صاحب اپنے خلیفہ اور جانشین میں مذہبی جذبہ کے شدت سے قائل تھے۔ موجودہ شخص میں ان کا انتخاب یقیناً لائق صد تحسین و مبارک باد ہے۔

سانحہ موئے مقدس کے بعد سے مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کا تعلق کشمیر کی انجمن تبلیغ الاسلام سے ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں انکی توجہ سب سے پہلے راقم کے عزیز شاگرد پیرزادہ بدرالدین احمد اکدلی نے کروائی تھی۔ بعد ازاں یہ کام سید قاسم شاہ صاحب بخاری نے اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ چنانچہ انجمن کا ماہوار رسالہ "التبلیغ" فخرِ ملت جناب میرک شاہ صاحب کاشانی شالیماری کی زیر سرپرستی شائع ہوا کرتا تھا۔ آپ اس رسالے کی دامے، درمے اور قدمے گویا ہر طرح کی معاونت کیا کرتے تھے۔

مرحوم میرک شاہ صاحب اگرچہ طبعی اور فطری طور پر ایک مرد گوشہ نشین و روپوش تھے، تاہم کبھی کبھار کشمیر میں اپنی موجودگی کے اظہار کے لئے سیاست میں بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کا تعلق شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ مرحوم کی پارٹی

نیشنل کانفرنس سے تھا ۔ روایت کے مطابق شیخ صاحب نے ۱۹۴۶ء میں جب ڈوگرہ حکومت کے خلاف "کشمیر چھوڑ دو" کا نعرہ بلند کیا تب وہ گھوڑے پر سوار لکڑی کی تلوار کے ساتھ اس سلسلے میں منعقد مظاہرہ میں شریک ہوئے تھے ۔ خود شیخ صاحب کو بھی اس بات کا علم تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر مذہبی اور سیاسی تقریب کے موقعہ پر انہیں پیش پیش رکھتے تھے، کیوں کہ اُن کے علم کے مطابق نشاط، شالامار اور برین کے دیہاتوں اور بعض مخصوص شہری علاقوں میں میرک شاہ صاحب اچھی خاصی اہمیت کے مالک تھے جس کا اندازہ بالعموم ووٹنگ (رائے دہی) کے موقعہ پر کھل کر ہوتا تھا ۔ ابتدا میں ترکی خلافت کے اثر سے شیخ محمد عبداللہ کی ابتدائی زندگی کی طرح مرحوم میرک شاہ صاحب بھی ترکی ٹوپی کا استعمال کرتے تھے، مگر بعد میں اس رواج کے متروک ہو جانے سے مروجہ گنبد نما کشمیری ٹوپی، جو بالعموم دیہاتوں میں مقبول ہے، پہننے لگے تھے ۔ راقم نے جولائی ۱۹۵۱ء کی ملاقات کے وقت مرحوم کو اسی ٹوپی میں دیکھا تھا ۔

مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کو شعر و سخن میں بھی درک تھا ۔ اگرچہ بلحاظ زبان و بیان اور فنِ شعر کے ان کا کلام اساتذۂ شعر کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا تاہم موضوع کی مناسبت سے بطور تبرک ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے ۔ یہ شاعری ان کی مادری زبان کشمیری میں اور نعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے ۔ گو کہ اس نعت میں بالعموم وزن اور قافیہ کا سقم ہے تاہم اس سے میرک شاہ صاحب کے جذبۂ حب پیغمبرؐ کا بخوبی مظاہرہ ہوتا ہے ۔ بہرکیف کلام بلاغت نظام یہ ہے ۔ اس سے مرحوم کی بھرپور مجذوبیت سامنے آتی ہے:[۱]

اے دل با ہوش با یار   خود گنت من در کنار
گوڑہ لاگ سرمہ رہبر   سیرہ جوہ بس بار بار

---

[۱] ملاحظہ ہو ماہنامہ "التبلیغ" "سرینگر" بابت ماہ صفر المظفر ۱۳۸۷ھ (مئی، جون ۱۹۶۷ء) ص ص ۵ و ۶

ونحن واقرب در خلیل تس شش جہاتس اوس نار
یم زانو ونحن واقرب مس چیتھ تس کیاہ خُمار
یس نحن اقرب جا علیٔ حس کر تس منز کیاہ وقار
ونحن واقرب رٹ دلس اللہ حق ہُو چھُوی سوار
ذکرِ فکر یاد دوست حاضر و ناظر سوی بکار
جامہ ہستی ژھن ژٹت روحی چھُو نوح از کردگار
اے دل گرہ گرہ درپئے آگاہ دِیُ ملک الجبار
ہم خانہ آست کر چھُو دور غم کھت ڈلیشک غمگسار
عاشق بن ہیھنت خانسی خانس اندر خانہ دار
اے دل مثل کوہ طور گارن ہارن اشکبار
خود چھہ ہدئی راہ دِل کر بجایہ جایہ سر نثار
دم دتیہ دِلا وارن غیر ما بوزن گفتار



بیدار و نحن واقرب سرکار و نحن واقرب
نظراہ باخود باز کر ہر تار و نحن واقرب
چھُئے عاشقن کتہ ڈر دلیل گلزار و نحن واقرب
تس حال منصوری عجب بردار و نحن واقرب
تس نار حضرت شاہ علیٔ سر وار و نحن واقرب
پیٹھ شاہ سیف چھوی دُلس زنار و نحن واقرب
خاطر اندر کوئے اوست غفار و نحن واقرب
اے دل ماروح بیہہ گٹھت اسرار و نحن واقرب

ناگاہ ٹوٹھی ماژہ دِے دلدار وِ بخن وا قرب
دِم دِیِتس کُن با حضوٗر دِرغار وِ بخن وا قرب
معشوق چھو اندر پانسی ہرکار وِ بخن وا قرب
یرار نہ روزک با حضوٗر انوار وِ بخن وا قرب
مجنون بن دِرِ صلِ گُل دِربار وِ بخن وا قرب
سیر کرنہ منزٚ شہارن اذ کار وِ بخن وا قرب
نقیر میر وِ چھیدی کریم دِے بخن وا قرب حیٌ قدیم
پے نیوِ ہر شے سوی زگار زیدار وِ بخن وا قرب

مرحوم میرک شاہ صاحب کو سلطان العارفین شیخ مخدوم حمزہ کشمیری علیہ الرحمتہ متوفی ۲۴، صفر المظفر ۹۸۴ھ (بدھ، ۲۳، مئی ۱۵۷۶ء) سے خاص اعتقاد تھا۔ اتوار ۲۵، صفر المظفر ۱۳۸۷ھ مطابق ۴، جون ۱۹۶۷ء کو "یوم محبوب العالم" جب منایا گیا تو جلسہ کی صدارت کے فرائض مرحوم کا شانی نے ہی انجام دِئے تھے۔ اس کی مفصل رپورٹ درج ذیل ہے:[1]

"یومِ محبوب العالمؒ کا عظیم اجتماع

حضرت نقیر ملت سید میرک شاہ صاحب سرپرست انجمن (مراد انجمن تبلیغ الاسلام سے) نے صدارت فرمائی۔ بیس ہزار سے زائد فرزندان توحید نے شمولیت کی"۔

۲۵ صفر ۱۳۸۷ھ مطابق ۴، جون ۱۹۶۷ء (اتوار) انجمن تبلیغ الاسلام کے زیرِ اہتمام آستانہ عالیہ کے مشرقی صحن میں یوم محبوب العالمؒ کا سیرتی اجلاس نہایت احترام و عقیدت اور تزک و احتشام سے منایا گیا۔ سلطان العارفین

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ "التبلیغ" بابت ماہ صفر ۱۳۶۷ھ، ص ۲۱۔

کی سیرتِ مقدسہ پر علماء اور بلند پایہ مقررین نے تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مولانا بخاری صاحب، مولانا جامعی[1] صاحب، مولانا کاملی صاحب جناب محترم خواجہ علی شاہ صاحب صدر اوقاف اسلامیہ، مولانا بشیر الدین صاحب مفتیٔ اعظم، مرزا غلام حسن عارف صاحب، مولانا عنایت اللہ گگانہ یاری[2]، خواجہ غلام حسن صاحب سنگین، محمد قاسم صاحب کاملی، گلزار احمد کاملی، قاضی الطاف احمد اور پیرزادہ نصر اللہ انجمن سے وابستہ نوجوانوں نے تقاریر اور نعتیہ کلام میں حصہ لیا۔ مفصل کاروائی آئندہ۔ شعبہ نشر و اشاعت"۔

محلہ سکہ ڈافر (صفاکدل) میں مرحوم کاشانیؒ نے ایک مسجد کا سنگِ بنیاد بھی رکھا ہے۔ یہ مسجد وہی ہے جہاں بحالت موجودہ مولانا سید محمد قاسم شاہ صاحب بخاری (سابق پرنسپل اورینٹل کالج انجمن نصرۃ الاسلام و بانی حنفیہ کالج) خطابت و امامِ جمعہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ آپ ہی کی مساعی اور عقیدت سے فقیرِ ملت جناب میرک شاہ کاشانی نے مسجد سکہ ڈافر کا سنگِ بنیاد ڈالا۔ روئیداد حسبِ ذیل[3] ہے:

"۱۵ مئی۔ جناب سرپرست انجمن حضرت فقیرِ ملت سید میرک شاہ صاحب کاشانی نے مسجد شریف سکہ ڈافر کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ مسجد شریف حلقہ انجمن سکہ ڈافر کی کوششوں سے تعمیر ہو رہی ہے۔ اس موقعہ پر ایک عام جلسہ بھی ہوا اور صاحب صدر انجمن کی اپیل پر موقعہ ہی پر مسجد شریف کے لئے چندہ بھی کیا گیا۔ حضرت فقیرِ ملت نے اس موقعہ پر اکتالیس

---

[1] افسوس کہ مولانا احد اللہ جامعی صاحب غالباً ۱۹۸۵ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ [2] یہ بھی غالباً اسی برس رحلت کر گئے۔ [3] "البلاغ" بابت ۱۱ صفر ۱۳۸۷ھ، ص ۲۵۔

روپے کا چندہ اپنی طرف سے پیش کیا۔ حضرت فقیر کی تشریف آوری کے سلسلے میں مختلف راستوں کو محرابوں سے سجایا گیا تھا اور ہزاروں لوگوں نے آپ کے ارشاد گرامی سُنے۔"

اس امر کا ثبوت اُس منظوم کتبہ سے بھی ملتا ہے جو متذکرہ صدر مسجد کی محراب کی جانب غرب بیرونی دیوار پر کندہ ہے۔ غالباً اس تاریخی کتبہ کے اشعار مرحوم خواجہ محمد امین دارابؔ کے زورِ فکر کا نتیجہ ہیں جو معاصر زمانے میں فارسی کے قادر الکلام تاریخ گو تھے۔ بہرکیف مسجد شریف پر ثبت کتبہ کے پورے الفاظ یہ ہیں:۔

"إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى

ہمیں مسجد کہ ذوالاکرام آمد

عبادت گاہِ خاص و عام آمد

زسعیِ مخلصانِ پُر ز اخلاص

بتوفیقِ خدا اتمام آمد

بدستِ شاہ میرکؔ سنگِ بنیاد

عیاں گردید و ذوالاکرام آمد

عشرۂ ہفتم بروزِ پنجشنبہ

بنایش شد خجستہ تام آمد

ز ہجرت سیزدہ صد ہفت و ہشتاد

بنائے سالِ این اتمام آمد

سنہ ۱۳۸۷ھ

بقولِ سعدیؔ انسان کی عظمت عبادت و ریاضت میں اس قدر زیادہ

نہیں ہے، جس قدر مہمان نوازی اور خدمت خلق میں ہے۔ اگر انسان بخیل اور کنجوس ہو ـــــ داد و دہش اور مہمان نوازی و خدمت خلق میں سُست ہو تو اُس کا زہد و تقویٰ اکارت چلا جاتا ہے۔ اس چیز کے پیش نظر

قارئین کرام اس بات سے بخوبی آشنا ہیں کہ کشمیر میں لنگر یا مفت قیام و طعام کی روایت انتہائی قدیم زمانہ سے رہی ہے۔ راجہ اور سلاطین نے اس رسم کو برقرار رکھا تھا۔ موجودہ زمانے میں جو کام ہوٹل یا سرائیں دیتی ہیں، یہ کام قدیم زمانے میں مسافروں اور بے ٹھکانہ لوگوں کے لئے لنگر انجام دیتے تھے۔ اس کا ثبوت اس وقت بھی کشمیر میں محلہ زوگی لنگر اور بلبل لنگر سے ملتا ہے جہاں کسی زمانے میں مسافروں اور غریب الوطن لوگوں کے لئے رہائش اور کھانا مفت مہیا کیا جاتا تھا۔ نویں اور دسویں صدی کے بزرگ بابا اسماعیل زاہد کبروی نے کوہ ماران کے دامن میں اس جگہ پر جہاں اس وقت سرینگر، کشمیر کی مرکزی جیل ہے، ایک لنگر قائم کیا تھا جس میں چار سو بے وسیلہ لوگ مفت کھانا کھاتے تھے، یہی کیفیت کشمیر میں اسلام کے پہلے مبلغ سید عبدالرحمٰن عرف بلبل شاہ کی تھی جنہوں نے محلہ بلبل لنگر میں ایک وسیع و عریض مسافر خانہ تعمیر کر کے بے وسیلہ اور بے ٹھکانہ اشخاص کو سہولیات بہم پہنچائی تھیں۔ کشمیر میں محترم میرک شاہ صاحب نے بھی اپنے مرشد جناب غلام قادر صاحب عرف لالہ شاہ زونیمری کی پیروی میں اس عمدہ اور قابل تحسین رسم کو برقرار رکھا تھا، اور یہی کیفیت اُن کے خلیفہ اور جانشین محترم دین محمد شاہ صاحب کی ہے۔ چنانچہ جب راقم بروز منگل، یکم ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۸۷ء کو مرحوم میرک شاہ کے تکیہ، واقع شالامار گیا تو پہنچتے ہی خدام تکیہ نے راقم کی خاطر مدارات قہوہ سے کی۔ اور جب کچھ دیر بعد خود محترم دین محمد شاہ صاحب سجادہ نشین سے ملاقی ہوا تو راقم سے

ان کی پہلی فرمائش یہ تھی کہ نیچے جائیے اور قہوہ پی لیجیے اور جب میں نے کہا کہ پی چکا ہوں، تو سامنے دھری ہوئی ٹوکری سے ایک لپ بھر شیرینی راقم کے سپرد کر دی اور ایک دانہ اپنے ہاتھ سے راقم کے منہ میں ڈال دیا۔ کشمیر کی تمام خانقاہوں میں یہ بات راقم کو صرف خانقاہ میرک شاہ صاحب کاشانی میں نظر آئی۔ باقی خانقاہوں کے خدام اور مجاور آپ سے کچھ لیں گے لیکن یہاں آپ کو کچھ دیا جاتا ہے اور یہی خانقاہ میرک اور دیگر خانقاہوں میں امتیاز ہے۔ یہ سیدھی سادی خانقاہ، جسے خانقاہ نہیں بلکہ تکیہ کا نام دیا جا سکتا ہے، راقم کو اُن دیدہ زیب خانقاہوں سے کہیں زیادہ بہتر اور اعلیٰ نظر آئی جن کے بلند بانگ دعاوی ہیں اور جنکی ایک قدیم تاریخ ہے۔ مجھے تکیۂ میرک شاہ میں خدمتِ خلق کا جذبہ پنہاں نظر آیا جو سعدی کے بقول ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

(معرفت خدمت خلق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تسبیح پھیرنے، مُصلّٰی پر بیٹھنے اور درویشانہ گدڑی پہن لینے کا نام نہیں ہے)۔

اصل تصوف ہے۔ جو بات بڑے بڑے فلسفی اور مصنف ضخیم جلدوں میں ادا کرتے ہیں، وہ سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ متوفی ذی قعدہ ۶۹۱ھ (اکتوبر ۱۲۹۲ء) صرف ایک فقرہ یعنی "خدمتِ خلق" میں ادا کر گئے ہیں۔

۲۔ سیادت — جیسا کہ اوراقِ گذشتہ میں مرقوم ہو چکا ہے راقم مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی سے زندگی میں دو بار ملاقی ہوا ہے اور وہ بھی سرسری اور غیر شعوری طور پر۔ اس لئے مرحوم کے متعلق راقم کی جو کچھ بھی معلومات ہیں، وہ شناساؤں اور واقف کاروں سے مستعار ہیں۔ اس چیز کے پیش نظر جہاں تک مرحوم کی ذات کا تعلق ہے تو وہ پیشہ کے اعتبار سے نقاش تھے۔ اس کا یہ

مطلب نہیں کہ سید نقاش نہیں ہو سکتا۔ آپ کی سیادت کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ آپ کے مرشد لالہ شاہ کاشانی سادات سے تھے اور مرشد کے ناتے آپ نے بھی خود کاشانی سید لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا ثبوت وہ گفتگو ہے جو راقم نے موجودہ سجادہ نشین جناب دین محمد شاہ صاحب سے کی مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کے والد محترم کے متعلق پوچھنے پر اُنہوں نے کہا کہ طریقت میں والد کا نہیں بلکہ مرشد کا رشتہ معتبر ہے۔ بہرکیف مناملہ جو کچھ بھی ہو محترم میرک شاہ صاحب کاشانی سید تھے۔ کاشان شہر کی تاریخ ایران میں کافی سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) کے نامور شاعر مجد الدین ہمگر نے اہلِ کاشان کے اس سوال:

اے آں زمین وقار کہ بر آسمان فضل	ماہِ خجستہ منظر و خورشید انوری
جمعے ز ناقدانِ سخن گفتۂ ظہیر	ترجیح می نہند بر اشعار انوری
جمعے دگر بر این سخن انکار می کنند	فی الجملہ در محل نزاعند و داوری
رجحان یکطرف تو بدیشان نما کہ ہست	زیر نگین طبع تو ملک سخنوری

(او زمین وقار مجد الدین ہمگر کہ آسمان فضل کا تو مبارک منظر چاند اور روشن سورج ہے۔ ہمارے زمانہ میں ناقدانِ سخن کی ایک ٹکڑی ظہیر کے کلام کو انوری کے اشعار پر فضیلت دیتی ہے جبکہ ایک دوسری جماعت کا انکار کرتے ہوئے فیصلہ کے طالب ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر تو اس معاملہ میں اپنا یکطرفہ فیصلہ صادر کرو کیوں کہ ملکِ شعر و سخن تیرے زیر تسلط و اختیار ہے)،

پر جو ظہیر فاریابی اور انوری خاوری دونوں میں سے ایک کی شاعرانہ برتری کے متعلق تھا، ہمگر نے نہ ان اشعار میں فیصلہ صادر کیا تھا اور ابتدا میں اہلِ کاشان کی بھرپور تعریف کی تھی۔ بہرکیف اشعار یہ ہیں:۔

جمع ز اہل خطۂ کاشان کہ بردہ اند — از ارباب فضل و دانش گوئے سخنوری

کردند بحث در سخن منشیان نظم — تا خود کہ سُفت بہ ز در دری دری

در انوری مناظرہ شان رفت و در ظہیر — تا مرکراست پایہ برتر ز شاعری

از آب فاریاب یکے عرضہ داد در — در خاک خاوران دگری از جعفری

ترجیح می نہاد یکے مہر بر قمر — تفضیل می نمود یکے حور بر پری

انصاف چون نیافت یکے از دگر گروہ — من بندہ را گزید نظر شان بہ داوری

در کان طبع آن چہ بگشتم گران گران — در قعر بحر این چہ نمودم شناوری

شعر یکے تہ آمد چون ذرّت اہوار — نظم دگر برآمد چون مہر خاوری

شعر ظہیر اگرچہ سرآمد ز جنس نظم — با طرز انوری نزند لاف ہمسری

بر اوج مشتری برسد تیر نظم او — خاصہ گہ ثناگری و مدح گستری

طبع رطب اگرچہ لذیذ است و خوش مذاق — کے بہ بود بجا صیت قند عسکری

بید ارچہ سبز و نغز و لطیف است و آبدار — چون در چمن بجلوہ کند بید عرعری

ہر چند لالہ صحن چمن را دہد فروغ — پہلو کجا زند بہ ہمی با گل طری

این است اعتقاد رہی خوش قبول کن — گر تو مقلد سخن مجد ہمگری

زاد این نتیجہ نیم شب از آخر رجب

در ثاء و عین و دال ز ہجر پیمبری (۶۷۴ ھ)

(اہل کاشان کی ایک جماعت جو علم و دانش میں گوئے سخنوری لے گئی ہے۔ شعرا کی نسبت ان کا باہمی اختلاف ہے یعنی اس بارے میں کہ ان میں سے کس نے دری فارسی زبان کا ایک لہجہ جو بالعموم افغانستان میں رائج ہے) کے موتی خوب پروئے ہیں۔ ان اہل دانش کا مباحثہ انوری اور ظہیر کی نسبت ہے اور وہ یہ کہ ان دونوں میں بلحاظ شاعری کس کا مرتبہ بلند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نے دریائے فاریاب سے موتی پیش کئے جبکہ دوسرے

نے خاکِ خاوراں سے زرِ جعفری (خالص سونا منسوب ہے جعفر برمکی وزیر سے جس کے حکم سے عاف سونے کا استعمال جاری ہوا تھا) پیدا کیا۔ ایک شخص آفتاب کو چاند پر ترجیح دیتا ہے، جبکہ دوسرا حور کو پری پر فضیلت رکھتا ہے۔ جب ایک جماعت دوسری جماعت سے انصاف نہ پا سکی، تو مجھ غلام کو فیصلہ کے لئے منتخب کیا۔ جب میں ان شعراء کی کانِ طبیعت کے گوشہ گوشہ میں پھرا اور ان کے سمندر کی تیراکی کی، تو ایک کا شعر دُرِ شاہوار اور دوسرے کی نظم مہرِ خاوری نظر آئی۔ بلاشبہ ظہیر کا کلام نظم کا سردار ہے۔ تاہم انوری سے لاف ہمسری نہیں کر سکتا۔ انوری کی نظم کا تیر اوجِ مشتری پر پہنچتا ہے، بالخصوص مدح وثنا کے موقعہ پر۔ یقیناً تازہ کھجور اگرچہ خوش مزہ اور لذیذ ہے تاہم قندِ عسکری (سفید کھانڈ) کی خاصیت کو نہیں پہنچ پاتی۔ سبز بید کا درخت اگرچہ عمدہ اور آبدار ہے۔ تاہم بید عرعری (چیڑ کا درخت) کے روبرو نہیں ٹھہر سکتا۔ بلاشبہ گُل لالہ صحنِ چمن کو رونق بخشتا ہے، لیکن اس بہی کو جس میں تازہ پھول ہوں پہنچ نہ پائے گا۔ یہ غلام مجد الدین ہمگر کا اعتقاد ہے۔ اگر تو اس کا معتقد ہے تو قبول کر۔ یہ اشعار ماہ رجب کی آخری تاریخ کو بوقت نیم شب ہجرت پیمبرؐ کے سال خ، غ اور د میں منظوم ہوئے ہیں (۳۰، رجب، سنیچر ۶۶۴ھ مطابق ۸، مئی ۱۲۶۶ء)۔

جاننا چاہیئے کہ مجد الدین ہمگر شیخ مصلح الدین سعدیؔ شیرازی کا معاصر تھا۔ ابتداء میں رہتیؔ، پھر مجدؔ اور اخیر پر ہمگرؔ تخلص اختیار کر لیا تھا۔ ہمگرؔ نوے برس کی عمر میں سال ۶۸۶ھ مطابق ۱۲۸۷ء میں فوت ہوگیا۔ ہمگرؔ کو شعراء کے مابین موازنہ اور مقابلہ کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ بموجب روایت اس نے حسب ذیل رباعی میں امامیؔ ہروی کو سعدیؔ شیرازی پر فضیلت دی تھی۔ ایسا اُس نے ایک سوال کے موقعہ پر کیا تھا۔ رباعی یہ ہے:

ما گرچہ بمنطق طوطی خوش نفسیم   چوں بر شکر گفتۂ سعدی مگسیم[3]

در شیوۂ اشعار بہ اجماع اُمم　　　ہر گز من و سعدی بہ امامی نرسیم

(اگرچہ ہم سب گویائی میں خوش نفس طوطا ہیں اور کلام سعدی کی مٹھاس کی مکھی ہیں۔ تاہم اس بات پر تمام اقوام کا اتفاق ہے کہ میں اور سعدی کبھی امامی ہروی کو نہیں پہنچ سکتے)۔

روایت کے مطابق شیخ سعدی کو اپنے امامی ہروی کے متعلق جب مجدالدین ہمگر کا شعر و سخن کے بارے میں یہ فیصلہ پہنچا تو ہمگر کے خلاف اپنی برہمی کا اظہار اس رباعی کے ذریعہ کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سعدی کے معاصر شعراء اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور شہرت پر جلنے اور خار کھاتے تھے۔ بہرکیف رباعی یہ ہے ؎

آنکس کہ بپایگاہ سامی نرسد　　　از بخت بد و سیاہ کامی نرسد

ہمگر چو بعمر خود نکرداست نماز　　　آری چہ عجب گر بہ امامی نرسد

(جو آدمی بلند مرتبہ کو نہیں پہنچ پاتا' وہ بدنصیبی اور گناہوں کی بدولت نہیں پہنچتا۔ ہمگر نے چونکہ تمام عمر نماز ادا نہیں کی ہے اس لئے مقام حیرانی نہیں ہے کہ امامی کے درجہ کو نہ پہنچ پائے)۔

مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی علمائے دین و تلامذہ شرع متین کی خاص عزت و توقیر فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ راقم جب ۱۹۴۶ء میں طلباء و اساتذہ اورینٹل کالج انجمن نصرۃ الاسلام سرینگر کے ہمراہ شالامار باغ کی سیر و تفریح کے موقعہ پر جناب میرک شاہ صاحب کی قیام گاہ پر گیا' تو مرحوم نے ہم نو واردوں کے پُرتپاک خیر مقدم کے بعد قہوہ اور چائے سے خاطر تواضع کی۔ بعد ازاں مرحوم مفتی محمد شاہ صاحب سعادت مورخ کشمیر اور مرحوم مولانا سید محمد یوسف شاہ صاحب و ترہ ہیلی صدر مدرس اورینٹل کالج کی استدعا پر بدرگاہ رب العزت

زائرین کے حق میں طالب خیر و برکت ہوئے ۔

مرحوم سید میرک شاہ صاحب کاشانی نے کوئی زیادہ عمر نہیں پائی ۔ ۱۳۳۵ھ (۱۷/۱۹۱۶ء) میں پیدا ہوئے اور ۲۴ ماہ شوال ۱۳۹۱ھ (پیر ۱۴، دسمبر ۱۹۷۱ء) کو بعمر چھپن ۵۶ برس فوت ہو گئے ۔ آپ کی ضریح مبارک پر یہ منظوم طویل کتبہ سنگ مرمر کی ایک طویل تختی پہ سرہانے سے قدرے دور بطرف شمال نصب ہے ۔ اس میں مرحوم کی مدت حیات و تاریخ وفات کے احوال کے ساتھ آپ کے ہونے والے جانشین اور خلیفہ کا بھی آپ کی وصیت کے مطابق تفصیلی ذکر ہے ۔ کتبہ کے اشعار پیر غلام احمد فاروقی عاصمی امام و خطیب درگاہ عالیہ آثار شریف حضرت بل سرینگر کے نتیجۂ فکر سے ہیں جو آپ نے بروز پیر ۱۳۹۱ھ کو مرحوم میرک شاہ صاحب کاشانی کی وفات حسرت آیات پر منظوم کئے تھے اور اس طرح دُرہائے معانی پرو دئے تھے ۔

سنگ مزار کی عبارت حسب ذیل ہے :۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء ولکن لا تشعرون ۔

تاریخ وفات حسرت آیات و مرثیہ فقیر سید میرک شاہ کاشانی غفر اللہ لہ واقعہ ۲۴ شوال المکرم ۱۳۹۱ھ دوشنبہ از نتیجۂ فکر ابو البشیر پیر غلام احمد فاروقی العاصمی عفی اللہ عنہ امام و خطیب درگاہ عالیہ آثار شریف حضرت بل سرینگر ۔

وا دریغا فقیر میرک شاہ ! | کرد رحلت ز ما بسوئے الٰہ
از جہاں رفت سوئے دار الخلد | نور اللہ قبرہ و ثراہ

منتقل شد ز عالم فانی — سوئے ملک بقا و فناه الله
مرزن او شده بسے مشکل — آفتابے غروب شد ناگاه
صوفی و هم فقیر و دانشمند — بیشکی بود عارف بالله
بحر عرفان، کان احسان بود — محو دیدار ثم وجه الله
قادری، کبروی مشرب داشت — آیه بود من صفات الله
فیض او بود جاری و ساری — مهر زمان بهر مومن و گمراه
داشت یکسان نظر بهر ملت — کهتر و مهتر و گدا و هم شاه
از غم هجر او کنان هیهات — هر زن و مرد شور گریه و آه
ماه شوال بست و چارم بود — داخل قبر شد عفاه الله
سال تاریخ انتقال ویش — عاصمی می نویس از درگاه
ایکه تاریخ از بجان بشمر — عطر الله قبره و ثراه

۵۶ ۱۳۳۵ —— ۹۱ ۱۳ھ

می سزد بهر روح آن مرحوم — خواندن فاتحه لوجه الله
طالبان فقیر گرچه بسے است — جانشینش شده محمد شاه
این وصیت نمود میر فقیر — بعد من باشد او خلیفه راه
زمرهٔ مخلصان شهر و دیهات — متفق گشتند بر وصیت شاه
شده تسلیم جانشینی او — رحمه الله ربه و کفاه
میکند پیروی مرشد خویش — جا عملش می شود بقا بالله
رسم و آئین فقر می داند — باز شد از پیروان اهل الله

حب اسلام باشدش در دل
باشد از خادمان خلق الله



سنه دین محمد شاه

موتی لال ساقی

رام چندر کاک

مغربی مفکرین کا کہنا ہے کہ مشرق کے لوگ مُردہ پرست ہیں مگر آر سی کاک کے بارے میں جو رویہ روا رکھا گیا اس رویئے سے مفکرین کے اس دعوے کی بھی نفی ہوتی ہے۔

کاک صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اردو، فارسی، سنسکرت اور انگریزی زبانوں پر دسترس کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے آرکیالوجسٹ، تاریخ شناس اور منتظم تھے مگر مہاراجہ کے دور میں وزیر اعظم مقرر ہونا ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوا۔ یہ اعلیٰ عہدہ قبول کرنے کے لئے انہیں آج تک بھی معاف نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ان کی تقرری کے وقت ہی شور و غوغا بلند ہوا تھا کہ اگر ایک کشمیری کو ہی وزیر اعظم مقرر کیا جاتا ہے تو ایک مخصوص فرقے سے تعلق رکھنے والے کو ہی کیوں وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔

رام چندر کاک کے ساتھ ہمارے یہاں جو سلوک ہوا وہ اپنی جگہ پر دلچسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی، اور اس قدیم کہاوت کا کھلا ثبوت بھی کہ

کشمیری دوسروں کے قدرشناس ہیں (کاشری چھ پرداہ کی)۔ جس دن کاک صاحب کا وزیر اعظم کے طور پر تقرر ہوا، اس دن بھی چراغاں کیا گیا اور جس دن انہیں برطرف کیا گیا اس دن بھی گھی کے چراغ جلائے گئے۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ رام چندر کاک نے یہاں کے عوام کے ساتھ زیادتیاں نہیں کیں مگر اس ضمن میں دوسرے لوگ بھی کشمیریوں کے لئے شہد کی ندیاں لے کر نہیں آئے تھے۔ اکیلے کاک کو اس سلسلے میں ملعون قرار دینا ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے۔ حالانکہ کاک کے زمانے میں ہماری ریاست کے اندر جو کچھ ہوا اس کے لئے کاک کی ذات سے زیادہ وہ حالات اور واقعات ذمہ دار ہیں جو اس زمانے میں رونما ہو رہے تھے۔ صرف کشمیر میں ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں۔ اس سلسلے میں غیر جانبدار مبصرین کی آراء کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لارڈ ویول کی رائے اس بارے میں کافی وزن رکھتی ہے۔ "وائسرائز جرنل"[۲] میں ویول نے کاک کے بارے میں لکھا ہے:-

"نیا وزیر اعظم، جس کی بیوی برطانوی ہے، کشمیری پنڈت ہے۔ کاک چالاک ہے اور سخن ساز بھی۔ مگر میرا خیال ہے کہ بحرانی دور میں اس کا تقرر سرے سے ہی فضول ہے۔"

اس صورت حال میں کاک کو حالات کا ذمہ دار ٹھہرانا درست نہیں۔ ملک بھر میں ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور ملک کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں پکڑ دھکڑ جاری نہیں تھی۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں ہماری تحریک آزادی نے زور پکڑا۔ حکمران وقت نے انتظامیہ کو سخت گیر پالیسی اختیار کرنے کو کہا مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تمام تر افراتفری کی ذمہ داری پنڈت کاک پر ڈال دی حالانکہ اس سلسلے میں زیادہ ذمہ داری مہاراجہ کی تھی مگر پنڈت جی نے شاید خاص سیاسی مصلحت کی بناء پر کاک کو ہدف بنایا، اس دہائی میں مہاراجہ کی حکومت کو کشمیر چھوڑ دو تحریک شروع کر کے چیلنج کیا گیا جس،

کے نتیجے میں مہاراجہ کا بوکھلا جانا قدرتی تھا اس لیئے تمام تر سخت گیری کا ذمہ براہ راست مہاراجہ کا تھا۔ مفتی محمد سعادت رام چندر کاک کے دورِ اقتدار کے چشم دید گواہ ہیں۔ چنانچہ ان کی مطبوعہ ڈائری میں مندرج کاک کے بارے میں تفصیلات اس طرح ہیں:۔

- یکم جولائی ۱۹۴۵ء : کل رام چندر کاک نے سر بی۔ این۔ راؤ سے وزیرِ اعظمی کا چارج لیا۔ رام چندر کاک پہلا کشمیری وزیرِ اعظم ہے۔
- ۲۴ر مئی ۱۹۴۷ء : آج رام چندر کاک وزیرِ اعظم نے جواہر لال کے بیان کے جواب میں کہا کہ ہم نے شیخ محمد عبداللہ کو اس وجہ سے گرفتار کیا جب وہ یہاں سے باہر جانے لگا اور جبکہ اس پر بغاوت کا مقدمہ قائم ہو چکا تھا۔
- ۳ر اگست ۱۹۴۷ء : آج رام چندر کاک وزیرِ اعظم نے گاندھی جی سے دوسری ملاقات کی۔
- ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء : آج جنک سنگھ نے رام چندر کاک سے وزیرِ اعظمی کا چارج لیا۔ شیخ پارٹی نے خوشی منائی۔ مرد اور عورتیں سیکریٹریٹ میں جمع ہو گئیں۔ جنک سنگھ کے آنے پر لوگوں نے جنک سنگھ زندہ باد، مہاراجہ بہادر کی جے اور شیر کشمیر زندہ آباد کے نعرے لگائے۔ کہتے ہیں کہ رام چندر کاک کو حدود میونسپلٹی سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔
- ۱۲ر اگست ۱۹۴۷ء : کل مہاراجہ جموں چلا گیا۔ وہاں سے دلی جائے گا، رام چندر کاک تا حکم ثانی نظر بند ہے۔ شیخ محمد عبداللہ کی رہائی کی افواہ ہے۔
- ۱۵ر اگست ۴۷ء : شادیانے نیشنل کانفرنس۔

جس مہاراجہ کے سنگھاسن کے تحفظ کے لئے کاک نے کشمیری عوام کی ناپسندیدگی اور نفرت کو گلے لگایا اُس مہاراجہ نے گاندھی جی اور انڈین نیشنل کانگریس کے زعماء

کے ایک اشارے پر سیاست کی قربان گاہ پر کاک کو بھینٹ چڑھایا اور اس کی نقل و حرکت تک کو بھی محدود کر دیا۔ مہاراجہ کے اس برتاؤ سے کاک کا دل ٹوٹ گیا مگر بعد میں جب انکی کلائی میں شہرۂ عام کے مطابق گھاس کی رسّی باندھ کر انہیں سرینگر کے بازاروں میں سے گزار کر پا پیادہ بادامی باغ لیجایا گیا اور جیل میں انہیں نفسیاتی اور جسمانی اذیتیں اٹھانا پڑیں، ان کی شخصیت چکنا چور ہو کر رہ گئی۔ ان کے ساتھ روا رکھی گئی زیادتیوں کے نتیجے میں کاک صاحب کلبیت پسند ہو گئے اور انہوں نے کم و بیش بیرونی دنیا سے اپنا ناطہ توڑ لیا۔

پنڈت نہرو نے بعد میں کاک کی قدر و قیمت جان لی تھی اور اپنی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کے لئے انہوں نے کاک صاحب کو قومی دھارے میں شامل ہونے کے لئے راجکماری امرت کور کے ذریعہ بلاوا بھی بھیجا مگر انانیت پسند کاک نے انکی دعوت کو حلیمی سے ٹھکرا دیا۔ بعد میں انہوں نے ایک ملاقات کے دوران بتایا تھا:۔

"ہمارے خاندان کی ریت رہی ہے کہ ایک ایسی چیز کے ساتھ چپک کر نہیں رہنا چاہیئے جس کو ایک بار تیاگ دیا گیا ہو۔ میں نے اسی روایت کا پالن کیا ہے۔ ساتھ ہی میں محسوس کرتا ہوں کہ بدلے ہوئے حالات میں میری کوئی خاص افادیت نہیں"۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ برطرفی کے بعد کاک صاحب نہ تو کبھی مہاراجہ ہری سنگھ سے ملے اور نہ ہی انہوں نے پنڈت نہرو کے در دولت پر حاضری دینا گوارا کیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے جو ناانصافی کاک کے ساتھ کی اس کا احساس ڈاکٹر کرن سنگھ کو بھی ہے۔ اپنی کتاب "Heir apparent" میں انہوں نے لکھا ہے:۔

"رام چندر کاک ایک ایسا شخص تھا جس میں قضیہ کا ایک قابل قبول حل نکالنے کی صلاحیتیں اور دانشمندی موجود تھی۔ اس کو میرے والد نے

بد ظرف اور ذلیل کیا"۔

کاک کی دانش ورانہ صلاحیتوں کا یہ اعتراف جہاں ایک طرف ڈاکٹر کرن سنگھ کی غیر جانبداری کا ثبوت ہے وہاں یہ بات بھی عیاں ہے کہ مہاراجہ کشمیر کے کاک کے تئیں برتاؤ کو قدر کی نگاہ سے نہ تو دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے سراہا جا سکتا ہے۔ کاک کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر کرن سنگھ نے اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے:

"پنڈت کاک کئی جہتوں سے ایک قابل قدر شخص تھا۔ وہ خود سر تھا اور اسے جن اصولوں پر یقین تھا اُن پر وہ سختی کے ساتھ عمل پیرا تھا۔ وہ مجھے کہا کرتا تھا کہ انسان کی عظیم خاصیت اس بات میں مضمر ہے کہ حالات چاہے کچھ بھی ہوں انسان سکون، خاموشی اور یقین کو بنائے رکھے۔ چنانچہ کچھ سال بعد کڑی آزمائش کے دوران وہ اس طریقۂ کار پر قائم رہا"۔

مہاراجہ کے کاک کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں یہاں ایک اور حوالے کا ذکر کرنا مناسب رہے گا۔

ستمبر سنہ ۱۹۸۲ء کے "کاشر خبر" انگریزی جریدے (جو کہ دہلی سے شائع ہوتا تھا) میں رام چندر کاک کے بارے میں میرا ایک تعارفی نوٹ چھپا تھا۔ اس نوٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء کے اسی جریدے کے شمارے میں پنڈت دیا کرشن کاچروؔ[1] نے اپنے تاثرات کا اظہار خط کی صورت میں اس طرح کیا۔

---

[1] پنڈت دیا کرشن کاچرو ریٹائرڈ آئی اے ایس آفیسر ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار پنڈت دامودر داس کاچرو رام چندر کاک کے ہم سبق تھے۔ کشمیری گرامر اور انگریزی میں کشمیری ادب کی تاریخ لکھنے والے امریکہ میں مقیم برج بہاری کاچرو دیا کرشن جی کے برادر ہیں۔

"رام چندر کاک کے بارے میں شری موتی لال ساقی کا تعارفی مضمون[1] بروقت ہے۔ ڈوگروں کے ایک سو سالہ دورِ اقتدار میں پنڈت رام چندر کاک واحد کشمیری نژاد اور کشمیری بولنے والا ریاست جموں و کشمیر کا وزیر اعظم تھا۔ وہ سادگی پسند تھا اور کسی اکڑفوں کے بغیر گزر بسر کرتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا دانش ور عالم اور منتظم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ انتہائی درجے کا باغیرت کشمیری تھا۔ اس نے کشمیر کی خدمت کرنے میں اس وقت کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جبکہ وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا مگر مہاراجہ ہری سنگھ نے اس کے ساتھ ناشائستہ برتاؤ کیا...... مشکلات کے دور میں ہر طرف سے پہلے اس کا غیر متزلزل یقین اسکی قابلیت کا مظہر ہے۔ رام چندر کاک کے برادرِ اکبر پنڈت امرناتھ کاک بھی ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے، جو کشمیر بار کے رکن ہونے کے علاوہ مخلص سماجی کارکن اور عالم تھے اور اپنے برادرِ اصغر کی طرح ایمانداری، قد و قامت اور سوچ و فکر میں اپنے ہم عصروں سے آگے تھے، ساتھ ہی بلند آدرشوں اور سادگی کے رسیلے تھے۔

اس سے پہلے بھی ریاست جموں و کشمیر کے دو[2] وزیر اعظم کشمیری تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق لاہور میں مکین ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے کشمیر کے ساتھ گہرے روابط تھے۔ اس شخص کا نام راجہ ہری کرشن کول تھا۔ کول انگریز دور کے بہت مشہور اور منفرد منتظم مانے جاتے تھے۔ وہ چوتھی دہائی کے اوائل میں کشمیر کے وزیر اعظم ہو کر آئے جبکہ ریاست میں زبردست اتھل پتھل تھی اور مہاراجہ کو معزول ہونے سے بچایا۔ مگر مہاراجہ نے اس کے

ساتھ بھی غیر منصفانہ طریقہ کار اپنایا۔ آخر کار وہ پٹیالہ کے وزیر اعظم
کی حیثیت سے سدھارے۔ پانچویں دہائی کے اوائل میں سر کیلاش ناتھ
ہاکسر، جو کہ گوالیار کے تھے، ریاست کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ وہ سالہا
سال تک مہاراجہ کے قریبی دوست اور مصلاح کار رہے تھے۔ پرائم
منسٹر کی کرسی ان کے لئے بھی پراگندہ کن ثابت ہوئی۔ وہ بھی وزیر اعظم
کے عہدے سے خوشی خوشی سبکدوش نہیں ہوئے۔ حسب معمول ہری سنگھ
اس دفعہ بھی چالبازی سے باز نہیں آیا"۔

کاک کی سیاسی شخصیت ۱۹۴۶ء سے ہی متنازعہ رہی ہے۔ اکثر سیاسی مبصرین نے
انہیں کشمیر کو ایک آزاد ریاست کا روپ دینے کا طرفدار بتایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انکی رائے
مبنی بر صداقت ہو مگر اس کے بعد بھی کئی سیاسی اکابرین نے اس قسم کی باتیں کیں، مگر
صرف کاک کو قابل گردن زدنی قرار دینا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ سچ ہے کہ رام چند کاک
زبردست انانیت پرست اور خودسر تھے۔ وہ ایک قابل قدر منتظم ضرور تھے مگر سیاسی شاطری
کے داؤ پیچ سے ناآشنا تھے۔ چنانچہ جس دن انہوں نے پنڈت نہرو کو کوہالہ میں گرفتار
کروا دیا اسی دن سے کاک کی معزولی کے سامان بہم ہونے لگے اور وہ سیاسی انتقام گیری
کا شکار ہو کر رہ گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ تو بہر حال ان کا مقدر تھا مگر بعد میں
جو الزام تراشیاں ان کے بارے میں کی گئیں ان سے وہ سخت دل برداشتہ ہو گئے۔

رام چندر کاک کے ساتھ میری ذاتی آشنائی نہیں تھی مگر حالات کا تجزیہ کر کے میں
اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہیں ناکردہ گناہوں کی سزا ملی ہے۔ کاک کا نام زبان پر آنے
سے مجھے میر بدماغ کی یاد آجاتی ہے۔ شکر ہے کہ اپنی بددماغی کو انہوں نے نیلام
چڑھانے سے ہمیشہ ہی گریز کیا۔ انہوں نے اپنی مجروح انا کو سینے سے لگائے رکھا۔ ان
شناساؤں کا کہنا ہے کہ وہ شروع سے ہی کم سخن تھے۔ مگر زندگی کے آخری ایام میں

انہوں نے کم و بیش موُن برت لے رکھا تھا۔ مگر اس بیچ جب بھی وہ بات کرتے تھے تو اُن کی بات میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور اعتبار ہوتا تھا۔

آر سی۔ کاک ۱۰ فروری ۱۹۸۳ء کو کچھ دیر بیمار رہنے کے بعد سورگباش ہو گئے۔ یہ خبر میں نے ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء کو انڈین ایکسپریس کی وساطت سے جموں سے سرینگر گاڑی میں سفر کرنے کے دوران میں پڑھی۔ سرینگر پہنچ کر میں نے مقامی اخبارات میں تفصیلات پڑھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ ایک آدھ اخبار کے سوا کسی اور اخبار نے اُن کی موت کی خبر تک بھی شایع نہیں کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ریڈیو کشمیر نے اُن کی موت کی خبر ایک جملے میں نشر کی تھی۔ میں ہکا بکا سا رہ گیا۔ انتقام تو زندوں سے لیا جاتا ہے مگر مرنے کے بعد بھی انتقام کی آگ کا سُلگتے رہنا کم ظرفی نہیں تو اور کیا ہے۔ اب رام چندر کاک کو سورگباش ہوئے کم و بیش سات سال ہونے کو آئے مگر کسی بھی تہذیبی یا تمدنی ادارے نے ان کا نام لینے تک گوارا نہیں کیا۔ ہمارے نشر و اشاعت کے ادارے آسٹریلیا سے آنے والے چوپانوں کے بارے میں خصوصی پروگراموں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ٹانگہ بانوں اور کچرا جمع کرنے والے کے بارے میں پروگرام ترتیب دئے جاتے ہیں۔ اخباروں اور رسالوں کے خصوصی نمبر شایع ہوتے ہیں مگر کسی بھی ادارے کو آج تک رام چندر کاک کے لئے پانچ منٹ کا نشریہ پیش کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ کسی رسالے یا اخبار کا ایک آدھ کالم کاک کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے وقف نہیں ہو سکا۔ اگر کاک صاحب صرف کشمیر کے وزیر اعظم رہے ہوتے تو انہیں نظر انداز کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ مگر اُن کی شخصیت کے کئی اور روشن پہلو بھی تھے۔ ایسے روشن پہلو جن کا ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہم آج بھی اُن کی تحقیقات کو بنیاد بنا کر ڈگریاں حاصل کرتے ہیں، مضامین تو لکھتے ہیں پر اکثر و بیشتر حوالہ دینے سے بھی کتراتے ہیں جو کہ اب کشمیری تحقیق کا مُقدر

بن گیا ہے۔

ایک ماہر آثارِ قدیمہ، تاریخ شناس اور عالم ہونے کے ناتے وہ ہم میں سے ایک تھے۔ وہ ایک ایسے ذی عزت ماہر تھے جنہوں نے پہلی بار ہمارے یہاں آثار کی زبانی ماضی کی داستان کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور کچھ ایسی حقیقتوں تک رسائی حاصل کی جو حقیقتیں ہمارے مورخوں کی پہنچ سے باہر تھیں۔ آر.سی. کاک کا یہ احسان چکانا ہمارے لئے ناممکن ہے کہ جو حقائق کلہن کی راج ترنگنی میں جگہ پانے سے رہ گئے تھے، اُن کو کاک نے سائنسی طریقہ کار اور آثارِ قدیمہ کی پرکھ کے سہارے نئے سرے سے زندہ کیا۔ ہم انہیں یاد کریں یا نہ کریں مگر جتنی دیر تک تاریخ کشمیر کا مطالعہ جاری رہے گا، اُس وقت تک علماء اور فضلاء کی نظریں رام چندر کاک کے کارناموں پر جمی رہیں گی۔ ایک بالغ نظر اور عالمی شہرت یافتہ آرکیالوجسٹ کے تئیں دانشور برادری کا یہ روّیہ ہماری غفلت شعاری کا نتیجہ ہے یا مصلحت پسندی کا۔ اس بارے میں آراء میں اختلاف کی گنجائش ہے مگر پلڑا بہر حال مصلحت پسندی کا ہی بھاری نظر آتا ہے۔ اس قسم کا طرزِ عمل دانشوری سے زیادہ اسٹیبلشمنٹ (Establishment) کی تابعداری کا ثمرہ لگتا ہے۔

'اپنی مرغی تو دال برابر ہوتی ہے' اس کہاوت کی سچائی میں تو ذرہ بھر شک کی گنجائش نہیں مگر دوسرے لوگوں نے آر.سی. کاک کے بارے میں کیا کہا اور کیا لکھا ہے، اُسے دُہرانے میں کوئی حرج نہیں۔ مشہور فرانسیسی مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ Foucher نے اُن کے بارے میں لکھا ہے :۔

"بالآخر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کو پڑھ کر جو چیز ہمیں حیران کرتی ہے وہ یوں ہے کہ اس کتاب کا مصنف ایک خالص کشمیری ہے۔ وہ لوگ جو اس امر سے باخبر ہیں یا جنہوں نے کشمیری پنڈتوں کے آخری سرپرست

سر مارک ارل سٹائن کی تحریریں پڑھ کر جانکاری پائی ہے "آگاہ ہیں کہ اس قبیل کے پرانے کشمیری پنڈتوں سے اس کتاب سے زیادہ اور کوئی چیز غیر متوقع نہیں ہو سکتی۔ علم سے آراستہ یہ لوگ بلاشبہ لاجواب ہیں اور قابل تحسین حد تک سنسکرت کتابوں کا گیان رکھتے ہیں مگر تواریخی شعور سے یہ لوگ عاری ہیں اور انکی دانش وری کی حدود اپنی وادی تک ہی محدود ہیں۔ یہ امر ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہی پیڑھی گزرنے کے بعد ان لوگوں کا ایک وارث ایک انگریزی کتاب کا خالق ہے۔ ایک ایسی کتاب کا جو مصنف کے ملک کے آثار قدیمہ کی غیر جانبدارانہ اور تنقیدی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ مگر معجزے کی گتھی بھی سلجھ جاتی ہے۔ مصنف کے ذاتی انکسار کو ایک طرف چھوڑ کر یہ اس فرقے کی ذہانت اور فطانت کا نتیجہ ہے جس میں اس جدید تعلیم کا بھی اپنا حصہ ہے جو سرینگر کے سرکاری کالجوں میں دی جاتی ہے۔" ۵

سنہ ۱۹۸۳ء کے دوران مجھے ڈوگرہ آرٹ گیلری جموں میں رکھے گئے نوادرات کا نظارہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں پر میں نے آرٹ گیلری کے کیوریٹر سے ہینڈ بک کے بارے میں دریافت کیا۔ کیوریٹر کافی ملنسار تھا۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا:

"ساقی صاحب، جموں میں ابھی تک آر۔سی۔ کاک جیسا شخص پیدا ہونا باقی ہے، جو گیلری کی ہینڈ بک لکھ سکے"

جواب سن کر مجھے بالکل حیرانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ایس۔پی۔ایس میوزیم کی سربراہی سے سبکدوش ہونے کے بعد اب تک میوزیم کی گائیڈ بک وہی کی وہی ہے جو کاک صاحب نے لکھی ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء سے آج تک اب ساٹھ سال ہونے کو آئے اور اس دوران ایس۔پی۔ایس میوزیم میں نوادرات کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے مگر گائیڈ بک وہی ہے جو اپنے ڈائرکٹر ہونے کے دوران کاک صاحب نے لکھی تھی۔ لگتا ہے اس گائیڈ بک

Preface to "Ancient Monuments of Kashmir" ۵

میں اضافہ کرنے کی کسی کو جرأت ہی نہیں ہوتی ۔ چنانچہ گاندھیک کا دوسرا ایڈیشن بھی چند
سال پہلے شائع کیا گیا مگر اس میں بھی سرمو اضافہ نظر نہیں آتا — "Ancient
Monuments of Kashmir" اب تک کشمیر کے آثار قدیمہ پر حوالے کی واحد
مستند کتاب ہے جس کا حوالہ بین الاقوامی سطح پر کتابوں میں ملتا ہے ۔ اس کتاب
نے آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کشمیر کو تحقیق اور تجسس کا مرکز بنایا
ہے ۔ جموں کے لوگ بھی کاک صاحب کے احسان مند ہیں ۔ اس کی کوششوں کے نتیجے
میں جموں کے بھولے بسرے ماضی کو نئی زندگی ملی ۔ انکی کتاب "Antiquaties
of Basohli and Ramnagar" اب تک جموں کے آثار قدیمہ کے بارے میں
حوالے کی دستاویز ہے جس میں ابھی تک کوئی اضافہ نہیں ہو سکا ہے ۔

آثار قدیمہ کے میدان میں جو کام پنڈت کاک نے کیا ہے اور جو تحقیق کتابی
صورت میں منظر عام پر آگئی ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے:۔

(الف) Ancient Monuments of Kashmir

(ب) Antiquities of Bhimber and Rajouri

(ج) Antiquities of Basohli and Ramnagar

(د) Antiquities of Marev Wardwan

(ہ) A Guide book to the S.P.S. Museum

باقاعدہ مطبوعات کے علاوہ کشمیر کے ماضی کے بارے میں تاریخی مضامین کا ایک سلسلہ
انہوں نے Indian Historical quarterly میں بھی لکھا تھا
جو کتابی صورت میں الگ سے شائع نہیں ہوا مگر مضامین کے اس سلسلے کا اختصار
Ancient Monuments نام کی کتاب میں دیباچے کے طور پر شامل کیا گیا
ہے Ancient Monuments کئی اعتبار سے ایک منفرد کتاب ہے ۔ سنہ ۱۹۳۳ء

میں لکھی گئی یہ کتاب کشمیر کے آثارِ قدیمہ اور فنِ تعمیر کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس کتاب میں کشمیر میں موجود کشان آثار کا تفصیلی تجزیہ پہلی بار کیا گیا ہے۔ یہ وہی آثار ہیں جن کو کاک صاحب نے ۱۹۲۵ء میں دریافت کیا۔ یہ آثار کشمیر کی تاریخ کے اس دور کی ترجمانی کرتے ہیں جس کے بارے میں ہماری تاریخی کتابوں میں تفصیلات کا فقدان ہے۔ اس دور کے بارے میں جو کچھ کلہن نے لکھا ہے وہ سرسری اور سرے سے ہی نامکتفی ہے۔ ہاروَن آثار کی دریافت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ کشمیر کشان سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ کھروشتی گنتی کی دریافت نے ایک اور گتھی کو سلجھا دیا اور ثابت کیا کہ کسی زمانے میں کھروشتی کا ہمارے یہاں بھی بول بالا تھا۔ یہ سبھی باتیں ایسی ہیں جن کا ذکر نہیں ہوا ہے اور بہرصورت اپنی جگہ یہ اہم ہیں۔ چنانچہ آثارِ قدیمہ کی بنیاد پر جو نتائج انہوں نے اخذ کئے ہیں آج تک بھی رد کرنا تو دور کی رہی اُن پر انگلی اٹھانے کی کسی کو جسارت نہیں ہوئی۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں غلطی ہونے کا امکان باقی رہتا ہے، اور کاک صاحب سے بھی چند ایک غلطیاں ہوئی ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے خزاں میں کاک کو اطلاع ملی کہ ٹنڈ یو واڑون کی چھوٹی سی وادی میں کچھ قدیم آثار بکھرے پڑے ہیں۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جو عام طور پر علماء اور محققین کے دائرہ کار سے باہر تھا۔ ۱۹۲۱ء کے گرما میں وہ اس علاقے کا دورہ کرنے کے لئے گئے۔

اپنے دورے کے دوران وہ "بتھ زہل" پہنچے جہاں انہوں نے ایک گپھا کی چھت پر مصوری کی صورت براہمی خط میں کچھ لکھا ہوا پایا۔ یہ دریافت اپنی جگہ پر کافی اہم تھی۔ اس دریافت سے ثابت ہوا کہ کشمیر کا تعلق باقی ملک کے ساتھ قدیم زمانے سے ہی کافی قریبی رہا ہے۔ اسی دورے کے دوران کاک نے اننت دیو کے زمانے کا ایک کتبہ بھی دریافت کیا۔ یہ کتبہ بلاشبہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ سب سے پہلے کتبہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ٹنڈ یو واڑون کی وادی گیارھویں اور بارھویں

صدی تک کے دوران کشمیر کا ایک حصہ تھی ۔ کتبہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کشتواڑ سے لے کر بلاور تک کا پہاڑی علاقہ مہاراجہ اننت دیو کے ماتحت تھا جس کا ذکر راج ترنگنی میں بھی آیا ہے ۔

کتبہ ایک اور گتھی کو بھی سلجھا دیتا ہے ۔ وہ یوں کہ گیارھویں اور بارھویں صدی میں بھی کشمیر اور اس کے آس پاس کے علاقے میں مستقل پُل موجود تھے ۔ حالانکہ اب تک مورخین یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ کشمیر میں مستقل پل بنانے کے بانی کار شاہمیری سلاطین ہیں ۔ کتبے کی عبارت اس سلسلے میں بالکل واضح ہے :-

" شری چیری گے مہاگپت نے یہاں پر سموت ۱۲، مہاراجہ اننت دیو کے دور حکومت میں ایک پُل بنایا ۔"

یہ پُل کشتیوں کا پل نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ مڈ یوس ندی ایک طوفانی نالہ ہے اور کشتیاں اس میں ٹھہر نہیں سکتیں ۔ کشمیر کے آس پاس مستقل پُلوں کا ثبوت ہمیں ریچن زنگپو کے سفرنامے سے بھی ملتا ہے جو گیارھویں صدی میں تیرہ سال تک کشمیر میں مقیم رہا ۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ اسی راستے سے کشمیر آیا تھا ۔ دورے کے دوران کاک نے کیکوٹ مندر کی نشاندہی بھی کی اور کشمیر کے فن تعمیر کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ۔ دلیو دار کا بنا ہوا یہ مندر ریاست بھر میں اپنی نوعیت کا واحد مندر ہے جو اپنی اصلی حالت میں موجود ہے ۔ مندر اسی طرز تعمیر کا نمونہ ہے جو طرز تعمیر ہمارے یہاں رشی زیارتوں اور خانقاہوں کا ہے ۔ یہ طرز کبھی مشرقی جاتا طرز ، کبھی پر ہاس پور طرز ، کبھی پگوڑا اور کبھی رشی طرز کہلایا ہے ۔ مندر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ کشمیر کے قدیم مندروں کی چھت پگوڑا طرز کی ہوتی تھی ، چاہے وہ لکڑی کے بنے تھے یا پتھر کے ۔ ابتدائی دور میں اکثر مندر لکڑی کے بنے ہوئے ہونا قرین قیاس ہے کیوں کہ یہاں ہر جگہ لکڑی کی افراط تھی ۔ کاک صاحب اگر آثار قدیمہ کے ساتھ کچھ دیر اور وابستہ رہتے تو

بہت کچھ کر جاتے مگر وقت کی پکار نے انہیں دوسری ڈگر اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

رام چندر کاک کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اس قبیلے کے بارے میں بات کرنا مناسب رہے گا جس قبیلے کے ساتھ اُن کا تعلق ہے۔ 'کاک' کشمیر میں ہندوؤں کی ذات بھی ہے اور مسلمانوں کی بھی۔ لفظ 'کاک' قدیم زمانے میں ایک رشی کا نام بھی رہا ہے اور اپنی زبان میں ہم چاچا یا بزرگ کو 'کاک' کہتے ہیں چنانچہ اس لفظ کی نسبت سے کشمیری میں کئی ایک محاورے اور مرکبات مروج ہیں مثلاً "کاکُن ہاوِیت" (کچھ ایسا جو چھڑائے نہ چھڑے) 'کاکنہ ہانکل یا کاکہ ہانکل (لمبا رشتہ)' کاکہ لگنہ میانہ بلایہ (کاکا میرے بدلے بھینٹ چڑھ جا) وغیرہ وغیرہ۔

گیارھویں اور بارھویں صدی میں کاک قبیلے کے لوگوں نے کشمیر کی تاریخ میں خاصا نام کمایا تھا۔ جس وقت راجہ ہرش پر اُچل نے بارہمولا سے دھاوا بول دینے کی ٹھان لی اس وقت کاک قبیلے کے لوگ دوسرے لوگوں کے ساتھ اس کے راستے میں دیوار بن کے کھڑے ہو گئے۔ بارھویں صدی میں اس خاندان کا تلک نامی شخص کشمیر کا سپاہ سالار تھا۔ چنانچہ "کاک پور" نام کا ایک چھوٹا قصبہ بھی پلوامہ ضلع میں موجود ہے۔ لگتا ہے کہ اس قبیلے کا نام بھی اسی خاندان کی نسبت سے کاک پور یعنی وہ جگہ جہاں کاک خاندان کے لوگ آباد ہیں جو کہ نویں صدی کے بعد کی اختراع ہے کیوں کہ اس زمانے میں اس جگہ کا نام اُتپل پور تھا۔

کاک صاحب کے والد بزرگوار کا نام پنڈت کیشو ناتھ تھا۔ پنڈت آر سی کاک کا جنم ۱۸۹۳ء میں سری نگر میں ہوا۔ اعزاز کے ساتھ ڈگری کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ نے ایک مقامی کالج میں جو کہ اُن ہی دنوں قائم ہوا تھا، سنسکرت میں ایم۔اے کرنے کے لئے داخلہ لیا۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ علم کی پیاس بجھانے کے لئے آپ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کالج میں لائبریرین کا کام بھی وقتی طور کیا کرتے تھے

ابھی کاک نے اپنے نصاب کا احاطہ نہیں کیا تھا کہ وہ سنسکرت کے ایک پروفیسر کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ یہ پروفیسر توسیعی خطبات دینے کے لئے کشمیر آئے تھے۔ چنانچہ پروفیسر کی ایما پر کاک صاحب نے آرکیالاجکل سروے آف انڈیا میں تربیت کیلئے درخواست کی جو منظور ہوئی۔ تربیت کے لئے جانے سے پہلے کاک صاحب ایس۔ پی۔ کالج سرینگر میں کچھ دیر کے لئے لائبریرین بھی رہے۔ آرکیالاجکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل سرجان مارشل کی سرکردگی میں آپ نے پانچ سال تک سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک تربیت حاصل کی۔ سرجان مارشل کاک کے گہرے مشاہدے اور ذہن رسا سے کافی متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے کاک کو اپنے محکمے میں ایک ذمہ دار عہدے کی پیشکش کی مگر اس وقت کے حکمران مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ریاست سے باہر اس کی تقرری کی اجازت نہیں دی۔ ریاست میں سپرنٹنڈنٹ آف آرکیالوجی اور ریسرچ کے عہدے پر اُن کا تقرر سنہ ۱۹۱۹ء میں کیا گیا۔ بعد میں آپ اسی محکمے کے ڈائرکٹر بھی بنے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے پنڈت کاک کو سرکار کا سیاسی سیکرٹری مقرر کیا۔ ڈائرکٹر آرکیالوجی سے سیاسی سیکرٹری بننا ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتا مگر یہاں پر بھی انہوں نے اپنے جوہر دکھلائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۱ء میں آپ نے لندن کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ریاست جموں وکشمیر کے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں پنڈت کاک کو اکسائز اور کسٹمز محکمے کا انسپکٹر جنرل بنایا گیا اور سنہ ۱۹۳۷ء میں سرگوپال سوامی آینگر کی وزارت عظمیٰ کے دوران آپ ریاست کے چیف سیکرٹری مقرر ہوئے۔ چیف سیکرٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض بدرجہ احسن انجام دینے کے لئے مہاراجہ اُن پر مہربان ہوا کیونکہ اس عہدے پر رہ کر انہوں نے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا تھا۔ فرائض کی انجام دہی نے کاک کے لئے ترقی کے راستے وا کر دیئے اور مہاراجہ نے انہیں منسٹر اِن ویٹنگ مقرر کیا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں آپ کو فوجی امورات کا وزیر

مقرر کیا گیا۔ چار سال بعد ۱۹۴۵ء میں آپ ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ سرکاری خدمات کے عوض آپ کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔

پنڈت رام چندر کاک ربط و ضبط کے سخت پابند تھے۔ وہ خود بھی ایک بار لبط زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ شاید اسی چیز نے ان کو کسی حد تک سخت گیر بنایا تھا۔ کاک صاحب کے معاصرین میں پنڈت آفتاب کول نظامت، پروفیسر لوشخانی، پروفیسر جے لال کول، پنڈت سمسار چند وشنوی، شری پریم ناتھ بزاز وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے اکثر لوگوں نے اپنے اپنے شعبوں میں نمایندہ کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ماسٹر زندہ کول سے رام چندر کاک پڑھے تھے، چنانچہ اس کا ذکر کرتے ہوئے سدھارتھ کاک نے لکھا ہے:

"صدی کے اختتام پر بھائی جی نے ہندو ہائی سکول کی پرائمری جماعت میں داخلہ لیا۔ بعد میں جب بھائی جی محکمہ آثار قدیمہ کے انچارج بنے تو انہوں نے ماسٹر جی کو اسسٹنٹ کے طور پر محکمہ میں آنے کی دعوت دی، جہاں وہ ۱۹۳۷ء تک رہے۔ جب بھائی جی ریاست کے چیف سیکرٹری مقرر ہوئے انہوں نے ماسٹر جی کا شعبہ نشر و اشاعت میں تبادلہ کروایا جہاں وہ سالہا سال رہے۔"

یوں تو کاک صاحب کی سخت گیری سے اکثر لوگ نالاں تھے مگر شاعری کی دنیا ان کے لئے بھی ایک نعمت سے کم نہیں تھی۔ فرصت اور فراغت کے لمحات وہ حافظ کی شاعری کا مطالعہ کرنے میں صرف کرتے تھے اور کبھی کبھی پرمانند کی مشہور نظم کو گنگناتے تھے۔

کرمہ بھومکا پہ دِزٕ دھرمک بل۔ سنتوشہ تیالہ بنہٕ آنند پھل

(عمل کی دھرتی کو سچائی کی طاقت دے۔ کفایت شعاری کا ثمر ابدی مسرت ہے)

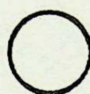
سے رام چندر کاک۔

کاک صاحب کی سیاست سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کی ہمہ جہت شخصیت کے دوسرے پہلو اتنے دلکش اور دلنواز ہیں کہ انکی ذہانت اور اُن کے وسیع مطالعے کا اعتراف کئے بنا رہا نہیں جا سکتا۔ رام چندر کاک فرشتہ نہیں تھے بلکہ مجھ اور آپ جیسے انسان۔ زندگی کی مختلف منزلوں کو جس تیزی کے ساتھ انہوں نے طے کیا ایسا بہت ہی کم لوگ کر سکتے ہیں۔ مہاراجہ کشمیر کو کاک نے کس طرح متاثر کیا، اسکے بارے میں ایک بزرگ نے مجھے بتایا کہ ایک بار مہاراجہ کشمیر کے اپنے نام کے ساتھ مہاراجہ جموں و کشمیر و تبت ہا لکھنے پر چین کی حکومت نے برٹش انڈیا کی حکومت سے سخت احتجاج کیا۔ برٹش سرکار نے مہاراجہ کشمیر کو آڑے ہاتھوں لیا اور فوری طور پر جواب دینے کو کہا۔ مہاراجہ جواب لکھنے کے لئے کافی پریشان ہو گیا۔ اکثر افسروں نے چھٹی کا جواب لکھنے سے معذوری ظاہر کی۔ رام چندر کاک نے چھٹی کا جواب لکھنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں جو مہاراجہ کو قبول کرنا پڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ کاک نے چھٹی کا جواب اس طرح دلائل دے کر لکھا کہ جب مہاراجہ نے یہ جواب اپنے قانونی مشیر سر تیج بہادر سپرو کو دکھایا، اس نے مہاراجہ کو بتا دیا کہ جواب اس قدر مفصل اور وزن دار ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی ادھر اُدھر کرنے کی گنجائش نہیں۔ چنانچہ یہی جواب برٹش سرکار کو بھیجا گیا اور اس کو حرف بحرف تسلیم کیا گیا۔ یہی جواب آر سی کاک کی ترقی کا اہم زینہ ثابت ہوا۔

کاک صاحب نے زندگی کے کافی نشیب و فراز دیکھے تھے۔ مگر وہ ہر موڑ پر اپنے اصولوں پر قائم رہے۔ یہی کیا کم ہے کہ آزادی کے ۲۵ سال جی لینے کے دوران انہوں نے اپنا سر خم نہیں کیا اور وہ مجاز لکھنوی کا یہ شعر گنگناتے 'لوگ کے پرندے پہ سوار ہو کر پرلوک سدھارے۔

بہ ایں سیلِ غم سیلِ حوادث مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

سرکاری ذمہ داریوں سے سبکدوش کئے جانیکے بعد کاک صاحب کچھ وقت کیلئے
بمبئی میں مقیم رہے۔ اس کے بعد اُن کا کشمیر آنا جانا برابر جاری رہتا تھا کشمیر میں وہ
گرما کے دوران اپنے باغ میں سکونت پذیر رہتے تھے۔ یہ باغ ہارون سے آگے داراہیں ہے۔
کاک صاحب ایک کرم یوگی تھے اور یوگ کی سادھنا اُن کے خمیر میں تھی۔ اُن کا دیہانت
اسی کشمیر میں ہوا جسے وہ دل اور جان سے پیار کرتے تھے۔



بعد نوشت

سنہ ۱۹۸۶ء میں لندن سے میجر جنرل شاہد رشید کی ایک کتاب
Disastrous Tweling چھپی ہے۔ کتاب میں اور باتوں کے علاوہ شاہد
رشید نے رام چندر کاک کے بارے میں بھی لکھا ہے:

"کشمیری برہمن رام چندر کاک نے سر گوپال سوامی آئینگر (آئی سی ایس) سے
وزارت عظمیٰ کا چارج لیا۔ اس نے ریاست میں اصلاحات نافذ کرنا چاہے
مگر ہری سنگھ نے اسکی مخالفت کی۔ اس کے بعد اُن کے تعلقات میں
دراڑ پڑ گئی جو بھری نہیں جا سکی۔ کسی بھی موقع پر اس کے مشوروں پر
عمل نہیں کیا گیا۔ کاک جو اکثر "اک"[1] کے ہاں دہلی آیا جایا کرتا تھا،
ایک مضبوط کردار کا مالک تھا۔ مغربی مطمع نظر کا مالک ایک دُنیا شناس
آدمی تھا۔ اُس نے ایک انگریز خاتون سے شادی کی تھی۔ نہرو اسے
زیادہ ہوشیار سمجھنے کی وجہ سے نفرت کرتا تھا۔" (صفحہ ۲۷۳)



[1] "اک" — Field Marshal Auchinleck

ایشور کول

ایشور کول کا نام کشمیر میں بڑے ہی احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ کا شمار اُن مصنفین میں کیا جاتا ہے جنہیں سنسکرت زبان کے علاوہ دیگر زبانوں پر بھی عبور تھا۔ آپ کا سن ولادت ۱۸۳۳ء ہے اور آپکی جائے پیدائش "بوہ ہ گیر" حالی کدل سرینگر ہے۔ آپ کے والد گرامی کا نام گنیش کول تھا جو اپنے وقت کے بڑے عالم مانے جاتے تھے۔ ان کے تین بیٹے تھے لیکن تینوں میں سے ایشور کول بہت ہی ذہین اور زیرک تھے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔ بچپن سے لگتا تھا کہ ننھا سا بالک (ایشور کول) کسی دن ضرور کوئی بڑا کارنامہ انجام دے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ ایشور کول نے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔

وہ اس وقت دس برس کے تھے جب ان کے شفیق والد کا سایہ اُن کے سر سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا۔ ماں کی ممتا سے تو وہ پہلے ہی محروم ہو چکے تھے۔ اُس وقت انکی عمر صرف تین سال تھی۔ اس لئے آپ کے پالن پوسن کی تمام تر ذمہ داری آپ کے بڑے بھائی کے سر تھی۔ یتیم ہونے کے سبب بھابی انہیں ماں جیسا پیار دیتی

رہی۔ ذہین تو تھے ہی اس لئے پڑھائی میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی اور پڑھائی
کا کام تسلی بخش طریقے پر انجام پاتا رہا۔ اس وقت آج کی طرح تعلیم حاصل کرنے
کی سہولتیں نہ تھیں۔ باضابطہ درس گاہیں (سکول وغیرہ) نہ تھے، علم حاصل کرنے کے
لئے پنڈتوں یا مولوی صاحبان کے گھر جانا پڑتا تھا۔ آج کی طرح کتابیں چھپتی
نہیں تھیں بلکہ ایک مسودے سے دوسرا نقل کرنا پڑتا تھا۔ اور علم حاصل کرنے کے
لئے دور دور جانا پڑتا تھا۔ اس دوران انہیں بڑی مشکل پیش آئی۔ وہ یہ کہ ان کے
بڑے بھائی نے اپنی پہلی بیوی کے جیتے جی دوسری شادی کر لی۔ ایشور کول اس
شادی کے خلاف تھے اور انہوں نے برملا اس کا اظہار بھی کیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ انہیں
بھائی سے الگ ہو جانا پڑا اور اس طرح انہوں نے گھر چھوڑ دیا۔ بے شمار مصائب کا
سامنا کرتے رہے لیکن کسی بھی صورت میں تعلیم ادھوری نہ چھوڑی۔ مگر اس حادثے
کے بعد بدقسمتی سے وہ اپنی خواہش کے مطابق اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے کیونکہ بڑے
بھائی نے حسد کی آگ میں جلتے ہوئے مقامی پنڈتوں کو (جن کے پاس ایشور کول پڑھنے
جاتے تھے) انہیں پڑھانے سے منع کر دیا اور اس طرح وہ کسی بھی مقامی پنڈت سے
مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ انہیں ہر طرف نراشا ہی نراشا دکھنے لگی اور انہیں لگا کہ
شاید علم کے دروازے اُن پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔ وہ من ہی من اس
دُکھ کو سہتے رہے لیکن زبان پر حرف شکایت نہ لائے۔ انہوں نے ہمت نہیں
ہاری اور جیسے تیسے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے انہوں نے
مُنشی تلک چندر منشی نامی ایک پنڈت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تلک چندر نے جب
اس نوجوان میں علم کی پیاس دیکھی تو اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ تلک چندر نے
اپنے کُل گرو کیسل بھٹ بکش کو ایشور کول کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے راضی
کر لیا اور وہ ان سے سال بھر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہ سلسلہ آگے بھی چلتا لیکن خدا

کو منظور نہ تھا۔ کیوں کہ سال بھر پڑھانے کے بعد گروجی کا دیہانت ہوگیا۔ ایشور کول
شش و پنج میں پڑ گئے کہ اب کیا کیا جائے۔ آخر انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ علم کی پیاس
جموں جاکر بجھائیں گے۔ وہ جموں چلے گئے۔ آپ کا بڑا بھائی چونکہ آپ سے جلتا تھا
اس لئے اس نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی کہ اس کا چھوٹا بھائی (ایشور کول) گھر
سے بھاگ گیا ہے۔ پولیس نے ضابطے کی کاروائی عمل میں لائی اور آپ کو راجوری میں
ہی آگے جانے سے روک لیا اور گرفتار کر کے سری نگر لایا گیا۔ کچھ عرصہ بے چینی میں گزارا
اور من دوبارہ جموں جانے کو کر رہا تھا۔ ایک دن پھر جموں کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں
بھی اپنا کوئی تو تھا نہیں اس لئے رہائش ان کے لئے ایک مسئلہ بن گیا۔ چنانچہ وہاں
آپ ایک بارسوخ آدمی کے پاس چلے گئے۔ قسمت جب یاور ہوتی ہے تو مشکلیں خود بخود
آسان ہو جاتی ہیں۔ اشاروں کنایوں میں انہیں پتہ چل گیا تھا کہ اس شخص کے ہاں
مدتوں بعد بیٹا پیدا ہوا ہے اور اسی لئے وہ اتنا خوش ہے۔ اس نے اُن سے ایک
سوال کیا۔ ایشور کول نے کاغذ کے ایک پرزے پر جواب لکھ کر دے دیا۔ "آپ کے
ہاں بیٹا ہوا ہے جو آپ کے لئے خوش بخت ثابت ہوگا"۔ یہ شخص اُن کے علم نجوم سے
متاثر ہوا اور انہیں مہاراجہ کے پاس لے گیا۔

ایشور کول کو سرکاری سرپرستی یا اپنی مشہوری کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو صرف
تحصیل علم کے لئے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور کشمیر کی حسین و دلفریب وادیوں کو اسی لئے
چھوڑ کر جموں کے گرم میدانی علاقے میں آئے تھے۔ اس لئے انہوں نے مہاراجہ سے
دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اُن کے لئے ایک اُستاد مخصوص کرنے
کا حکم دیا۔ نیرسن کے نامور ودوان رائے دیو کرشن جیوتشی۔ جو اپنا زیادہ وقت
پوجا پاٹھ اور اپنا کھانا خود بنانے میں صرف کیا کرتے تھے۔ بہرحال انہوں نے ایشور
کول کے لئے وقت نکالا اور اس طرح آپ کی مزید تعلیم کا بندوبست ہوگیا۔ آپ نے

دن رات محنت کی اور جوتش وِدیا کے ساتھ سنسکرت زبان کا پورا گیان حاصل کیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ اگرچہ خود زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن وہ علماء اور ودوانوں کے قدردان تھے اور اُن کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی و عزت افزائی کرتے۔ اُن کے زمانے میں ادبی محفلوں کا انعقاد بھی ہوتا تھا جن میں عالم فاضل لوگ شریک ہوتے اور اپنی قابلیت کے جوہر دکھانے پر مہاراجہ سے انعام پاتے۔ ایسی ہی ایک محفل میں ایشور کول کو بھی انعام سے نوازا گیا اور آپ کا شمار صفِ اول کے سنسکرت ودوانوں میں ہونے لگا۔ مہاراجہ نے انہیں دَرباری جیوتشی بنا دیا۔

جب مہاراجہ کی خواہش کے مطابق جموں میں ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا تو ایشور کول کو اس شعبے کا انچارج بنایا گیا۔ ان کی سربراہی میں بہت سی کتابوں کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا گیا جو آج بھی دستیاب ہیں۔ اس دوران انہیں مزید مطالعہ کا موقعہ ملا جس سے ان کے حافظے میں مختلف موضوعات جگہ پاتے رہے۔

جب مہاراجہ پرتاب سنگھ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو انہوں نے اس شعبے کو بند کر دیا۔ دوسرے علماء کی طرح ایشور کول کو بھی بے کاری کے دن دیکھنے کو ملے۔ بعد ازاں آپ کو مہاراجہ کے دربار میں ملازمت مل گئی۔ علم نجوم کے ساتھ ساتھ آپ علمِ ریاضی میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ایک واقعہ کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ ایک روز لاہور سے ان کا ایک رشتہ دار ایشور پرساد (ایم۔اے) کشمیر آیا اور کچھ روز ان کے ہاں قیام پذیر رہا۔ ایک دن دونوں بیٹھے تھے کہ ایشور کول نے مہمان کو حساب کا ایک سوال حل کرنے کو دیا۔ وہ گھنٹوں سر کھپا مارا لیکن اسے حل نہ کر سکا۔ آخر اس نے میزبان سے اسے حل کرنے کو کہا تو اس نے چند منٹ میں

اسے حل کر کے اپنے مہمان کو دکھایا۔ ایشور پرساد چونکہ علم ریاضی میں خود بھی ماہر تھا اس لئے ایشور کول کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے انہیں لاہور آنے کی اور وہاں اس مضمون میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی دعوت دی لیکن نامساعد حالات کی بنا پر وہ ایسا نہ کر سکے۔

ایشور کول کو لکھنے پڑھنے سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ اُن کا قابل ذکر کارنامہ "کشمیری شبدامرتم" نامی تصنیف ہے۔ کشمیری چونکہ آپ کی مادری زبان تھی اس لئے انہوں نے اس کا گرامر 1932ء میں سنسکرت زبان میں لکھا۔ اس کا ذکر آپ نے اپنے چند سنسکرت شلوکوں میں بھی کیا ہے۔ اپنی یہ کاوش آپ نے اُس وقت کے مہان سنسکرت ودوان نیلامبر مکرجی کو بھینٹ کی۔ کچھ مدت کے بعد جب بالو نیلامبر مکرجی اپنا عہدہ چھوڑ کر واپس کلکتہ چلے گئے تو انہوں نے اسے وہاں ایشیاٹک سوسائٹی (بنگال) کو چھاپنے کے لئے دیا جو ۱۸۹۸ء میں سر جارج گریرسن نے مرتب کر کے شایع کی۔

انہوں نے "کشمیری سنسکرت کوش" (کشمیری سنسکرت ڈکشنری) بھی مرتب کی جو نامکمل ہونے کی وجہ سے چھپ نہ سکی۔ اس ڈکشنری میں کشمیری الفاظ کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے مترادف الفاظ بھی دئے گئے ہیں۔ الفاظ کی تشریح سنسکرت میں کی گئی ہے۔ یہ کوش دیوناگری رسم الخط میں ہے۔ ایک مثال:

(۱)
پ
آشب ڈامب

(۲)
سنسکرت
اپیکشیہ سیوبنم

(۳)
کشمیری۔ بدپرہیزی

۴

"وُگنا وستعایام یدپیکشیہ سیوبنم ہین پُنسر پہ

روگاد ھکیم جاتے تا ذرشٹم اپتھمیہ سیونم"

(بیماری کی حالت میں بے احتیاطی (کھانے میں) کے باعث آدمی زیادہ بیمار ہوجاتا ہے۔ اسے بدپرہیزی کہتے ہیں)۔

یہ سنسکرت کی "انشٹپ" بحر میں لکھا گیا ہے۔ "پ" کا مطلب ہے مذکر۔ مہارشی پانینی نے جس طرح سب سے پہلے سنسکرت زبان کا گرامر "سوتروں" کی بنیاد پر لکھا ہے اسی بنیاد پر ایشور کول نے بھی کشمیری گرامر لکھا ہے۔ "کشمیری شبدامرتم" سے چند سوتروں کو بطور مثال پیش کرنا قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا اور ساتھ ہی جہاں اس سے اس تصنیف پر کچھ کچھ روشنی پڑتی ہے وہیں گرامر پر انکی نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چند مثالیں:-

(۱) "تا دور وشاد بود اتر تیشیہ چو کار"

اس سوتر کے مطابق جب کسی کو دور سے بلانا ہو یا غم کا اظہار کرنا ہو تو اس وقت سبجیکٹ (فاعل) میں "آ" کی جگہ "او" بن جاتا ہے۔ مثلاً:

تانارانو (اے نادان) ۔ تا کاکو (ارے کاکا) ۔ اس میں NOMINA-TIVE SINGULAR ۔ نارانا اور کاکا ہے اور VOCATIVE میں "یہ" "او" بن جاتا ہے۔

(۲) "ہت ساہے پورہ تراوزد دھیشو"

بزرگوں یا بوڑھوں کو بلانے کے وقت "ہت سا" یا "ہت با ہے" لگانا چاہیے مثلاً ہت سائے سہز بائے ۔ "ہت باہے رام با" ۔ ارے سہز، ارے رام۔

(۳) "آ پرتیہ یہ کنشٹھ ڈیمپھ ہتا شبدہ پور وشیخ"

ان سوتروں کے مطابق چھوٹے کو یا بچے کو بلانے کے وقت "ہتا" لفظ پہلے استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً "ہتا ماما ۔ ہتا مانہ کولا ۔ ہتا گلگیا وغیرہ۔

(۴) "کینشر شبد استیم ہتوسے"

یعنی "کینشر" لفظ ہمیشہ جمع کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے "کینشرن" ۔ (وہ چند) ۔ "کینشرو" ۔ (ان چند) وغیرہ

(۵) "کانشرھاہ کینشرھا شبدا وبکتوے"

اس سوتر کے مطابق "کانشرھا" (کوئی ایک) ۔ "کینشرھا" (کچھ) لفظ واحد کی صورت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً: کانشرھا اور کینشرھا

(۶) "یوت تیوت شبدا نام ایتوم اپرتھیک وچنے"

اس سوتر کے مطابق "یوت" (اِتنا) ۔ "تیوت" (اُتنا) ۔ ان الفاظ میں "یو" کا "ای" بن جاتا ہے۔ NOMINATIVE SINGULAR واحد (فاعل) کے بغیر مثلاً ییتھ اور تیتھ۔

(۷) "اُتر پد ستھشیہ پونی شبد سیہ پوہ"

اس سوتر سے مرکب (COMPOUND) میں "پ" "و" میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً: گنگہ ووَنی (گنگاجل) ، وییتھ وونی ۔ شیپنہ وونی ۔ ڈوگہ وونی ۔ مآروونی۔ روہ ووونی ۔ ناگہ وونی وغیرہ ۔ جب یہ الفاظ مرکب نہ ہوں تو اس وقت "پ" "و" میں تبدیل نہیں ہوتا جیسے "ویتھہ ہند پانہ عسیتن" (وِتستا کے پانی سے) اس جملے میں "پانہ" (پانی سے) کا "پ" "و" میں تبدیل نہیں ہوتا۔

(۸) "پورو پد ستھے نیہ سیہ انسوارہ"

اس سوتر سے مرکب میں "پانی" لفظ کی انسوار (NASALIZATION) ہوتی ہے جیسے پاں نوٹ (پانی کا مٹکا) مرکب کے بغیر یہ شکل اختیار کرتا ہے مثلاً پانیگ ۔ پانیُو (پانی کا)

(۹) "زانہ شبد سیاپہ"

مرکب میں جب " دانہ " لفظ پہلے ہو تو اس وقت " ڈیہ " کا انسوار ہوتا ہے۔ مثلاً " داش کھار " (ایک خرخار دھان) ۔ " داش پھوت (دھان کا ٹوکرا) ۔ " پہ " لفظ سے مراد دوسرے مرکب پر بھی یہ قاعدہ جاری ہے۔ مثلاً " داش کا نڈر "

(۱۰) " انا درا یتیشارہ بھے ادھم شبد یبھشیہ کیٹھ "

اس سوتر سے اگر کسی بچے یا شخص کی تحقیر کرنا مطلوب ہو تو اس وقت کلمۂ تحقیر کے آخر میں " کیٹھ " کا استعمال ہوتا ہے جیسے ژوپہ کیٹھ ۔ لوپہ کیٹھ ۔ راسہ کیٹھ ۔ کوہ کیٹھ ۔ " اپکانے تھ " ۔ اس سے " تہٕ " یا " یُہ " جیسے الفاظ کے آگے " تھ " بطور SUFFIX لگتا ہے جیسے تیتھ (ویسا) ییتھ (ایسا) ۔

(۱۱) " پنچمیبا دیگر تھے کینہ "

ABLATIVE کے آگے جب کسی سمت کا اظہار کرنا مطلوب ہو تو " کنہ " بطور SUFFIX لگتا ہے مثلاً : تتہ کنی / کنہ (اُدھر سے) ییتہ کنی / کنہ (ادھر سے) وغیرہ۔

(۱۲) " سیثادیبام پھلو "

جس وقت اناج وغیرہ کے متعلق بات کی جا رہی ہو اور ایک دانے (یا کم مقدار) کا اظہار کرنا مقصود ہو تو " پھول " بطور SUFFIX لگتا ہے : مثلاً تومُلہ پھول (چاول کا دانہ) ، مٹر پھول (مٹر کا دانہ) ، موہنگہ پھول (مونگ کا دانہ) ، ژھنہ پھول (کوئلے کا دانہ) ، بتہ پھول [ابلے چاول (بھات) کا دانہ] ۔

پھول یہاں کم مقدار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً : بتہ پھول کھیوم تہ دراس (تھوڑا سا بھات کھایا اور چل دیا) ۔ وندس منز گژھہ ژھنہ پھول ، تومُلہ پھول بیتر گرہ آسن دسر دیول ہیں کوئلہ چاول وغیرہ گھر میں ہونا چاہیئے) ۔

(۱۳) " وار شبد سیتہ سنانستھانے وسیدیہ "

اس سوتر کے مطابق نہانے کی جگہ " وار " لفظ کا " و " " ی " میں بدل جاتا ہے مثلاً

سنسکرت کے "واہل" سے "یاربل"۔ اسی طرح سنسکرت کے "ناو" (کشتی) لفظ میں "و" "ی" میں تبدیل ہوجاتا ہے جیسے "ناو" سے "نایہ" وغیرہ۔

(۱۴) "کاو ناگ ووُنٹ بھیشیچ"

اس سوتر سے کاو (کوا) ناگ (چشمہ) وُونٹ (اونٹ) وغیرہ جیسے الفاظ کی جنس تبدیل کرتے وقت ان کے آخر میں "اِنی" بطور SUFFIX لگتا ہے جیسے کاو ۔ کاوِنی "ناگ ۔ ناگنی" ووُنٹ ۔ ووُنٹنی وغیرہ۔

(۱۵) "وانداِ بھیورِن"

اس سوتر سے بھی جنس تبدیل کرنے کے لئے (مذکر سے مونث) "رنی" بطور SUFFIX لگتا ہے جیسے وانڈُر (کنجڑا، سبزی اگانے اور بیچنے والا) ۔ واندرنی کاندُر (نانوائی) ۔ کاندرنی وغیرہ۔

اس کے علاوہ انہوں نے اس گرامر میں تمام قاعدوں کی وضاحت کی ہے جن سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اُن کا مطالعہ کتنا گہرا تھا۔ انہوں نے بقول کسے "سمندر کو کوزہ" میں بند کردیا ہے۔ "کشمیری شبدامرتم" کے پیش لفظ میں انکی تعریف کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

'ICVARA KAULA'S WORK IS A GRAMMAR OF THE KASHMIRI LANGUAGE WRITTEN IN SANSKRIT, ON THE MODEL OF AN ORDINARY VYAKARMA. IT IS AN EXCELLENT WORK AND MIGHT HAVE BEEN COMPOSED BY HEMACHANDRA HIMSELF. KASHMIRI IS A LANGUAGE WHICH IS VERY LITTLE KNOWN, BUT WHICH IS OF GREAT IMPORTANCE FOR THE PURPOSE OF COMPARATIVE PHILOLOGY. EXISTING GRAMMARS OF IT HAVE BEEN MADE BY FOREIGNERS AND ARE IMPERFECT. THEY ALL SUFFER FROM ATLEAST

ONE GREAT FAULT, VIZ. THAT THEY ARE BASED ON THE REPRESENTATION OF THE LANGUAGE WHICH IS QUITE UNABLE TO EXPRESS THE MANY BROKEN VOWEL SOUNDS IN THE LANGUAGE. /GVARA-KOULA ADOPTED THE DEVANAGRI CHARACTER, INGENIOUSLY MODIFIED TO SUIT HIS PURPOSE"

کشمیری گرامر کے علاوہ انہوں نے "کشمیری کاوشن بھاشیو درے" نام کی ایک ڈکشنری دس زبانوں میں لکھی ہے۔ دیوناگری رسم الخط میں لکھی گئی اس ڈکشنری کی دو جلدیں ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں اس وقت بھی محفوظ ہیں۔ یہ ڈکشنری انہوں نے سنسکرت شلوکوں میں لکھی ہے۔ اس سے بھی مثال کے طور پر ایک شلوک ملاحظہ ہو:

" اخروٹ اکشوٹ والنٹ چہ جوز ہنگاک تتہ پرم
چہار مغز ایچہ چار مغز ڈوُن ترگا سترگا کرتا دمی"

اس شلوک میں اخروٹ کے نام دس زبانوں میں ہیں: اخروٹ - ہندوستانی، اکشوٹ - سنسکرت، والنٹ - انگریزی، جوز - عربی - ہنگاک - ترکی، چار مغز - فارسی ولپشتو، ڈوُن - کشمیری، ترگا - لامی اور بلتی۔

فارسی اور عربی پر بھی دسترس ہونے کے سبب انہوں نے قانون، طب اور ابو نصر فراحی کی کتاب "منصوب الصبیان" کا سنسکرت میں ترجمہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "دُربھکشہ تارو دیاست" سنسکرت میں لکھی ہے جو کہ منظوم ہے۔ اس میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے کے قحط کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔

کشمیری و سنسکرت زبان کے تئیں اُن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اُن کا دیہانت ۱۸۹۳ء میں ہوا۔



کتابیات

(۱) اے ڈکشنری آف کشمیری لینگویج ، مرتبہ سر جارج گریرسن

(۲) وشو سنسکرت شتابدی گرنتھ ۔ مطبوعہ جموں و کشمیر راجیہ بھاگیہ

(۳) کشمیری شبدامرتم : مرتبہ سر جارج گریرسن

(۴) کشمیری وشس بھاشو دے ۔ ایشور کول



نرائن مُرژ گر

نرائن مُرژگر ــ یہ نام سنتے ہی کتنے ہی لوگ چونک پڑیں گے۔ کتنی ہی تیوریوں پر بل پڑیں گے کہ مشاہیر کے اس جھرمٹ کے بیچ یہ نام کہاں سے آٹپکا۔ ایسا میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔ میں نے بھی جب پہلی بار یہ نام سنا تو کچھ پلے نہیں پڑا کیوں کہ میں بھی اُس وقت نرائن مرژگر کے نام اور اس کے کام سے ناآشنا تھا۔ اگر آپ کے دل میں اس قسم کے احساسات موجزن ہو جائیں۔ میں آپ کو دوشی نہیں ٹھہرا سکتا۔ وہ اس لئے کہ ہم چیزوں' کارناموں اور شخصیات کو دیکھ کر بھی کنی کترا کے نکل جانے میں ید طولی رکھتے ہیں۔ پھر نرائن مرژگر کا تعلق ایک ایسے شعبے' فنون لطیفہ کی ایک ایسی شاخ کے ساتھ رہا ہے جو اگر چہ شجرِ ممنوعہ تو نہیں رہی ہے مگر اس فن کو گذشتہ کئی صدیوں سے قبولِ عام کی سند حاصل نہیں۔ میری مُراد چتر کاری سے ہے۔ وہی چتر کاری جو ایک زمانے میں عبادت کا حصّہ تھی۔ کشمیر میں مصوّری کا ایک الگ سکول موجود تھا۔ ایک ایسا سکول جس نے لداخ اور تبت کی چتر کاری کو وجود بخشا۔ بودھ دور میں چتر کاری' خاص کر مہایان دور میں جب کشمیر کو بودھ دھرم کے پریاگ کا رُتبہ

حاصل تھا، پرچارکوں کے پرچار کا خاص ذریعہ تھی۔ بودھ پرچارک بھگوان بدھ کی زندگی کے گوناگوں واقعات کو رنگوں کی مدد سے پٹوں کی بساط پر اتارتے تھے اور گاؤں گاؤں جاکر تصویروں کی مدد سے عوام کو بودھ دھرم کے بنیادی اصولوں سے آگاہی دیتے تھے۔ مہایان دور میں کشمیر کی چترکاری کے چرچے دُور دُور تک تھے۔ گیارھویں صدی میں مشہور بودھ پرچارک رینچن زنگپو تیرہ سال تک کشمیر میں بودھ دھرم کا گیان حاصل کرتا رہا۔ کشمیر کے اپنے دوسرے دور کے دوران رینچن زنگپو چترکاروں کی ایک ٹولی اپنے ساتھ لے گیا۔ جنہوں نے مغربی تبت کے مختلف وہاروں کی تزئین و آرائش کرکے انہیں شاہکار بنا دیا۔ رینچن زنگپو کی سوانح عمری اور ڈاکٹر فرینکی کی کتابوں میں اس موضوع پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ ایک تبتی مخطوطے پدم۔ کار۔ بٹانگ میں درج ہے:۔

"جب کشمیر میں بودھ دھرم روبہ زوال ہوا بھکشوؤں کی ایک خاصی تعداد نے مغربی تبت کی اور کوچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلی فرصت میں وہ زانسکار چلے گئے اور وہاں پر سنا رھ کے پہلو میں کنڈکہ وہار کی بنیاد ڈالی اور اس کو دیواری تصاویر سے مزین کیا۔ کام ختم کرنے کے بعد ان کے پاس کچھ رنگ و روغن بچا رہا۔ چنانچہ انہوں نے ایک اور وہار کی بنیاد ڈال کر رنگ و روغن کو کام میں لانے کی ٹھان لی اور فیلدرگ میں موجود سمہ وہار کو آراستہ کیا۔ ان وہاروں کے بعد انہوں نے الچی اور مانگیو وہار تعمیر کئے۔"

یہ بات نہایت ہی دلچسپ ہیں کہ کشمیری چترکاری کے نمونے آج بھی لداخ کے مختلف وہاروں کی شوبھا بڑھا رہے ہیں مگر سب سے انمول نمونے (کشمیری چترکاری کے) گیبج اور ٹرہبرانگ کے وہار میں محفوظ ہیں۔ کشمیر کی چترکاری نے

لاہول اور سپیتی کے علاقوں میں بھی خاصی جڑ پکڑ لی تھی۔ مصوری کے ساتھ ہی کشمیری فن تعمیر بھی لداخ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں اپنی ساکھ بنانے میں کامیاب رہا تھا۔

مشہور بودھ مورخ تارا ناتھ رقمطراز ہے:-

"ماضی میں کشمیر میں مدھیہ دیش کے پراچین سکول کے پیروکار موجود تھے کچھ وقت گزرنے کے بعد ایک شخص ہر راج نے مورتی کلا (مجسمہ سازی) اور چترکاری (مصوری) کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی، جو اب کشمیری اسلوب کے نام سے موسوم ہے"۔

تارا ناتھ سے پہلے چودھویں صدی میں "بلیو انلس" میں کشمیر کی چترکاری اور مورتی کلا کے کئی حوالے موجود ہیں۔

بودھوں کے علاوہ ہندو بھی چترکاری کے رسیا تھے۔ چترکاری اور مورتی کلا ہندو ریتی کا ایک حصہ تھی۔ تنتروں میں بھی چتر کلا کے لئے خاصی گنجائش موجود تھی۔ مختلف تہواروں اور بزرگوں کے تئیں شردھا کا اظہار کرنے کے لئے چترکاری کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ آج بھی اشاڑھ نومی کے دن کئی ہندو گھرانوں میں "بارہ منڈل" بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح گوری ترتیا کے دن پروہت ہر ججمان کے گھر جا کر چترکاری کے نمونے بچوں میں بانٹتا تھا۔ دلہن کی پہلی گوری ترتیا کے موقع پر پروہت زیادہ سجیلی اور دیدہ زیب ہاتھ سے بنی ہوئی تصویریں اس کے سسرال لے جاتا اور منہ مانگے دام حاصل کرتا تھا مگر مشینی دور نے چترکاری کی اس روایت کو زمین بوس کر دیا اور چترکاری کی جگہ بازار سے خریدی گئی تصویروں نے لے لی۔ ہاں ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ تانترک چترکاری میں اکثر چتر اقلیدسی طرز کے ہوتے تھے۔ یہ سبھی چتر میرے بچپنے میں بھی مروج تھیں۔ گذشتہ بیس،

تیئس سال میں یہ چیزیں، یہ ریتیں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ چتر کاری کا فن، جو کسی زمانے میں ہمارے یہاں عروج پر تھا، فن سے زیادہ عقیدت کا حصہ بن گیا تھا۔ ایسا ہونا ایک طرح سے فائدہ بخش بھی ثابت ہو سکتا تھا مگر آہستہ آہستہ لوگوں نے اسے عقیدت کی سرحدوں سے بھی نکال باہر کر دیا کیونکہ مشینی تصاویر نے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر کے رکھ دیا۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ چتر کاری کا چراغ کہیں دور یا زمانے کی ہواؤں میں گُل ہو گیا۔ ہاں اس کی لو ضرور مدھم پڑ گئی۔ پھر بھی حسن کاری کے متوالے لیے خونِ جگر سے موقلم کو تھامے رنگوں کی دنیا کو سجاتے اور سنوارتے رہے۔

شاہمیری دور میں بھی ہمارے یہاں مصوری کا خاصا چرچا رہا ہے۔ فٹز ولیم میوزیم کیمبرج میں سولہویں صدی کے کچھ مینا تور موجود ہیں۔ ان نمونوں پر بات کرتے ہوئے ہرمن گوئیز نے لکھا ہے:-

"کشمیری سلطانوں کے زمانے کی اسلامی مصوری کے نمونے فارسی مصوری کا تسلسل ہے جبکہ فنِ تعمیر کے شعبے میں ایسا نہیں ہے۔ افغان اور مغل اسلوبوں کی پیروی کے باوجود بھی اسلامی روایت کا تصویری فن آج تک قائم ہے۔ ہندو اسلوب کی چتر کاری جس کا سراغ کانگڑا راجپوت سکول سے ملتا ہے، کی خصوصیت تانترک مینا تور ہیں جن میں ہلکے سرخ اور سنہری رنگوں کی آمیزش ہے۔ اس اسلوب کو جموں کے مہاراجاؤں نے رواج دیا۔ کشمیر کے یہ دونوں اسلوب مزید تحقیق کی دعوت دیتے ہیں"۔

مصوری کے کشمیری اسلوب پر بات کرتے ہوئے رائے کرشن داس نے ۱۹۵۵ء کے "للت کلا" رسالے کے مارچ کے شمارے میں لکھا ہے:-

"جس وقت مصوّری کے مغل سکول نے جنم لیا اس وقت کشمیر میں ایک ہندوستانی سکول عروج پر تھا۔ اس سکول نے بھی مغل اسلوب کو بنانے اور سنوارنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ جو تصویریں اس نظریے کو صحیح ثابت کریں گی ان کو ابھی تک شائع نہیں کیا گیا ہے۔ ہاں تنجّی نے اس سلسلے میں مغلوں سے پہلے کے مصوّری کے کچھ نمونے شائع کئے ہیں"۔

مغل دور میں بھی کشمیری قلم رواں دواں تھا اور کشمیر کا ذکر مغل مصوّری کے ایک ضمنی سکول کے طور پر بھی ہوا ہے۔ پرسی براؤن نے کشمیری قلم کو مصوّری کا کسی قدر گھمبیر اسلوب تسلیم کیا ہے حالانکہ اُس نے دہلی کی چھاپ کو کشمیری قلم میں شدّت سے محسوس کیا ہے مگر لکھنؤ قلم کی طرح اس نے کشمیری قلم کو سرے سے ہی ناپسند نہیں کیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بیرونی اثرات کے تحت اگرچہ کشمیری قلم کی توانائی میں پہلا جیسا زور نہیں رہا تھا مگر پھر بھی روایت موجود تھی۔

پرسی براؤن نے کشمیری مصوّروں کے ایک خاص طریقہ کار کی سراہنا کی ہے جسے آبینا کہتے تھے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے براؤن نے لکھا ہے:

"مثال کے طور پر خاکے کو موقلم کے ذریعے صرف پانی سے بنایا جاتا تھا۔ سوکھنے کے بعد ایک تہہ نقش (water mark) پڑ جاتا تھا جو اس کے بعد کی رنگ آمیزی کے لئے رہنما کا کام دیتا تھا۔ کہتے ہیں کہ کشمیری نقاش ایک بہت لطیف اثر پیدا کرتے تھے۔ وہ پانی کو کاغذ پر یونہی پڑا رہنے دیتے تھے۔ یہاں تک کہ پانی اڑ کر ایک ہلکی سی گاد چھوڑ دیتا تھا جس کو وہ پہلوی خاکوں میں بطور تہہ رنگ استعمال کرتے تھے۔ اس کا جو ہلکا سا نشان باقی رہتا اس سے زمین اور چہرے کے گندمی رنگ کے درمیان ایک حسین مگر لطیف تضاد پیدا ہو جاتا تھا"۔

حق تو یہ ہے سیاسی اُتار چڑھاؤ کے ساتھ ہی کشمیر میں مصوری سکڑتی اور پھیلتی رہی ہے۔ کبھی تو یہ صرف نقل کی نقل ہو کر رہ گئی اور کبھی کبھی اچھی خاصی چیزیں بھی وجود میں آتی رہیں۔ مصوری اگرچہ بازار کی چیز نہیں مگر اس کے لئے بھی سرپرستی کی بہرحال ضرورت ہے۔ اگر کسی گراں قدر شئے کی مانگ نہ رہے اگر اس کے قدردان موجود نہ ہوں تو وہ چیز بھی سمٹ کر رہ جاتی ہے اور بالآخر مر جاتی ہے۔

اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے دور میں چتر کاری کی روایت لکڑی پر کھدائی کے کام 'پھلجڑیوں کی صورت میں' دیواری تصاویر اور پیپر ماشی یا کار قلمدانی کی صورت میں پنپتی رہی۔ کشمیریوں نے اس زمانے میں فارسی اثرات کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ اس دور میں اس فن سے وابستہ لوگ کامگار کہلاتے تھے۔

میر اسیٹھ کا کہنا ہے کہ مغل سلطنت کے گر جانے کے بعد بھی لگتا ہے کہ ڈوگرہ ریشی اور کشمیر میں میناتور کی روایت جاری رہی۔ نیشنل میوزیم میں کشمیری میناتور کا گیارہ تصویروں کا جو مجموعہ موجود ہے وہ کافی حد تک ڈوگرہ دیواری تصاویر سے لگا کھاتا ہے۔ ان میں سے ایک میناتور میں نوزائیدہ کرشن کو واسدیو دیوکی کے کمرے سے اٹھا کر یشودھا کے گھر لے جاتے دکھایا گیا ہے۔ اس تصویر میں دریا، کمرے، پہاڑیاں، چیتا بالکل اسی انداز کے ہیں جیسے کہ یہ رگھناتھ مندر کی دیواری تصاویر میں نظر آتے ہیں۔ وشنو کا موہنی روپ جہاں وہ دیوتاؤں میں امرت بانٹتا نظر آتا ہے بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔ مگر ایک بات توجہ طلب ہے کہ فن پارے اگرچہ موجود ہیں مگر اکثر و بیشتر صورتوں میں ہم فن کار کے نام سے ناآشنا ہیں۔

میں خوب سمجھتا ہوں کہ میرے محترم قاری چیں بہ جبیں ہوں گے کہ میں بات کو کہاں سے کہاں لے گیا مگر معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ ابتک اس موضوع پر اس قدر کم لکھا گیا ہے کہ کم و بیش پس منظر دیئے بغیر بات بنتی نظر نہیں

آتی سیاق و سباق کو سمجھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہر فن کی ایک روایت ہوتی ہے جس کے سہارے اس کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔

ہاں تو نارائن مرزگر کا تعلق مصوری کے اسی سکول کے ساتھ رہا ہے جس سکول کی بنیاد عقیدہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ اُن مصوروں کے قریب ہے جنہوں نے نیشنل میوزیم میں موجود چیز تلا کے گلدستے کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ اس نے یہ فن کس سے اور کہاں سے سیکھا تھا۔ یہ تو معلوم نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اُسے یہ فن ورثے میں ملا ہو جیسا کہ گزشتہ زمانے میں اکثر ہوتا تھا۔

مرزگر کا نام میں نے پہلی بار سٹن کے ایک بوڑھے برہمن پنڈت آنند شیر سے ۱۹۶۴ء میں اُس وقت سُنا جب میں پرمانند کی زندگی کے واقعات دریافت کرنے کے لئے وہاں گیا تھا۔ آنند شیر کی عمر اس وقت سو سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اُس نے پرمانند کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ باتوں باتوں میں اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پرمانند کے طالبوں (ششوں) میں جو لوگ شامل تھے ان میں خصوصیت کے ساتھ صالح گنائی، چایہ ست رام، لکھمن بل اور نرائن مرزگر شامل تھے۔ آنند شیر نے مجھے پرمانند کے ششوں کے خدوخال کے بارے میں بتایا کہ دوسرے لوگوں کی طرح مرزگر بھی پگڑی باندھتے اور لمبا کرتہ پہنا کرتے تھے۔ نرائن مرزگر کی مصوری کے بارے میں آنند شیر کو شاید معلوم نہیں تھا۔ اس طرح میں نے اُسے پرمانند کا شش مان کر اس کا اندراج کلیات پرمانند کی پہلی جلد میں کر دیا۔ آنند شیر کے بیان کی تصدیق بعد میں ماسٹر جی سے بھی ہوئی جنہوں نے اپنی کتاب پرمانند میں نارائن مرزگر کا ذکر پرمانند کے شش کے طور پر کیا ہے۔ مصور نارائن مرزگر سے کچھ دیر بعد میں اس وقت آشنا ہوا جب میں نے لکھمن بل کے لکھے ہوئے پرمانند کے کلام کے مجموعے کو دیکھا جس میں مرزگر کی بنائی ہوئی دو مینا تور پینٹنگیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پینٹنگ میں لکھمن بل

کو گورو پرمانند کے سامنے دکھایا گیا ہے' میناتور میں گورو اور شش سے اوپر دیوی کو دکھایا گیا ہے جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ مرزگر دیوی بھگت تھا۔ دراصل یہ پینٹنگ مصوّر نے گورو اور دیوی کے تئیں اپنی شردھا کو ظاہر کرنے کے لئے بنائی ہے کیوں کہ پینٹنگ کے نیچے یہ دیوی بھجن لچھمن بل کے دستخطوں سے لکھا ہوا ہے

ترلوکی ہنز رکھیا کارئ ۔ جے جے جے جے راژ برآریے

(تینوں لوکوں کی رکھوالی کرنے والی مہا دیوی' تیری جے ہو)

میناتور کے ساتھ جو دیوی بھجن مخطوطے میں محفوظ ہے وہ بھجن بَلّ کی تخلیق ہے۔ ظاہر ہے کہ پرمانند کے شش ہونے کے باوصف مرزگر اور بَلّ دونوں شاکھت مت میں بھی یقین رکھتے تھے۔ اس میناتور کی توسیع پرمانند کی وہ شبیہہ ہے جو پرمانند آشرم مٹن میں آویزاں ہے اور جس کی ایک کاپی کلچرل اکادمی کے پاس بھی ہے۔ لگتا ہے کہ پرمانند کی یہ شبیہہ مرزگر نے بعد میں بنائی تھی۔ کیوں کہ اس میں داڑھی سفید رنگ کی ہے جبکہ کلیات میں چھپی میناتور میں پرمانند کی داڑھی کالی ہے۔ پرمانند کی جس شبیہہ کا ذکر اوپر آیا ہے وہ شبیہہ پروفیسر رتن پارمو نے "انڈیا میگزین" میں شائع کی ہے۔ مگر وہاں پر اسے پرمانند کی شبیہہ نہیں کہا گیا ہے۔ پروفیسر رتن پارمو کا مرزگر کے بارے میں ایک تعارفی مضمون اسی رسالے میں چھپا ہے۔

مرزگر کے لئے چتر کاری عبادت بھی تھی اور جینے کی سبیل بھی۔ اس لئے اُسکی تصویروں میں مصوّر کا اندرون بھی جھلکتا ہے اور اس کا فن بھی۔ ایک اچھے فن کار کی یہی ایک نشانی ہے کہ وہ اپنے آپکو فن پارے میں جذب کرتا ہے۔ پرمانند کی شبیہہ میں مرزگر نے پرمانند اور اس کی روحانی برتری کو رنگوں کی مدد سے اس طرح ابھارا ہے کہ انسان داد دئے بغیر نہیں رہتا۔ مصوّر کی اپنی شبیہہ بھی کافی خوبصورت

اور بھرپور ہے ۔ کیوں کہ فن کاری انسان کی ازلی پیاس ہے جو لاکھ بجھانے پر بھی بجھنے کا نام نہیں لیتی اور نت نئے روپ دھار کر جلوہ گر ہوتی ہے ۔ حُسن کی تلاش ہی تخلیق کا سرچشمہ ہے ۔ اگر انسان کی یہ پیاس کسی موڑ پر بجھ جائے تو انسان نرا جانور بن کے رہ جائے گا ۔ سنگیت اور مصوری زبان کی سرحدوں سے بالاتر ہیں ۔ پنڈت آنند کول بامزئی مرزگر کا اہم عنصر تھا ۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے اس کا ذکر مختصر مگر واضح الفاظ میں کیا ہے ۔ بامزئی نے لکھا ہے کہ مرزگر پیپر ماشی کی چیزوں پر نقشے ڈھالنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا مگر اس نے یہ فن کسی اور کو سکھایا نہیں ۔ اس کی مصوری کے نمونے نہ جانے آج بھی کتنی آرٹ گیلریوں ، میوزیموں اور ڈرائنگ روموں کی زینت ہوں گے ، مگر فن کے نام لیوا تو موجود نہیں مگر فن کار ، جس نے اس حسن کو تراشا اور نکھارا اُسے کوئی جانتا بھی نہیں ۔ وہ اس لئے کہ حسب دستور مرزگر نے بھی اپنے فن پاروں پر کہیں بھی اپنے دستخط ثبت نہیں کئے ہیں ۔ کچھ دن پہلے مجھے اپنے دوست غلام رسول حسرت گڈھا کا ایک شاہنامہ مخطوطہ دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں بیس مینا تور ہیں ۔ ان نمونوں میں کچھ نمونے خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں ۔ اس مخطوطے کا تعلق میرے خیال میں انیسویں [19] صدی سے ہے اور جہاں تک اندازہ کام کرتا ہے ان فن پاروں کا اسلوب نارائن مرزگر کے اسلوب کے بہت قریب ہے ۔ ان میناتوروں میں اردھ ناری شر کی تصویر کافی خوب صورت ہے اور اپنے طرز کی منفرد پینٹنگ ہے ۔ اس میناتور میں دائیں جانب آسن کے نیچے نندی اور بائیں جانب آسن کے نیچے شیر کو دکھایا گیا ہے ۔ شو کے ایک ہاتھ میں ترشول ہے اور وہ مالا پہنے ہوئے ہے جبکہ دیوی کے ہاتھوں میں کنول اور گدا ہے ۔

ایک اور میناتور بھی قابل غور ہے ۔ اس میناتور میں گنیش اور رولیھا دو شیروں پر سوار ہیں ۔ گنیش نے سانپ کو مالا کے طور پر پہن رکھا ہے ۔ گنیش کے چار بازو دکھائے

گئے ہیں جبکہ ولبھا کے ہاتھ میں ایک برتن ہے جس پر نقوش اُبھارے گئے ہیں۔ گنپتی کے گلے میں ناگ راج کا ہونا ایک نئی علامت ہے جو قابلِ غور بھی ہے اور قابلِ توجہ بھی۔ دوسرے میناتوروں میں وشنو اور لکشمی، شو اور پاروتی رتھ پر سوار کرشن اور ارجن، درگا اور ماتا دیوی وغیرہ کو دکھایا گیا ہے۔

کشوری کول کے مطابق نرائن جو کا جنم ۱۸۰۲ء کے آس پاس ہوا تھا اور وہ ۱۹۱۰ء تک بقیدِ حیات رہا۔ اس اعتبار سے اس نے کشمیر میں پٹھانوں، سکھوں اور ڈوگروں کے دورِ حکومت دیکھے ہیں۔ نتیجے کے طور پر اس کے فن میں تینوں ادوار کی خصوصیتیں سمٹ کر آئی تھیں۔

نرائن جو بنیادی طور پر کاچرو خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر وہ مرزگر کے نام سے مشہور ہوا۔ مصور ہونے کے علاوہ وہ مجسمہ سازی میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس کی مجسمہ سازی اس کی ذات اور چیترکاری پر غالب آئی اور وہ مرزگر (مجسمہ ساز) کے نام سے جانا پہچانا جانے لگا۔ اس نے میناتور کا فن بچپن سے ہی سیکھا تھا اور بعد میں مجسمہ سازی کے فن میں بھی دسترس حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مٹی میں روئی ملا کر اس قدر خوبصورت مجسمے تراشتا تھا کہ انسان دنگ رہ جاتا تھا۔

مرزگر کا کوئی لڑکا تو تھا نہیں جسے وہ اپنا فن سکھاتا، جس کا افسوس آنند کول بامزئی کو بھی تھا۔ مگر اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے ایک لڑکے کو بھی گود لیا تھا۔ اس کی ایک لڑکی لچھ کچی، جو کہ عین جوانی میں بیوہ ہو چکی تھی، باپ کی میناتور بنانے میں مدد کیا کرتی تھی۔ وہ رنگ کوٹنے اور کاغذ پر شیشے کی رگڑ سے چمک اور پھسلن پیدا کرنے میں باپ کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ مرزگر الپن (A Pen) سوئی کی مدد سے پہلے میناتور کا خاکہ تیار کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ کوئلوں کو مہین کوٹتا تھا اور کپڑے میں چست باندھ کر کاغذ پر رگڑتا تھا۔ تصویر کا خاکہ اصلی خاکے کے پور سے

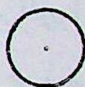
نیچے رکھے دوسرے کاغذ پر ابھر آتا تھا۔ اس طرح سے وہ ضرورت کی نقول تیار کرتا تھا۔ پھر وہ خاکے کو رنگوں کی مدد سے بناتا اور سنوارتا تھا۔ یاد رہے کہ کوئلوں کی مدد سے خاکے بنانے کا رواج تبت میں بھی رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چیز تبتیوں نے کشمیریوں سے ہی سیکھی ہو کیوں کہ دوسری باتوں کی طرح مصوری میں بھی کشمیری ہی تبتیوں کے پیشرو ہیں۔

مرزگر میناتور کی مناسب نقول بیک وقت تیار کرتا تھا چاہے یہ خاکہ ابھارنے کا سلسلہ تھا یا رنگ بھرنے کا۔ کبھی کبھی وہ ایک میناتور کی دس نقول بیک وقت تیار کرتا تھا۔ اس قسم کے میناتور اور پورٹریٹ اس کے وارثوں اور دوسرے فن شناسوں کے پاس اب بھی موجود ہیں۔ وہ لکڑی پر کھدائی کے ڈیزائن بھی تیار کرتا تھا۔ اس نے گنیش اور ہنومان کے سانچے بھی بنائے تھے اس کی دیواری تصاویر کو آج بھی رعناواری اور سومیار (حبہ کدل) کے مندروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مرزگر کے کچھ میناتور مختلف ٹھاکردواروں کی آج بھی شوبھا ہیں۔ اور کچھ میناتور سری سنگر میوزیم میں بھی محفوظ ہیں۔ آج کافی وقت گزرنے کے بعد بھی اس کی تصویروں کا رنگ پھیکا نہیں پڑا ہے۔ کیوں کہ ماضی کے مصوروں کی طرح مرزگر بھی نباتاتی رنگوں کا استعمال کرتا تھا حالانکہ اس کے زمانے میں مصنوعی رنگ قبول عام حاصل کر رہے تھے۔

مرزگر ایک اُپاسک تھا۔ راہ حق کا متلاشی۔ وہ ہر سال ہون کیا کرتا تھا۔ اور اس موقع پر وہ اپنے میناتور لوگوں اور پروہتوں میں مفت تقسیم کرتا۔ یوگی ہونے کے ناطے اس کی صحت ہمیشہ ہی اچھی رہی۔ سو سال کی عمر تک وہ بلاناغہ روز ہی وِتستا میں منہ اندھیرے نہاتا۔ زندگی کے آخری ایام میں اُسے چھڑی کا سہارا لینا پڑا تھا۔ کیوں کہ فرش پر بیٹھ کر میناتور بنانے

سے اس کی پنڈلیاں کس گئی تھیں۔

زندگی کی آخری سانسوں تک اس نے حسن کاری کو گلے سے لگائے رکھا۔ وہ پینٹ کرتا ہے۔ حیوانوں، پرندوں اور انسانوں کے خاکوں میں رنگ بھرنے سے اس نے کبھی منہ نہیں موڑا۔ اور آج بھی اس کی ایک لاڈلی۔ کشوری رنگوں کی مدد سے خاکوں کا روپ نکھارنے میں مصروفِ کار ہے۔ ٥



برج پریمی

پنڈت گوبند کول

"کشمیر سے مجھے جو عشق ہے اس کی تب وتاب (اپنے کام کے سلسلے میں) کشمیر سے دور رہنے پر بھی متاثر نہ ہوئی ــــ اسی کشمیر میں مجھے گوبند کول کی دوستی کا فخر حاصل ہوا ــــ"

ارل سٹائن - ۲۱ ستمبر ۱۹۱۶ء

بلند و بالا پہاڑوں سے گھری ہوئی یہ وادی رنگ و بو صرف اپنی شیتل ہواؤں اور اور آنکھوں کو ٹھنڈک دینے والے مناظر کے لئے ہی عجوبہ روزگار نہیں بلکہ عقل و دانش کی ایک عظیم آماجگاہ بھی ہے ــ صدیوں پہلے علم و عرفان کی جوت یہاں جلی تھی جس نے تاریخ کے ہر دور میں ایک دنیا کو فیض یاب کیا اور ان پہاڑوں اور گھاٹیوں سے ہزاروں میل دور رہنے والے تشنگان علم کو راستوں کی صعوبتوں کے باوجود یہاں آنے پر اکسایا۔ چینی سیاح ہیون سانگ اور او کانگ سے لے کر آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے ۔ ان ہزاروں لوگوں کے اژدھام سے قطع نظر جو یہاں کی جھیلوں، یہاں کے جھرنوں، یہاں کے چشموں اور یہاں کے جنگلوں کے بیابانوں سے آسودگی، سکون اور قرار حاصل کرنا چاہتے تھے، علم، گیان، عرفان، فن کے کتنے ہی شیدائی یہاں آئے اور دفینوں کو ٹٹول ٹٹول کر کھوج لیا ـ ان سے روشنی، بالیدگی اور دانش حاصل کی اور

اپنے من کے اندھے بیابانوں میں چراغ روشن کئے۔ یہاں سے لوٹے تو تن اور من کی دولت سے مالا مال تھے۔

یہ اسی مٹی کا اعجاز ہے!

زندہ دلوں، بیدار مغزوں اور روشن دماغوں کے اس حلقے میں ایک سنسکرت عالم پنڈت گوبند کول بھی تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر کے کلچر کی ساکھ قائم رکھنے میں صرف کیا۔ وہ مہامہو پادھیائے پنڈت مکند رام شاستری، پنڈت الیشر کول اور پنڈت سہج بٹ جیسے عالموں کے ہم عصر تھے۔ وہ برسوں تک عالمی شہرت کے مالک، ماہر آثار قدیمہ، سنسکرت زبان کے عالم اور کلہن کی راج ترنگنی کے مترجم اور مفسر سر آرل سٹاین کے ساتھ رہے۔ کلہن کے اس سچے عاشق کے علم و فضل سے ارل سٹاین نے خود اکتساب فیض کیا تھا۔ اس کا اعتراف وہ راج ترنگنی کے دیباچے میں خود کرتے ہیں:-

"ان کی (پنڈت گوبند کول کی) 'قدیم دنیا کی روایات' اور علم و فضل کے خزانے میرے لئے ہمیشہ کھلے تھے"۔

پنڈت گوبند کول کی ولادت ۱۸۴۶ء میں ایک ذی عزت برہمن گھرانے میں ہوئی تھی۔ ان کا انتقال ۱۸۹۹ء میں ہوا۔ اس طرح وہ کل ۵۳ برس جیئے لیکن اس مختصر سی زندگی میں انہوں نے علم و فضل اور دانشوری میں امتیاز حاصل کیا۔ ان کے والد پنڈت بلبدر کول کا انتقال ۷۷ برس کی عمر میں اپنے بیٹے کے سورگباش ہونے سے صرف ایک سال قبل ہوا۔

پنڈت گوبند کول کے دادا پنڈت تابہ کول افغان عہد کے آخری سنسکرت عالم ہونے کے باعث بڑے نامور تھے۔ وہ پنڈت بیربل در جیسے عہد ساز شخص کے خاندانی گورو تھے۔ بیربل در افغان عہد اور بعد میں سکھ عہد میں کافی اثر و رسوخ کے

مالک تھے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے پنڈت راج کاک در بھی سکھ عہد میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس خاندان کے ساتھ برسوں تعلق خاطر کے باعث پنڈت تابہ کول کو ایک جاگیر سے نوازا گیا تھا۔ اور انہیں عزت و توقیر ملی تھی۔ پنڈت تابہ کول اور ان کے صاحبزادے بلبدر کول نے ان اچھے دنوں میں صرف مادی آسودگی حاصل نہیں کی بلکہ سنسکرت علوم میں قابل قدر کام کیا۔ لیکن یہ معاملہ زیادہ عرصہ نہ رہا۔ ۱۸۴۶ء میں سکھ حکومت کے زوال کے بعد جب راجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کا "سودا" طے کر لیا اور جموں و کشمیر کی سلطنت مستحکم کی تو یہ عنایات اور سرفرازیاں ختم ہو گئیں۔ اور بلبدر کول کے خواب ٹوٹ گئے اور لاچاری اور ناداری کے سائے منڈلانے لگے۔ ان کی جاگیر چھین گئی۔ اور وہ مفلوک الحال ہو گئے۔ بلبدر کول کا ذریعۂ روزگار اب صرف اپنا خاندانی پیشہ تھا۔ اس پر اکتفا کرنے کے سوائے اب ان کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ انہیں چونکہ سنسکرت ادبیات پر عبور حاصل تھا اس لئے سنسکرت کی درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ شاستروں کی درسیات دینے کے عوض عسرت اور ناداری کے یہ دن کٹنے لگے۔ اس صورتحال میں وہ در خانوادے کی حویلی میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزارنے لگے لیکن بلبدر کول نے بلند حوصلگی سے کام لیا اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے تین بچوں کی تعلیم سے غفلت نہیں برتی۔ انہیں سنسکرت زبان کی اعلیٰ تعلیم دی اور ساتھ ہی سنسکرت کے بیش بہا قلمی نسخوں کا وافر خزانہ اکٹھا کر لیا۔

پنڈت بیربل در کے سورگباش ہونے کے بعد ان کے فرزند پنڈت راجہ کاک در نے اپنے والد کے نقش قدم پر گامزن ہو کر انتظامیہ میں کافی عمل دخل حاصل کیا۔ اور اپنی خداداد قابلیت سے مہاراجہ گلاب سنگھ کا دل موہ لیا۔ ان سے گوبند کول کے والد بزرگوار پنڈت بلبدر کول بھی فیض یاب ہوتے رہے

در خانوادے کے ساتھ تعلق خاطر کے باعث جیسا کہ ذکر ہو چکا گوبند کول کے

والد ان کے خاندان اور خود گوبند کول برسوں تک عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارتے رہے اگرچہ ان کے پاس وہ ٹھاٹ بھاٹ نہیں رہا تھا گوبند کول راجہ کاک در کے صاحبزادے رام چندر در کے احباب میں خاص امتیاز رکھتے تھے اور ان کی حیثیت ان کے لنگوٹئے یار کی سی تھی ۔ چنانچہ جب راجہ کاک سورگباش ہوئے تو رام چندر در نے اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر انتظامیہ میں خاص دخل حاصل کیا ۔ وہ بڑے ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھے ۔ یہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا عہد تھا جو علم و ادب کا زبردست قدردان تھا ۔ مہاراجہ رام چندر در کی خداداد صلاحیت اور علمی استعداد سے اس قدر متاثر ہوا کہ انہیں اپنا خاص مشیر مقرر کیا ۔ مہاراجہ نے اسی زمانہ میں تعلیم، ابریشم اور زراعت کے محکمہ جات کی بنیاد رکھی اور یہ کام رام چندر در کو سونپا گیا ۔ رام چندر در کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ علاوہ انگریزی کے لاطینی اور فرانسیسی زبانوں سے بھی واقف تھے ۔ اس کے علاوہ وہ فارسی اور سنسکرت پر خاص دسترس رکھتے تھے ۔

پنڈت گوبند کول نے اوائل جوانی کا بیشتر وقت رام چندر در کی صحبت میں گزارا ۔ جب رام چندر اپنے منصبی فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں مختلف مقامات کے دورے پر جاتے تھے تو گوبند کول ان کی مصاحبت میں ہوتے تھے اور اس طرح سے انہیں کشمیر کے دور دراز مقامات اور کشمیر سے باہر جانے کا موقعہ ملا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنسکرت اور شاستر پڑھتے ہوئے اس نوجوان کے مشاہدے میں گہرائی پیدا ہوئی جس نے اس کے ذہن کو نئی وسعتوں سے ہم کنار کیا ۔ آئندہ برسوں میں یہ مشاہدہ اُن کے لئے کارآمد ثابت ہوا ۔

پنڈت گوبند کول نے سنسکرت اور شاستروں کا مطالعہ بالعموم کیا تھا لیکن ان کی خاص دلچسپی النکار شاستر سے تھی اور سنسکرت شاعری بطور خاص انکی کمزوری تھی ۔ نیائے ، شیو شاستر اور صرف و نحو پر انہیں بے پناہ دسترس حاصل تھی ۔

انہوں نے مہابھارت، رامائن، پورانوں اور دوسری ایسی مقدس کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے اس تبحر علم کے باعث انہیں ۱۸۷۴ء؎ میں دارالترجمے کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس ادارے کا مقصد یہ بھی تھا کہ سنسکرت میں موجود قانون، فلسفہ، طب وغیرہ سے متعلق مضامین کو ہندی (اردو) میں منتقل کیا جائے۔ پنڈت سہج کول اور پنڈت گوبند کول جیسے عالموں نے اس میں روح پھونک دی۔ یہ وہی سہج بٹ تھے جو بعد میں پنڈت گوبند کول ہی کی طرح سر ارل سٹائین کے خاص مددگار بن گئے۔ اس زمانہ میں راج ترنگنی کو ہندی میں منتقل کرنے کا کام بھی شروع ہوا تھا لیکن تکمیل نہ ہو سکا۔ ۱۸۸۵ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے ساتھ ہی چونکہ اس ادارے میں وہ دم خم نہ رہا اس لئے اسے بند کر دیا گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد عنان حکومت ان کے بیٹے مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے سنبھالی۔ یہ دور سیاسی اعتبار سے پُر آشوب دور رہا ہے۔ برسوں تک وہ برائے نام بادشاہ رہے۔ اصل اقتدار ان کے بھائی راجہ امر سنگھ اور ریجنسی کونسل کے ہاتھ میں تھا جن کے اوپر وائسرائے کا مقرر کیا ہوا انگریز ریذیڈنٹ تھا۔ یہی سبب ہے کہ بظاہر امن و سکون کی صورت حال تھی مگر ترقی کے شعبوں میں کوئی قابل قدر پیش رفت نہ ہوئی۔ دوسری طرف پورے ملک میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔

؎ یہ دارالترجمہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے قائم کیا تھا۔ اس ادارے کا مقصد مغربی علوم کو اردو کے علاوہ ریاست جموں و کشمیر میں مروج دوسری زبانوں مثلاً ڈوگری، ہندی اور پنجابی میں منتقل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ان علوم اور فارسی اور عربی کے اہم کارناموں کو سنسکرت میں منتقل کرنا تھا۔ اس ادارے کے ساتھ اور لوگوں کے علاوہ پنڈت سہج بٹ، لالہ بسنت رائے، پنڈت بخشی رام، غلام غوث خان، مولوی فضل الدین، بابو نصر اللہ عیسائی، حکیم فدا محمد خان جیسے زبان دان اور مترجمین وابستہ تھے جنہوں نے قابل قدر کارنامے مختلف زبانوں میں منتقل کئے۔ یہ ادارہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں بند ہوا۔

نظم و نسق کے لئے انگریزی طریقہ کار آزمایا جارہا تھا ۔ کئی علوم و فنون میں ترقی کی نئی راہیں استوار ہو رہی تھیں ۔ اس کے اثرات لازمی طور پر کشمیر پر بھی پڑے ۔ لیکن برسوں کی غلام درغلام زندگی نے ذہنوں کو زنگ آلودہ کر دیا تھا ۔

پنڈت گوبند کول دارالترجمے کی خدمات سے سبکدوش ہو چکے تھے ۔ دارالترجمہ بھی اب بند ہو چکا تھا ۔ اور اس میں مسودات اور مخطوطات کا خزانہ مقفل ہو چکا تھا ۔ گوبند کول نے سنسکرت کے ایک معمولی سے پاٹھ شالہ میں معمولی مشاہرے پر درس و تدریس کا کام سنبھال لیا تھا جہاں سنسکرت کے اس بڑے عالم کو ماہ بہ ماہ تنخواہ بھی باقاعدگی سے نہیں ملتی تھی ۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد کی علم پروری کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے ۔

۱۸۷۵ء میں پروفیسر جارج بوہلر سنسکرت مسودات کی تلاش میں کشمیر آئے ۔ یہاں کی سیاحت کے دوران انہیں سنسکرت لسانیات سے متعلق بے پناہ مواد ملا اور روشنی ملی ۔ اسی سیاحت میں ان کی ملاقات پنڈت گوبند کول سے ہوئی پروفیسر بوہلر کی مشہور رپورٹ میں پنڈت گوبند کول کے بارے میں جو تعریف و تحسین درج ہے اس سے گوبند کول کی سنسکرت زبان پر بے پناہ دسترس اور سنسکرت قواعد پر استادانہ قدرت کا حال کھلتا ہے ۔ بوہلر جیسے عظیم عالم اور مستشرق کے ایسے کلمات درجۂ استناد رکھتے ہیں ۔[1] سر ارل سٹاین کو اعتراف ہے کہ سب سے پہلے اسی والے نے ان کو پنڈت گوبند کول کی طرف متوجہ کیا اور جب وہ ۱۸۸۸ء میں پہلی بار کشمیر آئے تو وہ پنڈت گوبند کول سے ملے ۔ پہلی ہی ملاقات میں سر سٹاین، جارج بوہلر کی نظر کی گہرائی کے قائل ہو گئے اور انہیں محسوس ہوا کہ گوبند کول کی ذات اس تعریف

---

[1] پروفیسر بوہلر نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں پنڈت گوبند کول کی قابلیت اور تحقیقی صلاحیت کے بارے میں توصیفی رائے کا اظہار کیا تھا ۔ (ب ۔ پ)

سے زیادہ کی مستحق ہے سرسٹاین کو چند ملاقاتوں کے دوران معلوم ہوا کہ پنڈت گوبند کول کو آثار قدیمہ کے علم سے کس قدر شغف تھا اور وہ کس قدر قدامت شناس تھے۔ شاید انہی ملاقاتوں نے سرسٹائن کو کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کے ترجمے اور تفسیر کی طرف متوجہ کیا۔ وہ گوبند کول کی عالمانہ اور باوقار شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"میں ان کی (پنڈت گوبند کول کی) باوقار شخصیت سے بے انتہا متاثر ہوا کہ اس میں ہندوستان کے علم و فضل اور شرافت نفسی کا امتزاج شامل تھا..... ہم نے ایک دوسرے کی صحبت میں جھیل ڈل کے اردگرد کے مقامات کا دورہ کیا۔ اس سے ہم کو ایک دوسرے کے تئیں سمجھنے کا موقعہ فراہم ہوا اور باہمی ہمدردی اور احترام کے جذبات نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا"۔

ان چند ملاقاتوں نے دو عالموں کو نہ صرف ایک دوسرے کا قدردان بنا دیا بلکہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کا دوست بھی بنا دیا۔ چنانچہ اس کے بعد ہی پنڈت گوبند کول پاٹھشالہ کی دنیا سے نکل کر سرسٹاین کے پاس لاہور چلے گئے اور ان کی ملازمت قبول کر لی۔

سرارل سٹاین اور پنڈت گوبند کول کا ساتھ گوبند کول کے انتقال تک گیارہ برس رہا۔ وہ دونوں مشترکہ طور پر ایک عظیم کارنامے کی تکمیل میں مصروف رہے۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب جون ۱۸۹۹ء میں پنڈت گوبند کول سورگ باش ہو گئے۔ اس دوران سرسٹاین کے تاریخی کارنامے کی تکمیل ہوئی اور وہ یورپ چلے گئے۔ پنڈت گوبند کول نے بھی مہاراجہ پرتاب سنگھ کے پرائیویٹ سٹاف میں ملازمت شروع کی۔ لیکن دوستی اور رفاقت کے جس جذبے اور احساس

سے ان دو عالموں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا، وہ بندھن ان کے جیتے جی نہ ٹوٹا اگرچہ گووِند کول کو کئی ہفت خواں طے کرنا پڑے۔

سر سٹائن نے راج ترنگنی کے ترجمے اور تفسیر کے دیباچے میں پنڈت گووِند کول کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس کا مطالعہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

- "یہ باکمال کشمیری عالم جس نے میرے بعض ایسے تنقیدی مواد کو اکٹھا کرنے میں مدد کی تھی جو سنسکرت متن والی میری راج ترنگنی کے ایڈیشن میں شامل ہیں، بدستور ان برسوں میں میرے منشی کی حیثیت سے کام کرتا رہا جب میں اس کے ترجمے اور تفسیر لکھنے کے کام میں مصروف تھا۔"
- "کلہن کی ان بے شمار تلمیحوں کی نشاندہی جو مہابھارت اور پورانوں کی کہانیوں میں شامل ہیں، اُن کا ہی (پنڈت گووِند کول کا) کام ہے"۔
- "یہ میری خوش بختی تھی کہ میں اپنی بہت سی تحقیق و تلاش اور خاص طور سے ایسی معلومات جو پنڈت روایات کے ساتھ وابستہ ہیں اور وہ رسم و رواج جو برہمنوں سے متعلق ہیں، اپنے مرحوم دوست پنڈت گووِند کول کی مدد سے حاصل کر سکا......... ان کی قدیم دنیا کی روایات اور علم و فضل کے خزانوں کے دروازے میرے لئے ہمیشہ وا تھے"

یہ ارل سٹاین کا عجز نہیں بلکہ علم وفضل کی بارگاہ میں ایک سچے عالم کا اعتراف عظمت ہے۔ اس سے نہ صرف پنڈت گوبند کول کی عظمت کا احساس ہوتا ہے بلکہ خود سر سٹاین کے بیدار ضمیر اور روشن دماغ کا بھی احساس ہوتا ہے جن کے یہاں علم اور تحقیق تپسیا اور تیاگ کا درجہ رکھتی تھی۔

سر سٹاین نے کشمیر میں اپنا مستقر موہند مرگ مقرر کر لیا تھا یہیں اس مرگ کی پہاڑوں سے ڈھکی ہوئی تنہائیوں میں اپنی تحقیق اور تلاش کو سنوارتے تھے۔ راج ترنگنی کی تفسیر اور ترجمے کے علاوہ انہوں نے وسط ایشیا اور دوسرے مقامات کے آثار قدیمہ سے متعلق کھوج کے نتائج اسی مرگ کی خاموشیوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچائے تھے۔ اسی دوران انہیں کشمیری زبان سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اس کے لسانی خدوخال نے ان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اسی زمانے میں حاتم نام کے ایک تیلی سے ان کی ملاقات ہوئی جو موہند مرگ کی بلندیوں کو طے کرتے ہوئے سر سٹاین اور ان کے دوست پنڈت گوبند کول سے کئی بار ملا۔ حاتم پانزل کا ایک معمولی کسان تھا۔ وہ ایک پیشہ ور داستان گو بھی تھا۔ اس کے سینے میں لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کا نہ ختم ہونے والا خزانہ دفن تھا۔ سر سٹاین "حاتم کی کہانیاں" کے دیباچے میں حاتم کے حیرت انگیز حافظے کی داد دیتے ہیں جو بقول ان کے ساتھ رہا اور اپنے حافظے کی کتاب ان کے لئے کھلی رکھ دی۔ سر سٹاین یہاں بھی پنڈت گوبند کول کی نہ ٹوٹنے والی ہمت اور حوصلے سے فیض یاب ہوتے رہے جو ان کے ساتھ ساتھ حاتم کی کہانیوں کو سنتے تھے اور انہیں ضبط تحریر کرتے تھے۔

اس زمانہ میں سر جارج گریرسن نے کشمیری زبان سے متعلق لسانی تحقیق کا آغاز کیا تھا۔ اس میں ایک دوسرے عالم پنڈت ایشر کول کے کارناموں کا خاص دخل رہا ہے۔

پنڈت الشر کول، گوبند کول کے گہرے دوست تھے۔ انہوں نے کشمیری زبان کی ڈکشنری
مرتب کی تھی جو مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ سر جارج گریرسن کے کارناموں میں اس ڈکشنری کی
تکمیل بھی ہے جس کے نامکمل حصے کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے گوبند کول کی خدمات
حاصل کی گئی تھیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ پنڈت گوبند کول اپنے دوست کے
علم و فضل کے معترف ہونے کے باوصف ان کی بعض توجیہات کی طرف مشکوک
نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اے وائے! قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ پنڈت گوبند کول
سر جارج گریرسن سے ملنے کے لئے شملہ گئے۔ اس سے قبل وہ سر سٹائن سے لاہور
میں ملنے گئے تھے۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ شملہ میں پنڈت گوبند کول موکہ بخار
میں مبتلا ہو گئے۔ لیٹے تو یہ بخار جان لیوا ثابت ہوا۔ کوئی علاج کارگر ثابت
نہ ہوا، اور (جون - ؟) ۱۸۹۹ء میں وہ سورگباش ہو گئے۔

اُن کے چلے جانے پر سر ارل سٹائن جو انہیں "شاردا کی سرزمین کی
بصیرت افروز روایات کو زندہ رکھنے والا" کہا کرتے تھے، آٹھ آٹھ آنسو روتے
ہیں اور کہتے ہیں:

"مجھے جون ۱۸۹۹ء میں یہ المناک خبر ملی کہ میرا بہترین ہندوستانی
دوست اس جنم میں کسی بھی دوسری ملاقات کی امید کے بغیر رخصت
ہو چکا ہے۔"

اپنے عزیز دوست کے رخصت ہونے کے بعد سر سٹائن قریباً چوالیس سال[۴۴]
زندہ رہے۔ وہ ہر سال کشمیر آتے رہے اور ہر سال ہی موہند مرگ کے تیرا اسرار
سناٹوں میں پوری پوری گرمیاں گزارتے رہے۔ یہیں انہوں نے پنڈت گوبند کول
کی صحبت میں حاتم کی کہانیاں سنی تھیں۔ یہیں گوبند کول کی رفاقت میں انہوں
نے راج ترنگنی کی تفسیر لکھی اور اس کا ترجمہ کیا تھا۔ پنڈت گوبند کول، سر سٹائن

سے عمر میں پندرہ سولہ سال بڑے تھے ۔ وہ ہمیشہ انہیں اپنے بزرگ کی طرح عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ لیکن یہ صرف سن و سال کی بزرگی نہیں تھی ۔ وہ ان کے علم و فضل اور انکی ذہانت اور ذکاوت کے بھی قائل تھے ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ لول کشمیر کے عظیم کلچر اور اس کے شاندار ماضی کے عاشق تھے ۔ یہی سبب ہے کہ سر ارل سٹائین نے اس عظیم کشمیری کی رفاقت میں ہمیشہ ہندوستان کے ماضی کو اپنے وجود پر سایہ فگن پایا ۔ یادوں کی اس گھنیری اور رسیلی چھاؤں کا ذکر کرتے ہوئے سر سٹائین لکھتے ہیں :-

"جب کبھی پنڈت گوبند کول میرے ساتھ ہوتے تھے ۔ خواہ وہ میرے محبوب کشمیری پہاڑوں کی بلند و بالا خاموشیاں ہوتیں یا لاہور کی محنت کی دھول بھری جلاوطنی ۔ میں ہمیشہ ماضی کے ساتھ ایک زندگی آمیز لمس محسوس کرتا تھا جو تاریخ ہندوستان کے ساتھ دلچسپی رکھنے والے کسی بھی طالب علم کے لئے باعث سعادت ہے ...."

پنڈت گوبند کول کو ایک بار سر سٹائین نے "کلہن ثانی" کہا تھا اور اس توصیف و تحسین کو جذباتیت کہہ کر رد نہیں کیا جا سکتا ۔



کتابیات نامہ :

* IN. MEMORIAM PANDIT GOVIND KAUL
by
SIR AUREL STEIN
(1923)

★ KALHANA'S RAJTARANGINI VOL: I
by
M. A. STEIN (1979)

★ A HISTORY OF KASHMIR
by
P. N. K. BAMZAI (1962)

★ کشمیر میں اردو (دوسرا حصہ)
از
پروفیسر عبدالقادر سروری (1982)

★ ترجمہ کا فن اور روایت
مرتبہ
ڈاکٹر قمر رئیس (1976)

★ جلوۂ صد رنگ
از
ڈاکٹر برج پریمی (1984)



بدری ناتھ کلّا

مکند رام شاستری

ایک زمانے میں کشمیر سنسکرت ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے علمائ، فضلائ، مُصنفین اور فلسفیوں کو جنم دیا جنہوں نے اس وقت کے ہندوستان میں نام کمایا اور اپنے لئے جگہ بنائی۔ شاید اسی لئے کشمیر کو شاردا پیٹھ (SEAT OF LEARNING) بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں سے لوگوں کو علم کا نور ملتا تھا جو اندھیرے اور جہالت کی بیخ کنی کر دیتا تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی علم کی اس روشنی میں کچھ کچھ کمی واقع ہوتی رہی لیکن ہر زمانے میں پھر بھی علم کے چراغ روشن ہی رہے۔

وسطی دور (MEDIAEVAL PERIOD) میں یہاں بڑے بڑے اور عظیم مؤرخ پیدا ہوئے جنہوں نے کلہن پنڈت کی "راج ترنگنی" کے مطابق راج ترنگنیاں لکھیں۔ ان میں جون راج، شری ور، شُک اور پراجیہ بھٹ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اسی دور میں جگدھر بھٹ نے "ستُتی کُسمانجلی" لکھی۔ اُن کے بعد کے زمانے بھی اس قندیل کو روشن کرتے رہے۔

ڈوگرہ عہد میں سنسکرت علماء کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی خاص کر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں۔ اسی عہد میں ایشور کول، مکند رام شاستری، پنڈت مدھ سودن کول شاستری شری گوبند رازدان، شری ہر بھٹ شاستری، جیوتشی کیشو بھٹ، شری رام ناتھ کلار شاستری اور شری بلجی ناتھ پنڈت (جو ابھی بقید حیات ہیں) جیسے مشہور سنسکرت عالم پیدا ہوئے۔ ان ودوانوں کی ادبی خدمات کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بھلایا جا سکتا ہے۔ انہی روشن ستاروں میں مکند رام شاستری بھی شامل ہیں جن کا نام نہ صرف ریاست میں بلکہ بیرون ریاست اور یورپ میں احترام سے لیا جاتا ہے۔ یورپ میں اُن کا نام ان مصنفین کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے جنہیں کلاسیکل زبانوں (سنسکرت، عربی اور فارسی) کے علاوہ تبتی پر بھی عبور تھا۔

مکند رام سٹھو بربرشاہ سری نگر میں ۱۹۱۷ بکرمی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گاشہ بھٹ اپنے زمانے کے ماہر کرم کانڈ اور جوتشی تھے۔ مکند رام کا ایک بھائی بھی تھا، کنٹھ کاک۔ نامساعد حالات کی وجہ سے گاشہ بھٹ اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم نہ دے سکا۔ مکند رام بچپن سے ہی بے حد ذہین تھا اور اسے پڑھنے لکھنے کا کافی شوق تھا۔ وہ بچپن میں سٹھو میں واقع ایک مقامی پاٹھ شالہ میں پڑھنے لگا اور بہت کم عرصہ میں اس نے وہاں پر سبھی شاستروں کا مطالعہ کیا۔

سری نگر میں رنبیر گنج نامی ایک محلے میں پنڈت رام جو دور نے ۱۹۴۷ بکرمی میں ایک دارالترجمہ قائم کیا تھا۔ مکند رام اس دارالترجمہ میں کام کرنے لگا۔ اُسے ماہانہ بیس روپے ملتے تھے۔ دارالترجمہ میں عربی اور فارسی مسودات اور کتابوں کا سنسکرت زبان میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ مکند رام نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے یہاں کئی اچھے ترجمے کیے۔ چھٹیوں کے دنوں میں وہ مقامی پنڈتوں کے پاس جاتا اور شو فلسفہ پر ان سے درس لیتا۔ اس نے اس فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کی

امٹ چھاپ اس پر پڑی۔ جن پنڈت صاحبان سے وہ درس لیتا رہا انہوں نے جب سنسکرت ادب سے اس کی گہری دلچسپی اور اس زبان میں اس کی مہارت کو محسوس کیا تو انہوں نے اس کی پوری پوری مدد کی جس سے اسے آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ بعد ازاں اس نے پنجاب یونیورسٹی سے شاستری (HONOURS IN SANS-KRIT) کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

۱۹۳۸ بکرمی میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ جموں سے کشمیر آئے۔ وہ تبتی زبان میں لکھے گئے تنجور اور کنجور نامی کتابوں کا ترجمہ سنسکرت زبان میں کروانا چاہتے تھے۔ جموں و کشمیر سرکار نے ترجمہ کی سہولت کے لئے ایک لاما گرو شری تھامس تنبول کو مقرر کیا تھا، کیوں کہ کوئی اور تبتی زبان سے واقف نہ تھا۔ اسی لاما گرو سے مکند رام نے تبتی زبان سیکھی۔ اس دوران اسے ماہانہ ۱۵ روپے دئے جاتے تھے۔ تبتی زبان سیکھ لینے کے بعد وہ ان کتابوں کا ترجمہ کرنے لگا۔ اس کے ترجمہ اور اس کی قابلیت سے خوش ہو کر مہاراجہ نے اسے تینتیس روپے بطور انعام دئے۔ ۱۹۳۸ بکرمی میں ہی مہاراجہ نے اس کے مشاہرے میں پانچ روپے کا اضافہ کیا اور لاما گرو کے ساتھ اسے کشتواڑ اور پاڈر جانے کا حکم دیا لیکن اپنے والد کے کہنے پر نہ جانے سے معذوری ظاہر کی جس کی پاداش میں اسے ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔ اس زمانے میں اچھی ملازمت ملنا آسان نہ تھا۔ کچھ عرصہ بےکاری میں گذارنے کے بعد مکند رام نے سی۔ ایم۔ ایس سکول، فتح کدل میں بحیثیت سنسکرت معلم کے ملازمت اختیار کی۔ ان دنوں اس نے اچھا خاصا نام کما لیا تھا۔

۱۸۸۸ء میں اورینٹل کالج، لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر ایم اے سٹین سنسکرت مسودات و مخطوطات کی تلاش و تحقیق میں کشمیر آئے تھے۔ وہ ان پر کام کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ اسی زمانے میں کلہن کی "راج ترنگنی" کے ٹیکسٹ (TEXT) کو ایڈٹ کر کے

انگریزی ترجمہ کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے۔ یہ اچھا خاصا مشکل کام تھا۔ انہوں نے مقامی سنسکرت علمائے سے بھی اس کام کو انجام دینے میں مدد لی۔ مکند رام سے بھی انہوں نے مدد لی اور اس کی قابلیت سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اس دوران مکند رام نے سکول کی ملازمت چھوڑ دی اور سٹین کے ساتھ کام کرنے میں مگن ہو گیا۔ سٹین نے اس کی تنخواہ ۱۵ روپے ماہانہ مقرر کی۔ اسے سٹین کے ساتھ لاہور بھی جانا پڑا۔ سٹین نے ایک جگہ اُس کے کام اور محنت کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے:-

"I have received equally useful assistance for the first half of the text from a younger kashmiri Scholar, Pandit Mukund Ram, who also prepared under my directions provisional indices to the Rajtarangini of which I have availed myself with advantage when revising the text of cantos VII and VIII. I am indebted to both scholars for much information on kashmirian topics without which a correct Comprehension of kalhana's text is untainable and I gladly take this opportunity to thank them publicly for the unflagging zeal and industry which they have shown in collecting it. I trust that the services that they have rendered to all students of the chronicals of kashmir will meet due recognition in their own country."

سر جارج ابراہم گریرسن نے بھی مکند رام کی سنسکرت شناسی، قابلیت اور تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ انہوں نے اسے سو روپیہ ماہانہ پر اپنے پروجیکٹ سے وابستہ کر لیا۔ وہ تقریباً پندرہ سال تک اُن کے ساتھ کام کرتا رہا۔ کشمیری ڈکشنری کی چار

جلدیں جرائیشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے شائع کیں، میں مکند رام کا contribu-
tion کافی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس کے اشتراک کے بغیر اس فرہنگ کا مکمل
ہونا ناممکن تھا تو غلط نہ ہوگا۔ ذخیرہ الفاظ جمع کرنے کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں
اس نے کشمیری الفاظ کو ترتیب دیا اور ہر کشمیری لفظ کا ترجمہ سنسکرت میں کیا۔ اس
نے کشمیری زبان کی مخصوص آوازوں کو پوری طرح ادا کرنے کی صلاحیت کے پیش نظر
دیوناگری رسم الخط کو اس فرہنگ میں برتا۔ سورگیہ ایشور کول کے "کشمیری شبد امرتم"
(کشمیری گرامر) کے علاوہ "للہ واکھیانی" کی درستی میں بھی اس نے گریرسن کی کافی مدد کی۔

کچھ عرصہ بعد جب ریاستی سرکار نے ریسرچ محکمہ کا قیام عمل میں لایا تو اس
کے افسران نے مکند رام کو بھی کسی اچھے عہدے پر مامور کرنے کا فیصلہ کیا لیکن سٹین
نے اسے لاہور میں اس اسامی پر کام کرنے کی اجازت نہ دی۔ سٹین کے انتقال
کے بعد وہ پنڈت دیاکرشن کول (گورنر کشمیر بعہد مہاراجہ پرتاپ سنگھ) کے اصرار پہ
اس محکمہ میں ملازم ہو گیا اور بحیثیت ہیڈ پنڈت یہاں کام کرنے لگا۔ اس وقت
بنگال کے مشہور سنسکرت ودوان جے سی چیٹرجی اس محکمے کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اُن کے
چلے جانے پر اسے ہی آنیسرانچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح اسے سنسکرت کے قدیم مسودات و
مخطوطات کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ اس دوران اس نے شیو فلسفہ وغیرہ سے متعلق
بہت سے مخطوطات کی اصلاح کی اور سنسکرت میں ان کے دیباچے لکھ کر انہیں محکمہ
ریسرچ کی طرف سے شائع کروایا جن میں سے چند ایک کا نام یہاں پر درج کیا جارہا
ہے:

(۱) شوسوترہ ومرشنی (۲) شوسوترہ وارتکم (۳) سپند ورتی (۴) پرمارتھ سار
(۵) وگیانہ بھیرو (۶) شٹ ترم شت تتو سندوہ (۷) لگھو پنچکہ وشکا
(۸) پراپرشوڈ ستاکا (۹) جنم مرنہ وچار (۱۰) تنتر سار (۱۱) تنتر لوکہ (دو جلدیں)

(۱۳) پرشنہ بھجیاہیرزیم (۱۳) شوسوسرزرتی (۱۴) الیشورپرتیہ بھجیاومرشنی

(۱۵) سپندسندوہ (۱۶) پراتر مشکا۔ وغیرہ

سنسکرت زبان پر عبور ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی مادری زبان کشمیری کا بھی شیدائی تھا اور اسے اس کے ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ سب سے پہلے اس نے شتی کنٹھ کی "مہانے پرکاش" کو ترتیب دیا جو آج بھی کشمیری ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ "شوپرنئے" کی ترتیب اور سنسکرت میں اس کے حواشی لکھ کر اسکی اہمیت بڑھائی۔ اور اس کی ترتیب و تدوین کے دوران ہی اس کا دیہانت ہوگیا۔

۱۹۶۸ بکرمی میں جارج پنجم کی تاج پوشی کے موقعہ پر سنسکرت ادب کے تئیں اس کی خدمات کے پیش نظر ہندوستان کے گورنر جنرل ہارڈنگ نے (1912ء میں) اُسے "مہامہوپادھیائے" کے خطاب سے نوازا۔ وہ ریاست جموں وکشمیر کے پہلا اور آخری شخص تھا جسے یہ خطاب ملا۔

مکندرام ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد بھی سنسکرت ادب کا مطالعہ کرتا رہا اور جو لوگ اس کے پاس مختلف معاملات میں اس کی رہبری چاہتے انکی رہبری کرنے میں وہ خوشی محسوس کرتا۔ ۱۹۷۵ بکرمی میں سنسکرت کا یہ نامور ودوان اس دارِفانی سے چل دیا۔ اس کی خدمات کے پیش نظر اس کی بیوہ کو بھارت سرکار کی طرف سے ۱۹۴۰ء تک مالی امداد ملتی رہی۔

پنڈت مکندرام نے اپنے ہم وطنوں یا ہندوستان میں رہنے والوں کو ہی نہیں بلکہ بہت سے غیر ملکیوں کو بھی سنسکرت زبان سے آشنا و متعارف کرایا۔ اس کے خاص شاگردوں میں ڈاکٹر ارنالڈ ولیم سٹریٹن کا نام بھی شامل ہے جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا۔ اس نے اپنی تصنیف "LETTERS FROM INDIA" میں اس کے بارے میں لکھا ہے:۔

"I am fortunate having with me a Pandit (M.M.) who has performed sanaskaras and yet is a well trained Scholar and helped Dr. Stein and Grierson" —— P. No 307.

پنڈت مکند رام نے جس جس بدیشی عالم کے ساتھ کام کیا اس کا دل موہ لیا ۔
یورپین عالم اس کی ذہانت، قابلیت اور اس کی محققانہ نظر کے معترف تھے اور انہوں
نے برملا اس کا اعتراف کیا ہے ۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات ،

"It gives me great pleasure to testify the splendid services which Pandit Mukund Ram Shastri Mahamahopadhyaya has rendered to the cause of Archaeological Research in India. From time to time he has worked with various officers of my Deptt. namely with Sir Aurel Stein, Dr. Stein Konow, Dr. Spooner and Prof. Hultzch and has been of inestimable help to them in many ways. I can safely say that there is no pandit in India of whom I have heard such consistent and such high praise from all with whom he has come in contact."

Simla,
19th May, 1915.

sd/- (Sir John Marshall)
Director General of
Archaeology in India



"My old friend, Mahamahopadhyaya, Pandit Mukund Ram Shastri tells me owing to his house having been burnt

down most of his papers have been destroyed, and asks me for another certificate. I have much pleasure in giving it to him. It has been my privilege to count him as my friend and fellow worker for some thing like twenty years, I have a high opinion of his attainments, and value greatly the help that he has from time to time given to me and other students of oriental subjects. His erudition as a Sanskrit Scholar has been recognised by the Govt. of India which has conferred upon him the title of Mahamahopadhyaya and my own experience has shown me that he is specially versed in the departments of Kavya and grammar. He has an intimate knowledge of the ancient history of kashmir and has given valuable help in deciphering old inscriptions that presented considerable difficulties.

His Knowledge of Kashmiri, his native language is profound. He has been of the greatest assistance to me in my studies of that language and has edited for me some valuable old kashmiri texts and provided them with Sanskrit translations. One of these the Sivaparinaya, is now being published by the Asiatic Society of Bengal.

He has also Collected many thousand Kashmiri words for me, and arranged them in slips for the preparation of the kashmiri dictionary

upon which I have been engaged for the past fifteen years. I cannot speak too highly of the zeal and efficiency with which he has carried out this work, in which he has combined the learning of a kashmiri pandit with the accurate methods demanded by modern European philology.

I wish him every prosperity, and can cordially recomment him to the Kind Consideration of any prosecuting oriental studies in kashmir.

England
June 10th, 1915.

sd/-
Sir George A Grierson,
K.C.I.E.
Supdt. Linguistic Survey of India.



"Pandit Mukund Rum, son of Pt. Gwasha Bhatta of Srinagar, has been known to me since my first kashmir tour in 1888 as a good sanskrit scholar. In october 1891 he accompanied me to Lahore and has since acted as my amanuensis. He gave me much help in connection with the printing of my edition of Kalhanas sanskrit chronicle of kashmir, the Rajatarungini in which I have been engaged for some time back, by collecting manuscripts and assisting in the poor reading. Pt. Mukund Ram's Knowledge of the sanskrit texts studied in Kashmir, is very respectable and he

possesses great aptitude for philological research on the lines of European sanskritists. I have found him most useful in supplying information about the traditions of the Srinagar Pandits and the old topography of Kashmir. I have felt great pleasure to acknowledge publicly the assistance he has rendered me and the cause of Sanskrit studies, in the preface to my forthcoming edition.

Pt. Mukund Ram will, I hope, continue to lend me his help towards the acquisition of Sanskrit manuscripts by which he has already earned the thanks of other Scholars like Dr. Hultzich, Epigraphist to the Madras Government.

I also earnestly wish that the services he has rendered to the study of the ancient history of Kashmir, will meet with due recognition in his own country.

Lahore
June 24th, 1894.

sd/- M. A. Stein, Ph. D.
Principal, Oriental
College, Lahore.

گریرسن اور سٹین کے علاوہ بھی کئی یورپین ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ کام کیا

اور اس کے علم و فضل اور اسکی بصیرت کے قائل ہو گئے۔ ان میں Dr. D. Brainad

T.W., W.C. Dunlop smith, Dr. E. Hultzich, Spooner

Dr. Stein · Konow, Arnold وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔



محمد یوسف ٹینگ

اللہ رکھا ساغر

تاریخ : یکم مارچ ۱۹۸۳ء

مقام : لیاقت روڈ ۔ راولپنڈی، پاکستان

میں اسلام آباد میں اسلامی یونیورسٹی، نیشنل آرکائیوز آف پاکستان، پاکستان سائینس فاؤنڈیشن اور ادارۂ ادبیات پاکستان کی سیر کر کے تھکا ماندہ اپنے میزبان خواجہ عبدالصمد وانی، مدیر ہفت روزہ 'کشمیر' کے دفتر پہنچا تو انہوں نے اپنی خاص مسکراہٹ سے معمول کے مطابق کرسی سے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔ لیکن انکی روایتی اور مانوس مسکراہٹ کے کناروں میں مجھے جیسے گلاب کے دو تازہ غنچے کھلے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے روا روی کے عالم میں کہا:

"ساغر صاحب نے خلاف معمول اور خلاف توقع آپ سے ملنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ چلیئے وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

اب میں وانی صاحب کی پہنی ہوئی مسکراہٹ کا سبب جان گیا تھا۔

بات یہ ہے کہ جس زمانے میں میں پاکستان گیا وہاں ہماری تحریک آزادی کی پہلی صف کے رہنما اپنی آنکھوں میں اپنے گل زمین وطن کے خواب اور اپنے دلوں

میں نہ جانے کتنے زخموں کی بہار لئے ہوئے گمنامی کی چادر تان کر سو چکے تھے۔ صرف دو تین نام ایسے تھے جو اس لٹے ہوئے قافلے کے نشانات کی حیثیت سے یاد آتے تھے یعنی سردار گوہر رحمٰن، شیخ عبدالحمید وکیل اور اللہ رکھا ساغر۔ ان میں سے پہلے دو اُن گیارہ نمائندوں میں شامل ہیں جنہیں جون ۱۹۳۱ء میں خانقاہ معلیٰ کے اہم جلسے میں مسلمانانِ جموں وکشمیر کی نمائندگی کے لئے چنا گیا تھا جس کے رسمی خاتمے کے بعد عبدالقدیر نے وہ انگارے بکھیرے تھے جن کے پیدا کئے ہوئے شعلے ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے شہیدوں کے دلوں کی دھڑکن بن کر گونجے اور جن کی بازگشت آج بھی فضاؤں میں موجود ہے۔ بقول شاعر ؎

پھول باقی نہیں خوشبو کا سفر جاری ہے

لیکن یہ دونوں حضرات اُن دنوں بھی اس حد تک گمنام بن چکے تھے کہ یہ شعر یاد آتا تھا ؎

ہم سا بھی کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

اس 'نایافت' کا ثبوت وہ تقریر تھی جو ان کے ہم سفر اور ہم عصر شیخ محمد عبداللہ نے بہت عرصہ پہلے مجاہد منزل میں کی تھی، اور جس میں انہوں نے کہا تھا:۔

"گیارہ نمائندوں میں سے اب صرف میں اس سرائے فانی میں باقی رہ گیا ہوں۔ انشاء اللہ میں ہی وطن کی آزادی کی بشارت لے کر جاؤں گا اور اُن پاک ارواح کو سناؤں گا"۔

البتہ اللہ رکھا ساغر اب بھی ایک سرکش شعلے کی طرح ذہنوں میں لپکتے تھے۔ کشمیر کی تحریک آزادی میں مولانا محمد سعید مسعودی کے بعد وہ سب سے زیادہ پُراسرار اور اُن سے زیادہ کنٹروورشل کردار ہیں۔ وہ مولانا سے عمر میں چھوٹے ہیں اور ان کے سیاسی جونیئر بھی۔

لیکن دونوں میں کچھ ایسی خوبیاں مشترک ہیں کہ ان کی یاد ذہن میں پہلو بہ پہلو ابھرتی ہے۔ دونوں بہت اچھے خطیب ہیں اور بہت اچھے ادیب بھی۔ دونوں اردو زبان کے بہت اچھے صحافی ہیں اور اپنی اپنی جماعتوں کے ترجمان رہ چکے ہیں۔ اگر شیخ محمد عبداللہ کی کچھ ابتدائی مگر اہم تقریریں دراصل مولانا مسعودی کے قلم سے نکلی ہیں، تو اسی طرح چوہدری غلام عباس کی اکثر تقریریں اللہ رکھا ساغر کی لکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ خود شیخ محمد عبداللہ کا خیال تھا کہ چوہدری صاحب کی خود نوشت سرگذشت "کشمکش" دراصل ساغر کے ہی نیستاں کی فصل ہے۔ راقم نے جب ساغر صاحب کی لکھی ہوئی بعض تحریرات کو "کشمکش" کے طرز انشاء سے ملایا تو اسلوبیاتی تقابل اور ساغر کی مرغوب لفظیات کی تکرار سے مجھے اس رائے میں بڑا وزن نظر آیا۔ حالانکہ عباس اور ساغر کے بہت سے جاننے والوں کا خیال اس کے الٹ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "کشمکش" بیسا جو سیدھا سادا، سطحی مگر بے لاگ انداز نظر آتا ہے۔ وہ عباس کی شخصیت کی بوباس لئے ہوئے ہے۔ ساغر نے کتاب لکھی ہوتی تو ان کے ذہنی گرداب کا عکس اس میں ضرور ہوتا اور یہ اکاس بیل کی طرح پیچ در پیچ ہوتی۔ بہرحال مولانا مسعودی اور ساغر دونوں اقبال کے گرویدہ ہیں اور دونوں اپنی پُر لطف بات چیت میں برمحل اردو اشعار کا استعمال کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۸۲ء میں جب میں پاکستان پہنچا تو ساغر صاحب سیاست کی انجمن آرائی کو خیرباد کہہ کے اپنی ذات کی خلوت میں قلعہ بند ہو گئے تھے اور بہت کم لوگوں سے ملتے تھے۔ بلکہ سرحد کے اس پار کے بہت سے ملاقاتیوں کو انہوں نے مایوس کر کے واپس لوٹا دیا تھا۔ میں نے جب ہانی صاحب، جو راولپنڈی میں سرحد پار سے آنے والوں کے لئے اپنے دولتکدے کو "کشمیر غریب مسلم ہوٹل" میں تبدیل کر چکے ہیں، سے درخواست کی کہ وہ ساغر صاحب سے میری ملاقات کا انتظام کریں تو وہ اپنی بے پناہ مروت میں تو مان گئے۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ صرف ایک رسم نبھانے کی توقع رکھتے ہیں۔

اب اچانک اس دیوار میں شگاف ہو گیا تو جیسے والی صاحب کے لئے کوئی انہونی بات ہو گئی تھی ۔ ہم جلدی جلدی چلے ۔ ساغر صاحب کی قیام گاہ سڑک کے اس پار کوئی سوا ایک گز کے فاصلے پر تھی ۔ ہم وہاں پہنچے، تو والی صاحب نے سلام کیا۔

میں نے موٹے شیشے کی عینک پہنے ہوئے ایک دراز قد مگر چھریرے بدن کے آدمی کو دیکھا ۔ سر پر قراقلی، شیروانی زیب تن اور چہرے پر ایک عجیب مگر متاثر کن رعونت ۔ ساغر صاحب کے فرزند وہاں کاغذ کا کاروبار کرتے ہیں۔ کوٹھی کے باہر ایک دکان میں کاغذ کے کچھ گٹھے نظر آئے۔ ساغر صاحب کا کبھی کوٹھی کے اندر دل اوب جاتا ہے تو وہ دکان پر براجتے ہیں۔ لیکن کاروبار کی خشکیات میں نہیں الجھتے ۔

والی صاحب نے میرا تعارف کرایا تو ساغر صاحب اٹھے اور کہا: "چلئے ۔ اندر چلتے ہیں ۔ وہیں بات ہوگی" ۔ دکان کے ساتھ ایک کوچہ سا تھا ۔ اندر انگنائی کے ایک طرف انہوں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا ۔ عمدہ فرنیچر سے آراستہ ڈرائنگ روم میں، میں اپنی عادت کے مطابق سب سے آرام دہ کرسی پر بیٹھ گیا ۔

ساغر صاحب نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ میری بصارت میں فرق آگیا ہے ۔ بہت سے علاج کئے ۔ لیکن افاقہ نہیں ہوا ۔ اس لئے بہت کم دوستوں سے ملتا ہوں ۔ لیکن نہ معلوم آپ کا نام سن کر کیوں ملنے کی خواہش ہوئی" ۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ اپنے پھوہڑپن میں حملہ کر دیا "جناب — اس کا کریڈٹ تو مجھے ہی ملنا چاہیئے" ۔

اس سے پہلے کہ ساغر صاحب کوئی تکلف آمیز جملہ کہہ دیتے، میں کہتا گیا:

جذبۂ دل جو سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

دراصل میرا اشتیاق اتنا تھا کہ آپ بھی اس کی گرفت میں آگئے" —

ساغر صاحب کے کھینچے ہوئے چہرے کے تنے ہوئے خدوخال پسیج گئے اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ جیسے گہرے بادلوں میں ایک کرن کی طرح باہر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ لیکن ہانی صاحب کی نستعلیق طبیعت میں وسوسے اُبھرنے لگے۔ بولے:

"ٹینگ صاحب آپ کے بڑے مداح ہیں۔ آپ کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں"۔

ساغر نے کہا "ہماری تحریریں تو کیا ہیں ۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لیکن میں نے تو اب اپنے قلم کے ساتھ اپنا قلمدان بھی سمیٹ لیا ہے۔ میں تو اب بس یہی چاہتا ہوں کہ لوگ اب ہم کو بھول ہی جائیں"۔

ساغر پھر اپنی خلوت کی اوٹ میں پناہ لینا چاہتے تھے جو مجھے راس نہیں آتا تھا۔ میں نے کہا:

"ساغر صاحب۔ جموں کی یاد آتی ہے کبھی آپ کو..... یہاں کیسا لگتا ہے"؟

ساغر کو جیسے جھرجھری سی آگئی، جیسے بے بسی کے عالم میں کہہ رہے ہوں:

ع وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے

لمبی آہ بھر کر کہنے لگے: "ہم جموں سے نکلے نہیں بلکہ نکالے گئے ہیں۔ اور جنّت گمشدہ میں لوٹنے کی حسرت میں ہی آدم اور آدم زاد یہ ہنگامہ بپا کئے ہوئے ہیں"۔

میں اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا کہ میں نے ان کے زرہ بکتر کا شگاف تاک لیا ہے۔ اب بچ کے کہاں جائیں گے؟

میں نے پوچھا کہ تقسیم ملک کے وقت آپ کہاں تھے؟

ساغر بولے: "میں کٹھوعہ جیل میں پڑا ہوا تھا"

میں نے پوچھا کہ پھر آپ پاکستان کیسے آگئے؟

ساغر بولے "اُن ہی دنوں ایک دن جیل میں خبر پہونچی کہ وزیر اعظم یہاں

آرہے ہیں۔ جیل میں کھلبلی پڑ گئی۔ کمرے کمرے ــــ کمرہ کیا تھا، ایک میلی کچیلی اندھیری کوٹھڑی تھی۔ میں خاص طور رضاعی کا انتظام ہونے لگا ــــ میں نے جیلر کو پکار کر کہا "بھیئے۔ تمہیں اپنا مستقبل روشن کرنے کے لئے جو سبیل بھی کرنا ہے کرو۔ میں شیخ صاحب سے ملنا نہیں چاہتا۔۔۔۔ اور اگر تم نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان دوں گا ــــ جیلر نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تو میں نے اُسے کہا "دیکھو بس مجھے کچھ ہوگیا تو خون تمہاری گردن پہ ہوگا۔ شیخ صاحب انعام واکرام کے بدلے تمہارا کام تمام کردیں گے"۔ چنانچہ شیخ صاحب آئے لیکن میں اپنی کوٹھڑی میں دروازہ بند کرکے پڑا رہا۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں"۔

میں نے سوال کیا: "شیخ صاحب کو ٹالنے میں آپ کا کونسا نفسیاتی اندیشہ کام کر رہا تھا؟"

ساغر بولے: "شیخ صاحب سامنے آتے تو ہم ضرور اُلجھ پڑتے اور میں اُس ناخوشگوار صورت حال سے پہلو بچانا چاہتا تھا ــــ بہرکیف۔ کچھ عرصے کے بعد ہمیں سوچیت گڈھ کے راستے پاکستان بھیج دیا گیا"۔

میں نے انہیں پھر اکسانا چاہا: "کیا آپ نے جموں جانے کا خیال ترک کر دیا ہے؟"
ساغر کی مسکراہٹ کھل اٹھی۔ کہنے لگے "جموں ہی نہیں سرینگر بھی ایک دن ہمارے آغوش میں ہوگا۔ میرے پیرو مرشد نے یوں ہی نہیں کہا تھا ع

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک"

اب ساغر پگھل گئے تھے اور گفتگو میں پہل کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں چائے آگئی۔ چائے کے دور کے ساتھ ساتھ باتوں کا رُخ بھی پلٹ گیا۔

"یوسف صاحب۔ میں اصل میں آپ ہی کی طرح کشمیر کی مٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا آبائی وطن بیجبہاڑہ ہے اور ہماری خاندانی ذات 'بٹ' ہے"۔

میں نے اُن کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "اب آپ کے التفات کا سبب کھل گیا۔ میں بھی توات کا بٹ ہوں۔ دراصل ہماری رگوں کے مشترکہ خون نے ہی اس ملاقات کو ممکن بنا دیا۔"

ساغر صاحب نے اپنے اجداد کے جموں میں انتقال کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے کاروبار میں بڑی وسعت پیدا کی اور پھر ہم اتنے بڑے صاحبِ جائیداد بنے کہ جموں کے اُردو بازار* کی بیشتر دکانیں ہماری ہی ملکیت تھیں۔" مجھے شرارت سوجھی اور گستاخی کے لہجے میں بولا:

"تو گویا آپ کا تخلص اسی باغ کا پھول ہے؟"

ساغر نے بُرا نہیں منایا۔ کہا: "ہاں بعد کے واقعات تو کچھ یہی ثابت کریں گے کیوں کہ سنا ہے کہ ؏

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھُٹا میرے بعد

اب وہاں بازار اور بازاری ہیں۔ صرف اُردو کو بن باس دیا گیا ہے۔"

ساغر صاحب کی بات میں کاٹ تھی۔ میں تلملا گیا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔

وہ اپنی سی کہتے گئے "اسی اُردو بازار میں مسلم کانفرنس کا دفتر تھا اور میرے اخبار 'جاوید' کا بھی۔ وہاں سے اخبار کا فائل لانے کی بھی مُہلت نہیں ملی۔"

ساغر اداس اداس سے نظر آنے لگے۔ میں نے گفتگو کا رُخ پلٹ دیا۔

"ساغر صاحب! اگرچہ آپ شیخ محمد عبداللہ کے شدید مخالفین میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن آپ بھی برسوں اُنکی قیادت میں کام کرتے رہے۔ شیخ صاحب میں کیا ایسی کیا بات تھی کہ دوسرے قائدین کا چراغ اُن کے سامنے نہ جل سکا؟"

ساغر نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا "شیخ صاحب کے گلے میں گھلاوٹ

---

* اب اس کا نام راجندر بازار ہے۔ یہ کبھی اور شہروں کے اُردو بازاروں کی طرح جموں کا بازارِ حُسن تھا۔

اور چاشنی تھی۔ وہ اقبال کا کلام سنانے لو جلسے پہ جادو کر دیتے۔ لیکن ایک بات اور ہے جموں میں ہم لوگ کشمیر سے پہلے سرگرم تھے۔ لیکن کشمیر میں اندھیرے کا احساس زیادہ ہوتا تھا"۔

میں نے پوچھا "جموں میں کیوں اُتنی گھٹن نہ تھی جبکہ شخصی نظام ایک تھا؟"

ساغر بولے "جموں ایک تو پنجاب سے جڑا ہوا تھا اور پنجاب میں انگریزی راج میں نسبتاً زیادہ آزادی تھی۔ یہ کرنیں کھلا کر ہی سہی جموں تک بھی پہنچتی تھیں اور جھٹپٹے کا سا عالم پیدا کرتی تھیں۔ لیکن پیر پنجال کو پار کرنے کے لئے روشنی کا ایک سیلاب چاہیے تھا۔ اور پھر جموں مہاراجاؤں کی بھومی بھی تھا۔ اور وہ بہال بھونچکرا اپنے آپ کو زیادہ محفوظ خیال کرتے تھے۔ شیخ صاحب بہر حال نئے خیالات کے آدمی تھے۔ چراغ اندھیرے میں چمکتا ہے جہاں روشنی ہو وہاں نہیں۔ کشمیر کے لوگوں نے اپنی زبان میں شیخ صاحب کے گلے سے آزادی اور انقلاب کی بات سنی تو وہ اُن کے گرد پروانہ وار گردش کرنے لگے"۔

میں نے اب ساغر صاحب کو اُن کے سیاسی کیریئر کے بھنور کی طرف لانے کی جسارت کی۔ کیونکہ دیر ہو رہی تھی اور ساغر صاحب گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرتے وقت شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ تھے۔ بلکہ آپ نے ۳۹ء کے پتھر مسجد کنونشن میں اس تبدیلی کے حق میں تقریر بھی کی تھی۔ پھر آپ کیوں جماعت کی رسی توڑ کر واپس مسلم کانفرنس میں چلے گئے"؟

ساغر صاحب جیسے کسی بڑے پتھر سے دوچار ہو گئے۔

"دراصل شیخ صاحب کا یہ فیصلہ کچھ اُن کی سیاسی مصلحت کا حصہ تھا اور کچھ اس میں پنڈت پریم ناتھ بزاز کے پرچار اور داؤ پیچ کا بھی حصہ تھا۔ مسلم کانفرنس میں جموں کے کارکنوں اور لیڈروں کا بڑا حصہ تھا جو تقریباً سب کے سب برعظیر کی مسلم

سیاست سے جڑے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب کو اس میں اپنی قیادت کے لئے اندیشہ ہائے دور دراز محسوس ہو رہے تھے۔ مسلم کانفرنس کے چھ سالہ قیام میں جموں کے دو لیڈر — شیخ عبدالحمید اور چوہدری غلام عباس — مسلم کانفرنس کے صدر رہ چکے تھے۔ بلکہ ایک وقت جب چوہدری صاحب صدر تھے تو شیخ عبداللہ اُن کے جنرل سیکریٹری تھے — شیخ صاحب اپنی CONSTITUENCY کی نئی ترتیب چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ پریم ناتھ بزاز نے بڑی ہی تدبیر اور تدّبر سے شیخ صاحب کو باور دلایا کہ اگر جموں و کشمیر میں صرف مسلم کانفرنس کام کرتی رہی تو کشمیر کی روایت کے علاوہ اس کے مستقبل کو بھی خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ اور جب شیخ صاحب کسی بات پر ڈٹ جاتے تھے تو انہیں وہاں سے ہٹانا آسان نہیں ہوتا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عمر کے مختلف ادوار میں مختلف رفیقوں کے اثر میں رہے۔ اور انہی کے کہنے پر عمل کرتے رہے۔ کبھی یہ مرزائی تھے، کبھی بزاز۔ کبھی کمیونسٹ جیسے کنور محمد اشرف اور بی پی ایل بیدی۔ کبھی جواہر لال نہرو تو کبھی مرزا محمد افضل بیگ"۔

ساغر صاحب پرانی یادوں کی لہروں پر بہتے جا رہے تھے۔ میں نے ان کو بریک لگادی۔

"کیا آپ پہلے سے ہی نیشنل کانفرنس کے حق میں تھے؟"

ساغر صاحب نے مجھے ٹوکا " میں کیا۔ بخشی غلام محمد اور مولانا محمد سعید مسعودی بھی مسلم کانفرنس کا نام بدلنے کے خلاف تھے۔ لیکن ورکنگ کمیٹی میں جس شخص نے شیخ صاحب کے منہ لگنے کی جرأت کی، وہ مولوی عبداللہ وکیل تھے۔ لیکن شیخ صاحب اور اُن کے ہمخیال نیشنل کانفرنس قائم کرنے کے حق میں اتنے مضبوط دلائل پیش کرتے تھے کہ اُن کا توڑ ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی"۔

میں نے پوچھا " مثلاً کون سی دلیل؟"

ساغر نے جواب دیا "مثلاً یہ کہ مظلوم صرف مسلمان نہیں، غیر مسلم بھی ہیں اور جموں میں اگرچہ مہاراجہ کے ہم نسب راجپوت مزے میں تھے۔ لیکن بہت سے ہندو اور خاص طور اچھوتوں کا بُرا حال تھا۔ اسی طرح یہ دلیل کہ جب تک فرقہ وارانہ بنیادوں پر تحریک چلیگی ہندوستان کی رائے عامہ کا بڑا حصہ مہاراجہ اور عوام کی اس کشمکش کو ہندو راج کیخلاف بغاوت کا نام دیتی رہے گی اور اس طرح ریاست کے عوام بڑی رائے عامہ کی ہمدردی کے بغیر اپنی منزل حاصل نہ کر پائیں گے۔ بہرحال۔ ورکنگ کمیٹی میں خاموش ہوجانے کے باوجود بخشی صاحب اور مسعودی نے مجھے لقمہ دیا کہ تم شیخ صاحب کے خلاف ڈٹ جاؤ۔ ہم تمہارا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ میں نے تجویز پیش کی کہ اتنا بڑا فیصلہ ضلع اور صوبہ کمیٹیوں سے استصواب کر کے لیا جانا چاہیئے۔ شیخ صاحب اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے خطرات سے آگاہ تھے اس لئے انہوں نے اس کو مسترد کر دیا۔ ورکنگ کمیٹی میں ووٹ لئے گئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بخشی صاحب اور مولینا صاحب نے استخارہ کئے بغیر شیخ صاحب کے ساتھ ووٹ دیئے"۔

میں نے سوال کیا "پھر آپ مسلم کانفرنس میں کیوں چلے گئے"؟

ساغر صاحب بولے: "یہ ایک طویل داستان ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ تبدیلی صرف ریاست کی حدود تک رہے گی بلکہ اس وقت باقاعدہ طور پر طے ہوا تھا کہ نیشنل کانفرنس کا کانگریس یا مسلم لیگ سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ لیکن بعد کے واقعات نے دکھا دیا کہ شیخ صاحب، پنڈت نہرو کے اثر و رسوخ میں آ کر کانگریس کیطرف کھنچتے جا رہے تھے اور پھر جموں کے لیڈروں کے تئیں اُن کا انداز بھی بہت سرد مہری کا تھا۔ شیخصاحب نے اشارہ دیا تھا کہ عباس کو نیشنل کانفرنس کا صدر بنایا جائیگا۔ مگر بعد میں یہ وعدہ پورا نہ ہوا"۔

اتنی دیر میں ساغر صاحب کے فرزند نے انہیں کسی قرابت دار کی آمد کی اطلاع دی۔ ساغر صاحب کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ آنے والا

کوئی بہت نزدیکی شخص ہے اور گفتگو کا ماحول نہیں رہا۔ بہرحال میں نے جاتے جاتے اُن سے پوچھا:

"جب شیخ صاحب ۱۹۶۲ء میں پاکستان آئے تو اُن کی تو عباس صاحب سے خوب ملاقات رہی۔ آپ سے بھی ملے تھے؟"

ساغر صاحب نے جواب دیا "نہیں۔ اُن کی آمد پر ان کا جلوس اسی سڑک سے گذرا تھا۔ میں اسی مکان کی بالائی منزل میں تھا۔ لیکن میں نے اپنی پشت کھڑکی کی طرف کر دی تھی۔ اس لیے میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ بعد میں استقبالیہ کے لیے دعوت نامہ آیا لیکن میری طبیعت نہیں مانی۔"

ساغر صاحب کے چہرے میں ایک بے لچک رعونت کا عکس پھر جھلملانے لگا۔ ہم نے مصافحہ کیا اور باہر نکلے۔ عبدالصمد رانی صاحب نے کہا "آج تو کمال ہو گیا۔ ساغر صاحب تو کسی سے ملتے ہی نہیں، آپ سے اتنے کھل گئے۔ میں نے سالہا سال کے بعد پہلی بار انہیں اس طرح باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

میرے ذہن میں غالب کا مصرع اُبھر آیا ؎

بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا



مجھے افسوس ہے کہ اس خاکے میں ساغر کی سوانحی تفصیلات نہیں ملیں گی۔ دراصل انہوں نے اپنے اردگرد اسرار کی ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے کہ ان کو اپنے خدوخال کے ساتھ دیکھنا بہت مشکل ہے۔ میری ایک ملاقات اس اسرار کو چاک کرنے کیلئے بہت ناکافی تھی ــــــ بہرحال جب میں نے جموں اور راولپنڈی میں اُن کے کئی شناساؤں سے استفسار کئے تو تفصیلات تو نہیں ملیں۔ لیکن تاثر بہت سے ملے۔ مثلاً راولپنڈی کے ایک مشترکہ دوست نے کہا کہ وہ چوہدری غلام عباس کے

ضمیر بردار conscience keeper تھے۔ اور ان کو ایک ساربان کی طرح ہانکتے تھے۔ یہ دونوں دوست جہاں رہے اکٹھے رہے۔ عباس سادہ لوح اور صاف گو تھے۔ لیکن ساغر بڑے ہوشیار اور سیاست کار ہیں اور گفتگو نپی تلی کرتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں عباس کا انتقال ہوگیا تو ساغر کا اصل کردار بھی ختم ہوگیا اور اس کے بعد وہ سیاست کی تیز روشنیوں سے پرے ہٹ کر گمنامی کی طرف ہٹتے چلے گئے اور اب تو انہوں نے تمام عوامی زندگی سے اپنا رابطہ توڑ دیا ہے۔

ایک اور صاحب نے کہا کہ ساغر نے جموں و کشمیر سے آنے والے دوسرے مہاجر لیڈروں کے برعکس کسی عہدے کی تمنا نہ کی۔ ورنہ قلمے اور سخنے تو وہ کسی بھی منصب پر فائز ہو سکتے تھے۔ اُن کی جتنی جائداد جموں میں ہے اس کا چھوٹا سا بدل بھی انہیں پاکستان میں نہ ملا۔ دوسرے لوگوں نے تو پدرم سلطان بود کے مصداق بڑے بڑے claim پیش کر کے جائیدادیں بنائیں۔ (سردار محمد ابراہیم خان کئی ہزار ایکڑ اراضی کے مالک بن گئے ہیں۔ مکانات وغیرہ کی تفاصیل الگ ہے)۔ لیکن چوہدری غلام عباس کے بعد اگر کسی شخص نے اس سلسلے میں بے نیازی دکھائی تو وہ ساغر ہیں (یاد رہے کہ چوہدری عباس ایک کرائے کے مکان میں انتقال کر گئے)۔

جموں میں ساغر کے جاننے والوں نے ان کا تقابل مولینا مسعودی کی بجائے مرحوم شمیم احمد شمیم سے کیا۔ اُن کے تاثر کے مطابق ساغر کے قلم اور کلام سے ویسی ہی چنگاریاں جھڑتی اور بھڑکتی تھیں جیسی شمیم صاحب کے قلم اور کلام سے۔ دونوں کی زبان قینچی کی طرح اور قلم تلوار کی طرح چلتے تھے۔ دونوں میں حس ظرافت sense of humour اور حاضر جوابی (wit) کے جوہر تھے۔ البتہ یہ کہ ساغر میں متانت زیادہ تھی اور commitment اور استقلال بھی۔

جب میں نے ساغر کو دیکھا تو اگرچہ وہ الف کی طرح سیدھی قامت رکھتے

تھے۔ لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ وہ بستر بہتر کے بیٹھے ہیں، ہیں اور اب تو وہ اسّی کے قریب ہوں گے۔ اس دوران تحریک آزادیٔ کشمیر کے تقریباً تمام عمائدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ سرحد کے اس پار مولانا محمد سعید مسعودی اور سرحد کے اس پار اللہ رکھا ساغر اس بزم رفتہ کی آخری شمعیں ہیں ع

حلقہ کئے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو

کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

یہ بات بہت فکر انگیز ہے کہ دونوں اپنی اپنی جماعتوں کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ قلم بردار بھی رہے ہیں۔ دونوں کا حافظہ اب بھی صحیح ہے اور دونوں کا سینہ اسرار و رموز کا خزانہ ہے۔ مگر دونوں نے اپنی یادداشتیں لکھنے سے گریز کیا ہے۔ یہ تاریخ کے تئیں انکی عارفانہ حقارت ہے یا اپنے آپ کو 'روپوش' رکھنے کی بزدلی، اس کا فیصلہ کون کرے؟



ساغر کے مزاج اور مذاق کو سمجھنے کے لئے اس کے ہفت روزہ 'جاوید' کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کی تحریروں سے اس کی شخصیت کی خاص خوشبو مہکتی ہے۔ 'جاوید' جموں سے ۱۹۳۹ء میں نکلنا شروع ہوا اور تقسیم ہند سے ذرا پہلے دم توڑ گیا۔ 'جاوید' سے پہلے ساغر 'پاسبان'، جموں اور لاہور کے کچھ اخبارات میں اکادکا مراسلات اور مضامین لکھتے تھے لیکن ان کا اصل جوہر اسی اخبار میں کھلا۔ یہ اخبار اس نے جموں کے مشہور سیاسی کارکن گردھاری لال آنند کے ساتھ نکالا تھا جو ایک وقت نیشنل کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ دونوں میں اقرار تھا کہ وہ ایک دوسرے کے سیاسی خیالات سے قطع نظر 'جاوید' کے لئے لکھتے رہیں گے لیکن اخبار کے فائل دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آنند صاحب تو بس اسّی برس کے شوہر کی طرح

تین سکھ" بنے رہے اور ساغر صاحب اس آمادہ ہم رقص کی باہوں میں باہیں ڈالکر دھوم مچاتے رہے۔ 'جاوید' اگرچہ مسلم کانفرنس کا ترجمان نہیں تھا لیکن اس پر جناح صاحب، عباس صاحب اور مسلم لیگی سیاست کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ یہ ہفت روزہ اردو اخبارات کے مروجہ سائز میں شائع ہوتا رہا لیکن اس کی کتابت اور طباعت اپنے وقت کی سب سے دیدہ زیب کتابت اور طباعت تھی۔ جگہ جگہ ساغر کی خلاق، شوخ اور بے لاگ طبیعت کی پھلجھڑیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ شمیم احمد شمیم کے "آئینہ" سے پہلے اس رنگ اور رونق کا اخبار 'جاوید' ہی تھا اور جس چراغاں نے "آئینہ" کو شعلوں کے رقص میں تبدیل کر دیا اس کا پہلا تجربہ 'جاوید' کے لئے لکھنے والے ساغر کے یہاں ہی نظر آتا ہے۔ 'جاوید' کے چند پرچوں کا اشاریہ مطالعہ حاضر ہے:

۲۵، جنوری ۱۹۴۵ء کے 'جاوید' کا پرچہ زیر نظر ہے۔ اس وقت مہاراجہ نے دو عوامی وزیروں کے نام پیر وزیر گنگارام اور مرزا محمد افضل بیگ کو مامور کیا تھا۔ 'جاوید' نے خبر لکھی:

"شیخ عبداللہ کی مصروفیات

جموں: شیخ عبداللہ صاحب ان دنوں پبلک ورکس منسٹر (مرزا محمد افضل بیگ) کے سرکاری بنگلے میں فروکش ہیں۔ آپ بہ التزام ہر روز ۲ بجے بعد دوپہر سرکاری دفاتر میں تشریف لے جاتے ہیں اور سب آمدوں اور غلام گردشوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ جہاں وہ ہندو ٹھیکہ داروں اور غیر مسلم ملازموں کے آداب قبول فرماتے ہیں ــــ (نامہ نگار خصوصی)"

مجھے اس پر شمیم احمد شمیم کے "آئینہ" کی ایک خبر یاد آگئی جو اس نے ۱۹۶۴ء میں شائع کی۔ اخبار میرے سامنے نہیں لیکن اس کا عنوان ابھی تھا ــــ 'سابق وزیر اعظم

کی مصروفیات" اور بعد میں لکھا گیا تھا کہ بخشی صاحب آج کل ٹیلی فون پر اپنے منظور نظر ٹھیکے داروں کی اپنے نمک خوار افسروں کے پاس سفارش کرتے رہتے ہیں۔

'جاوید' کے اسی شمارے میں اُس وقت کے وزیر اعظم سری پی۔ این راؤ کا قلمی چہرہ ہے۔ (یاد رہے کہ ہفتہ وار 'آئینہ' میں شمیم صاحب ہر ہفتہ کسی شخصیت کا قلمی چہرہ چھاپتے تھے) صرف ایک اقتباس:

"گوپالا سوامی آئینگر اتنے کڑوے تھے کہ انہیں مسلمانوں نے تھوک ڈالا۔ بینگل نرسنگھ راؤ اتنے میٹھے ہیں کہ انہیں کشمیری پنڈت نگل گئے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بچھو اور یہ بچھڑے۔"

"آئینہ" سے پہلے 'جاوید' میں بھی خطوط کا کالم "حدیث دیگراں" کے عنوان سے چھپا تھا۔ ۴ر جنوری ۱۹۴۲ء کے 'جاوید' میں ایڈیٹر اپنے مراسلہ نگاروں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:

"دعا گوئی و کاسہ لیسی ..... ہمارے پاس ایسے مراسلات موصول ہوتے ہیں جن میں معمولی اہلکاروں سے لے کر اعلیٰ حکام ہر ایک کے متعلق یوں لکھا جاتا ہے:

"عالی جناب نائب تحصیلدار صاحب رام جی کی خدمت میں استدعا ہے کہ باتچہ کی افسر کے حسن انتظام سے راعی اور رعایا کی بہت خدمت ہوئی ہے"

یہ انداز تحریر سراسر غلامانہ ذہنیت کی پیداوار ہے۔ عوام کو استدعا نہیں مطالبہ کرنا چاہیئے۔ درازیِ عمر کی دعائیں دینا بھک منگوں اور میراثیوں کا کام ہے ..... محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے والوں کا نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس قسم کی ذلیل اور کاسہ لیسانہ تحریرات کو شائع نہیں کر سکتے۔ بہتر ہوگا کہ ایسے غلام 'جاوید' کی بجائے زنجیر

سے خط و کتابت کریں"

یاد رہے کہ "رنبیر" لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں شائع ہونے والا جموں کا پہلا اخبار تھا۔ ستم ظریفی تھی کہ 'جاوید' اسی کے "پریم پریس" چھاپہ خانے میں چھپتا تھا اور اس قسم کی گستاخیوں کے لئے 'جاوید' اس کے ناشر ناکوں چنے چبواتے تھے۔

'جاوید' کا مزاحیہ کالم 'جرعات' کے عنوان سے شائع ہوتا تھا اور اس میں ساغر اپنی شگفتہ مزاجی کے شگوفے کھلاتے تھے۔ ۴ جنوری ۱۹۴۲ء کے ہی پرچے میں یہ بھی شامل ہے:

"طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں ہر دیزی
مرزا محمد افضل بیگ (جو ان دنوں منسٹر تھے) بھی موبڑھیں اسی ٹھسے سے تشریف رکھتے ہیں جس طرح نواب مرزا جعفر علی خان اثر بیٹھتے ہیں۔ جہاں تک حاکمانہ رعونت کا تعلق ہے افضل بیگ صاحب اور پنڈت رام چند کاک (جو ان دنوں وزیر حضور تھے) کی گردن کے استرخا میں کوئی وجہ تمیز نہیں"۔

اب یہاں لفظ 'استرخا' جس برجستگی کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ اس کی داد کچھ وہی لوگ دے سکتے ہیں جن کی نظروں کے سامنے مرزا صاحب اور کاک صاحب کی گردنوں کا نظارہ رہا ہو۔

۱۲ اپریل ۱۹۴۲ء کے جرعات میں بیگ صاحب کی لطیفہ گوئی کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا گیا ہے کہ جب اچھی بات کی داد دینے کا موقع آجائے تو 'جاوید' کی زبان نہیں ہکلاتی۔

"اور تو اور مرزا جعفر علی خان نے بھی اسمبلی میں لطیفہ پیدا کیا ہے۔ نیشنل

کانفرنس گروپ کے سیکرٹری مسٹر صادق نے کہا کہ حکومت کے کاروبار میں ہمارا حصہ نہیں۔ پنڈت امرناتھ کاک نے جواب دیا "آپ تو بچاس فیصدی پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور حکومت کا نصف حصہ آپ کے قبضے میں ہے۔ (ان کا اشارہ وزارت میں بیگ صاحب کی موجودگی کی طرف تھا)۔ اس پر بیگ صاحب کھڑے ہو گئے اور فی البدیہہ کہا "نصف ہی نہیں بلکہ نصف بہتر بھی" — یاد رہے کہ نصف بہتر (Better half) انگریزی میں بیوی کو کہتے ہیں"۔

اسی شمارے میں ایک شذرے کا عنوان غنیؔ کاشمیری کے اس مشہور شعر کو بنایا ہے ؎

غنیؔ روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

مجھے یاد آگیا کہ شمیمؔ صاحب نے بھی "آئینہ" میں ایک خبر کا عنوان غالبؔ کے اس شعر کو بنایا تھا ؎

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

'جاوید' کے بہت سے شماروں میں خواجہ غلام السیدین کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین ان کے دستخطوں سے شائع ہوئے ہیں۔ وہ اُن دنوں ریاست کے ناظم تعلیمات تھے۔ اُن کا ایک مقالہ اس عنوان کے تحت شائع ہوا ہے:—
"آتجھ کو بتاؤں تقدیر اُمم کیا ہے" — ۴، جنوری ۱۹۴۵ء کے پرچے میں اس عنوان کے تحت کہ "خواجہ غلام السیدین واپس جائیں گے" لکھا ہے:
"معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خواجہ صاحب مئی ۱۹۴۵ء سے پہلے ہی

ریاست کی ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ اگرچہ باخبر حلقوں کا بیان ہے کہ کونسل آپ کی کارکردگی کے پیشِ نظر آپ کی میعاد ملازمت میں توسیع منظور کرے گی مگر ایسے حالات پیدا کئے گئے ہیں جن کی موجودگی میں آپ کام نہیں کر سکتے" — (نامہ نگار خصوصی)

اس کے بعد راجیہ ہندو سبھا (جس کا طول و عرض 'جاوید' کے الفاظ میں بگہ ڈنگہ سے محلہ بھابڑیاں (حانیہ حبین بازار) تک محدود ہے) کے آفیشل آرگن نے لکھا ہے:۔

"یقین کیا جاتا ہے کہ مسٹر جناح نے بھی کشمیر سے رخصت ہونے کے وقت سر بی۔ این راؤ کو دبے الفاظ میں دھمکی دی تھی کہ اگر مسٹر ستیارین کو واپس کیا گیا تو راؤ وزارت مسلمانوں کی ہمدردی سے محروم ہو جائے گی"۔

اس دعوے کا مضحکہ اڑاتے ہوئے 'جاوید' نے لکھا ہے کہ جناح صاحب جیسی عالی مرتبت شخصیت کو اس پھٹے میں ٹانگ اڑانے کی کیوں ضرورت پڑتی اور ایسا سوچنا ہی حماقت ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:

"ان کے نزدیک تو خواجہ صاحب نے محکمہ تعلیم کو پاکستان بنا ڈالا ہے۔ اس "پاکستان" کی ہیئت ترکیبی کیا ہے؟ آئیے شعبہ درس و تدریس کے پاکستان پر نظر ڈالیں:۔

	کل تعداد	ہندو	مسلمان	مسلمانوں کا تناسب
پرنسپل	۴	۳	۱	۲۵٪
پروفیسر	۲۷	۲۳	۴	۱۵٪
لیکچرر	۵۷	۳۵	۲۲	۳۸٪
ہیڈ ماسٹر ہائی سکول	۳۰	۲۱	۹	۳۰٪
سکیل ماسٹر (گریڈ ۵۷-۱۲۵)	۴۸۹	۳۱۴	۱۷۵	۳۴٪

جاوید کے فائل کے اوراق اُلٹتے ہوئے آج کچھ دلچسپ حقائق اور معاملات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سیدین صاحب کے جانے کے بعد نئے ڈائریکٹر ایجوکیشن کے متعلق قیاس آرائی کی گئی ہے:

"آج کل یہاں اس بات کا بڑا چرچا ہے کہ نیا ڈائریکٹر ایجوکیشن کون ہوگا؟ خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی پرنسپل امر سنگھ کالج اور ڈاکٹر محمد امین تاثیر امیدوار ہیں۔ چونکہ خلیفہ پشتینی باشندہ ریاست ہیں اور پہلے سے ہی ریاست کی ملازمت میں ہیں اس لئے انکی تقرری زیادہ ممکن ہے"۔

یاد رہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کشمیری زبان کے مشہور شاعر اور تذکرہ نگار مرحوم عبدالاحد آزاد کے گاؤں رانگر کے رہنے والے اور آزاد کے قریبی رشتہ دار تھے۔

۱۱ر جنوری ۱۹۴۵ء میں ایک خبر ہے:

" اردو بازار سے رنڈیوں کا اخراج

جموں ۱۰ جنوری۔ آج میونسپل کمیٹی کے اجلاس میں اردو بازار سے رنڈیوں کے اخراج کا معاملہ پیش ہوا۔ متفقہ طور پر قرار پایا کہ میونسپل بائی لاز کی رو سے کمیٹی آئندہ اردو بازار محلہ بابا جیون ریذیڈنسی روڈ میں پیشہ کرنے کی ممانعت کرتی ہے۔ خیال رہے کہ مختلف اسلامی ادارے اس بات کا بار بار مطالبہ کر رہے تھے ــــ (نامہ نگار خصوصی)"

۲۵، دسمبر ۱۹۴۲ء کے اخبار میں لکھا ہے:

" شیخ محمد عبداللہ کو ڈاکٹر اشرف کا سرٹیفکیٹ۔

جموں: مشہور اشتراکی لیڈر کنور محمد اشرف کی جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس میں وہی پوزیشن ہے جو سر تیج بہادر کی مہاراجہ کشمیر کے دربار میں۔ ڈاکٹر صاحب

نے Diarchy (جس کے تحت بیگ صاحب وزیر بنے تھے) کے متعلق اپنا تبصرہ بمبئی کے اخبار "قومی جنگ" میں شائع کیا جس کا اقتباس یوں ہے:

"نیشنل کانفرنس کا نیا کشمیر جیسا جمہوری اور انقلابی پروگرام تھا۔ مگر اس نے مہاراجہ کی Diarchy میں شمولیت کر کے اپنی لٹیا ہی ڈبو دی۔ اس وقت بھی وہاں کی اسمبلی (پرجا سبھا) کے ۷۵ ممبروں میں صرف ۳۳ چُنے جا سکتے ہیں اور انہیں بھی صرف ۱۰ نیشنل کانفرنسی ہیں۔ پرجا سبھا میں اس وقت بھی فوج اور مہاراجہ کا ذاتی بجٹ زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ نئے منسٹر مہاراجہ کے نوکر اور دُعاگو ہی ہو سکتے ہیں مگر نیشنل کانفرنس نے اس میں شمولیت کر لی۔ اس کارروائی سے جاگیرداروں کی جیت ہوئی۔ اس سے زیادہ حیران کن بات ہے کہ دونوں وزیروں کا جگہ جگہ استقبال ہوا اور خود شیخ محمد عبداللہ ان کے دورے میں ہمراہ تھے"۔ اس کے بعد ساغر کا تبصرہ ہے:

"ڈاکٹر اشرف ہندوستان کے ذہین اور مخلص اشتراکی لیڈروں میں سے ہیں اور یہ حقیقت بھی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ موصوف نے شیخ عبداللہ کی تربیت میں بہت جانکاہی کی ہے اور انہیں سیاسیات کے اسرار و خفایا سمجھانے میں اپنی طرف سے کوئی تامل نہیں کیا۔ ان نازک تعلقات کے باوجود ان کا یہ رویہ اختیار کرنا حیران کن ہے"۔

"جرعات" کے عنوان سے ایک عنوان جمایا گیا ہے ——

"دسوندھا سنگھ کا مقامی (ایڈیشن)" —— اور پھر لکھا ہے:

"سردار دسوندھا سنگھ پنجاب کے ایک دلچسپ وزیر تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک

دفعہ لاہور سے گجرانوالہ تشریف لے گئے۔ آٹھ دس میل کے بعد موٹر بگڑ گیا۔ شوفر نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن نقص دُور نہ ہو سکا۔ وہ سردار صاحب کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور کہا "حضور موٹر بگڑ گیا ہے آگے جانے کی نہیں"۔ سردار صاحب نے دو چار منٹ سوچ کر فرمایا:

"تو واپس ہی لے چلو"۔

ساغر کو اس وقت کیا خبر تھی کہ دسوندھا سنگھ جیسے کردار بار بار جنم لیتے ہیں اور بہت جلد خدا بخشے "مرحوم سوگامی صاحب" کی شکل میں سردار دسوندھا سنگھ سے ایک قدم آگے جا کر Folk Lore میں اپنا نام درج کروانے والے تھے۔

اسی اخبار میں ساغر کو تاؤ آیا ہے اور وہ اپنے اخبار کا یوں تعارف کراتے ہیں:

"ہماری قطعی رائے ہے کہ صحافت مسلمانوں کا پیشہ ہے جیسے بیاج بیوپار ہندوؤں کا۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود ہندوستان کی صحافت پر ہندوؤں کا قبضہ ہے .... جاوید وسعت اشاعت کے لحاظ سے ہر مقامی اخبار کو للکارنے کی پوزیشن میں ہے لیکن آپ دوسرے ہندو اخبارات کی نسبت اشتہارات کے معاملے میں اسے پھسڈی پائیں گے"

'جاوید' میں کبھی کبھی اشتہارات تک میں ایڈیٹر کی جودتِ طبع کا اظہار ہوتا تھا۔ اُن دنوں دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کا چاروں طرف چرچا تھا۔ ایک طرف روس نے محاذ کھولا تھا اور دوسری طرف امریکہ وغیرہ نے۔ جاوید نے اپنے اشتہار کی سُرخی جمادی —

"ہندوستان کا جرمنی کے خلاف تیسرا محاذ

آج تک حجام اور دیگر معززین جرمنی کے تیار کردہ اُسترے استعمال کر کے خوش ہوتے تھے لیکن ہندوستان نے برکو Birco ریزر تیار کر کے جرمنی

کے دانت کھٹے کر دیئے ہیں۔ اب بھی مرکو یہ پیر ز خرید سیئے"۔

'جاوید' میں مسٹر خورشید حسن سیکرٹری ٹو مسٹر جناح' کی سرخی کے تحت اُن کے بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اور ایک جگہ بیورلی نکولس کی مشہور کتاب 'Verdict on India' کے ایک اقتباس کا ترجمہ درج ہے جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نکولس نے جناح صاحب کو کتنا صحیح سمجھا تھا:

"برِ اعظم ایشیا کی عظیم شخصیت محمد علی جناح کی عمر ستاسٹھ برس ہے۔ وہ دراز قد، لاغر اندام اور خوش رُو انسان ہیں۔ ظاہری شکل و صورت سے وہ ہسپانیہ کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ آئندہ چند سال کے دوران ہندوستان ہی دنیا کا اہم ترین مسئلہ بننے والا ہے اور اس سلسلے میں مسٹر جناح کا حصّہ بہت اہم ہوگا۔ وہ سیاسیات کا رخ جس سمت چاہیں، پھیر سکتے ہیں.... کوئی اور مسلمان لیڈر اپنے اندر یہ اہلیت نہیں رکھتا۔ ہندوؤں کا یہ حال نہیں۔ اگر آج مسٹر گاندھی سیاسیات سے دستکش ہوجائیں تو انکی جگہ جواہر لال نہرو، راجگوپال آچاریہ، سردار پٹیل یا کوئی اور اپنی قوم کی قیادت کرسکتا ہے"۔

اُن ہی دنوں جناح صاحب ریاست کے بڑے ہی پُرآشوب اور واقعات ساز دورے پر آئے۔ "رنبیر" نے طنزیہ انداز میں اس خبر پر یہ جہازی سُرخی جمائی:

"شہنشاہِ پاکستان کا جموں میں پھیکا استقبال"۔

بس پھر کیا تھا۔ ساغر کو مرچیں لگ گئیں اور وہ 'رنبیر' کے نام تین حروف پر مشتمل طعنہ زنی پر اُتر آئے۔ مگر اس کا ذکر کرنا یہاں موزوں نہیں رہے گا۔"

"جاوید" میں سر تیج بہادر سپرو کی غیر جانبداری پر بھی کس کس کے چھینٹے اڑائے گئے ہیں ۔ ساغر کے خیال میں سر تیج اپنی اردو نوازی اور آزاد روی کی اوٹ میں کشمیر میں ایک ناصاف کھیل میں مصروف تھے ۔ وہ مہاراجہ کے اصل مشیر تھے اور وہی یہاں کے سیاہ و سفید کا فیصلہ کرتے تھے ۔ ساغر بار بار سر سپرو کی گندم نمائی اور جو فروشی کا ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ کشمیر کی کتاب قانون میں امتناع گاؤکشی، ترک ارث اور آزادی اسلحہ ؎ جیسے قوانین کا اندراج سر سپرو کی رواداری، مساوات، مصلحت کوشی اور انصاف پروری پر بدنما داغ ہے ۔

اگرچہ اس گفتگو کی لذت ایسی ہے کہ اس کو ختم کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن بہر حال ہمارے پاس ایک محدود جگہ ہے ۔ 'جاوید' اور اس کے ساتھ ساغر کے میزان اور مزاج کو اجاگر کرنے کے لئے محمد علی جناح اور پریم ناتھ بزاز مدیر 'ہمدرد' کے اس کے متعلق تاثرات درج کرنا بے محل نہ ہوگا ۔

'جاوید' میں "قائد اعظم کا گرامی نامہ" کے عنوان سے یہ خط درج ہے (جو اصل میں انگریزی خط کا ترجمہ لگتا ہے):

"ایک ایسے وقت میں جبکہ پیچیدہ مسائل اور کثرت مشاغل نے مجھے بیحد مصروف رکھا ہے 'جاوید' کے متعلق تاثرات بیان کرنا ممکن نہیں ۔ تاہم مجھے اتنا ظاہر کرنے میں کوئی دقت نہیں کہ میں کبھی کبھار 'جاوید' کا ایک آدھ مضمون دیکھ لیتا ہوں ۔ اور مجھے خوشی ہے کہ اخبار ان مسائل پر جن سے مسلمان قوم دوچار ہے سلجھے ہوئے طریقے سے بحث کرتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسے عوام و خواص دونوں طبقے پسند کرتے ہیں اور اسکا

؎ ان قوانین کی رو سے (۱) گاؤکشی ممنوع تھی (۲) اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرتا تو اپنی جائیداد سے محروم ہوجاتا اور (۳) اسلحہ رکھنے کا حق صرف راجپوتوں کے لئے مخصوص تھا ۔

لئے یہ جموں کا سب سے بارسوخ اور ہر دل عزیز اخبار ہے۔

۲۴ دسمبر ۱۹۴۴ء آپ کا مخلص : محمد علی جناح"

یہ خط جاوید کی ۴ جنوری ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس کے چند ہی ماہ بعد جب 'جاوید' کو (C) فہرست میں درج کیا جاتا ہے تو سا غر احتجاج کرتا ہے اور لکھتا ہے:

"جاوید مدعی ہے کہ وہ ریاستی اخبارات میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہے۔"

بزاز صاحب اپنے زبردست اخبار 'ہمدرد' کی ۲۹ مارچ ۱۹۴۵ء کی اشاعت میں ایک اداریئے کے ذریعے 'جاوید' کی حمایت کرتے ہیں جس سے ضمناً اس وقت کے صحافتی حلقوں میں 'جاوید' کی ساکھ کا اندازہ بھی ہوتا ہے:

"ہمیں جاوید کی پالیسی سے اتفاق نہیں ہے۔ لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاوید ریاستی پریس میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے اور مسلم جرائد میں چوٹی کا اخبار ہے۔ ہمارے دل میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اخبار ریاستی مسلمانوں کے جذبات وخیالات کی جس نڈرتا اور بہادری سے ترجمانی کرتا ہے وہ کسی دوسرے اخبار کی ہمت دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی بہادری میں غیر ذمہ داری نہیں اور اس کے مضامین متین اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ جہاں حکومت کشمیر نے بعض اخبارات کو بھی (A) لسٹ میں رکھا ہے وہاں ایسے بلند پایہ اخبار کو (C) لسٹ میں درج کر دیا ہے۔"

۱۲ اپریل ۱۹۴۵ء کے 'جاوید' میں ایک چھوٹی سی خبر ہے جو اس وقت بہت معمولی تھی لیکن بعد میں ہمارے لئے ایک مستقل درد سر بنی رہی ہے۔ اسمیں

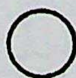
لکھا ہے کہ: "پیڑہ اور بوٹ کے بیچ میں ایک پہاڑی برف و باراں میں پھسلنا شروع ہو گئی ہے"۔ بعد میں یہی جگہ ناشری نالہ بن گئی اور شاید 'جاوید' کی یہ خبر اس کی پہلی تشخیص تھی۔ 'جاوید' ایک باتصویر ہفت روزہ تھا اور اس وقت کی ٹکنالوجی کے مطابق اس میں فوٹو بلاک سے چھپتے تھے۔ چنانچہ اس میں کچھ ایسی شخصیات کے بھی فوٹو ہیں جن کی تصاویر اور کہیں نظر نہیں آتیں۔

آخر میں غلام رسول نشاط کشتواڑی صاحب کی ایک قصیدہ نما نظم کے چند اشعار نقل کرنا مناسب ہوگا جو انہوں نے چوہدری عباس اور ساغر کے کشتواڑ آنے پر لکھے تھے۔ اس میں ساغر کا ذکر یوں ہوا ہے:-

"آ گئے ہیں حضرت ساغر بھی آج — رکھتے ہیں سر پر جو خودداری کا تاج
معدنِ ملت کے اک گوہر ہیں یہ — اپنے گلشن کے گلِ خوشتر ہیں یہ
قصرِ قومی کے یہ وہ معمار ہیں — اپنے فن میں جو بہت ہشیار ہیں"

میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اور میری آنکھوں کے سامنے اللہ رکھا ساغر کا وہ چہرہ اُبھر رہا ہے جس پر کسی آزمودہ جنگجو کی طرح رعونت ہے۔ اگرچہ اس کو یہ علم ہے کہ اُس نے جنگ نہیں جیتی۔ لیکن حرب تو ایک فن ہے اور اُس نے Art for arts sake جنگ لڑی۔ ڈٹ کر لڑی اور خوب لڑی۔ باقی ؏

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر



چودھری خوشی محمد ناظرؔ

چودھری خوشی محمد نام، ناظر تخلص۔ ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ میں ہریاوالا ضلع گجرات، پنجاب میں تولد ہوئے۔ آپ کے والد کا نام چودھری مولیٰ داد خان تھا۔ ناظرؔ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ مولوی نورالدین انور منشی فاضل نے ان کو عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ ثانوی تعلیم کے لئے انہیں مقامی سکول میں داخل کیا گیا۔ لیکن وہ اوقات سکول کے بعد اپنے گاؤں کے فارسی مکتب میں بھی درس لیتے رہے۔ اس ابتدائی دور میں بھی انہوں نے چند فارسی غزلیں کہیں۔ مڈل کے درجے میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کی زندہ جاوید کتاب "آبِ حیات" اور اردو کے بعض دیوان بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہے۔ ان دواوین کی وجہ سے اردو شعر کہنے کی تحریک ہوئی۔[1] ۱۸۷۹ء[2] میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں ۱۸۹۳ء میں بی۔اے کا امتحان امتیازی پوزیشن حاصل

---

[1] "نغمۂ فردوس" ج ۱ ص ۳

[2] ۱۸۸۹ء (ادارہ)

کر کے پاس کیا۔[1]

انہیں شاعری میں ترقی پانے کا موقع علی گڑھ میں ملا جہاں کا ماحول ان دنوں شعر و شاعری اور علم و ادب کے بہت ہی موافق تھا۔ قومی اور وطنی شاعری کا احساس بھی انہیں علی گڑھ میں ہی ہوا۔ اس لئے سنجیدگی سے اس راہ پر گامزن ہوئے۔ ان کی پہلی غزل کا مطلع یہ تھا؂

کیا ان دنوں نگاہِ ستمگر ہے تیز تیز
تیرِ نظر کی چوٹ دلوں پر ہے تیز تیز

اس وقت یونین کلب اور علی گڑھ کالج کے جلسوں میں غزل پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ کیونکہ سر سید مرحوم عاشقانہ غزل سرائی طلبہ کے لیے تضیع اوقات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ مگر بورڈنگ ہاؤس کی فضا میں غزل گونجتی رہتی تھی بلکہ باورچی خانے سے بھی ہر صبح یہ آواز سنائی دیتی تھی ؂

یار کی کوئی خبر لاتا نہیں   دم لبوں پر ہے نکل جاتا نہیں[2]

ادھر مولانا حسرت موہانی کے کمرہ میں اساتذہ سلف کی روح میں مخفی مشاعرے کرتی رہتی تھیں۔ سر سید احمد خان نیچرل شاعری کے حامی تھے اور مسٹر آرنلڈ (آنجہانی) نیچرل شاعری کی ترتیب و تربیت میں خاصی دلچسپی لیتے تھے۔ ناظر کو دو سال متواتر انعامی نظم کا اعزاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا اور یہ دونوں نظمیں علی گڑھ میگزین میں شایع

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲ مئی ۱۸۹۳ء میں ناظر کے پاس ہونے کی خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں شایع ہوئی تھی:-

"بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نہایت عمدہ ہے۔ ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے کالج کے طالبعلم خوشی محمد بی اے کے امتحان میں فسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے اور انگلش اور فارسی دونوں زبانوں میں آنرز کا درجہ لیا۔ انہوں نے طلائی تمغہ پلکے تھا اپنے آپ کو پورا مستحق ثابت کیا اور امید ہے کہ وہ ان کو ملے گا۔" ("شیرازہ" جلد۔ ۲۷، شمارہ ۱) (ایڈیٹر)

[2] 'نغمۂ فردوس'، ج ۱، ص ۴

ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ان کی جو علمی افزائی ہوتی رہی۔ اور کالج یونین کلب اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھتے رہے جن میں سے بعض نظمیں محفوظ ہیں اور بعض غفلت شعاری کی وجہ سے ضائع ہو چکی ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں بھی ناظر نے بہت سی نظمیں سنائی تھیں۔ غرض علی گڑھ میں ان کی شاعری کو ترقی پانے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا۔[1]

اس طرح تعلیم کے دوران میں ہی وہ اردو کے جانے پہچانے شاعر ہو گئے۔ مگر غزل سرائی کا رنگ پختہ نہ ہونے پایا تھا۔ ان کی نظم نگاری سر سید مرحوم کو بھی مرغوب خاطر تھی۔ یہ مولانا حالی کی ترغیب و تربیت کا اثر تھا کہ وہ نیچرل شاعری کی طرف راغب ہوئے۔[2] چودھری خوشی محمد ناظر کا شمار اردو کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جو حالی کے بعد سر سید مرحوم سے متاثر ہوئے اور جنہوں نے زندگی اور زندگی کے مسائل کو اردو شاعری میں داخل کیا۔ ان شعراء میں علامہ اقبال، ناظر، جسٹس شاہ دین، ہمایوں، سید اعجاز حسین اور غلام بھیک نیرنگ شامل تھے۔ ان لوگوں نے ہی صحیح معنوں میں سر سید کے سکول کی ترجمانی کی۔[3]

ناظر کی شاعری کا دوسرا دور کشمیر کے قیام سے شروع ہوتا ہے ۱۹۰۱ء میں ان کی تقرری کشمیر میں ہوئی۔[4] وہ ریونیو کمشنر کے پرسنل اسسٹنٹ ہو کر کشمیر آئے تھے۔

۱؎ مقدمہ "نغمۂ فردوس" ص ۱۷۰ ۲؎ و ۳؎ جدید شعرا وحید قریشی ص ۲۹۰

۴؎ ڈاکٹر انور احمد خان صاحب نے ناظر پر ایک تحقیقی مقالہ لکھا ہے ("شیرازہ" جلد ۲۷ شمارہ ۱) ان کی تحقیق کے مطابق ناظر کی ملازمت کی ابتداء بھی علی گڑھ سے ہی ہوئی ہے۔ اس کی اطلاع "اولڈ بوائے" سے ملتی ہے جو خورجہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کا اجراء اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہوا اور اس کے ایڈیٹر سعید محمد خان (بی اے علیگ) تھے جو علی گڑھ میں ناظر کے شاگرد تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خوشی محمد خان صاحب علی گڑھ کے بہترین شعراء میں رہے۔ سب سے اچھے یونین کے اسپیکر رہے۔ بی اے میں الہ آباد یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ بی اے کے بعد چند روز کے لئے مارننگ اسکول کے

اور اس معمولی عہدہ سے جلد ہی ترقی کی منزلیں طے کر کے گورنر[1] بنے اور پھر غالباً ۱۹۱۸ء
میں ریاست جموں و کشمیر کے ریونیو منسٹر ہو گئے تھے۔ بطور گورنر[2] انہوں نے اچھا نام کمایا۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۵۲) ہمارے استاد رہے"۔
علی گڑھ کے بعد ناظر کی ملازمت کا آغاز ریاست لوہارو سے ہوتا ہے جہاں وہ نواب صاحب کے
بچوں کے اتالیق مقرر کئے گئے تھے۔ یہاں پر انکی ملازمت کی ابتداء کے بارے میں ڈاکٹر انوار احمد
خان صاحب کو کوئی ریکارڈ نہیں ملا ہے اسی لئے وہ اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ پائے
ہیں۔ بہر حال جو شواہد میسر ہیں ان کے مطابق وہ اسے سنہ ۱۸۹۵ء اور سنہ ۱۸۹۹ء کے درمیان کا زمانہ
قرار دیتے ہیں۔ بعد میں ناظر نواب صاحب لوہارو کے سیکرٹری بھی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ناظر
نواب صاحب محمود کی اتالیقی پر مامور ہوئے۔ انہوں نے یہ ملازمت بھی دو سال سے
زیادہ کی کیونکہ سنہ ۱۹۰۱ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر وہ کشمیر آ گئے۔ چنانچہ میاں بشیر احمد کے نام
اپنے ایک خط میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-
"میری ملازمت کشمیر کا آغاز سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا"۔ (ہمایوں ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء)
o ــ (ایڈیٹر)

[1] مئی/جون سنہ ۱۹۰۴ء تک وہ پرسنل اسسٹنٹ کے عہدہ پر کام کرتے رہے سنہ ۱۹۰۵ء میں وہ کچھ
عرصہ کیلئے مہتمم بندوبست مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۰۶ء میں وہ وزیر وزارت ہو کر لداخ چلے گئے اور
تقریباً سنہ ۱۹۱۰ء تک وزیر وزارت کے عہدے پر فائز رہے اور پھر گورنر کشمیر مقرر ہو کر سری نگر آ گئے۔
یہ خبر اس زمانے میں مختلف رسائل میں بھی شائع ہوئی چنانچہ "کشمیری میگزین" نے "کشمیر کا
مسلمان گورنر" کے عنوان سے ایک مضمون بھی شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ جب سے حکومت
کشمیر قائم ہوئی ہے تب سے اب تک (یعنی سنہ ۱۸۱۹ء سے سنہ ۱۹۱۰ء تک) ۹۱ سال کے عرصے
میں کشمیر میں پچیس گورنر گزر چکے ہیں جن میں سے صرف تین مسلمان تھے اور باقی غیر مسلم۔ اس
کے بعد ناظر کے گورنر ہونے پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مہاراجہ کے اس اقدام کو سراہا
گیا ہے۔ ("شیرازہ" - جلد ۲۷، شمارہ ۱-۵) o ــ (ایڈیٹر)
[2] ناظر نے کشمیر کے زرعی انتظام کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس میدان میں بڑی نتیجہ
خیز اصلاحات نافذ کیں جس سے ایک طرف مالگذاری میں اضافہ کی وجہ سے ریاست کی آمدنی میں

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ناظر کشمیر ہی میں رہے ۔ انہیں جہانگیر کی طرح کشمیر سے عشق تھا۔ کشمیر کے دلفریب اور دلربا مناظر سے ناظر کو اس قدر والہانہ

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۵۳) اضافہ ہوا تو دوسری طرف وادی کی غالب اکثریت کے استحصال میں کمی اور ان کے ذریعہ آمدنی میں بہتری پیدا ہوئی ۔ انہوں نے یہاں کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف بھی راغب کرنے کی کوشش کی ۔ اس زمانے میں کشمیر میں رشوت اور بیگار زوروں پر تھی ۔ ناظر نے اس کا انسداد کیا اور کشمیر میں انہیں ختم کرنے کے لئے انتھک کوشش کی ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ وہ اکثر بھیس بدل کر گھومتے تھے اور رشوت و بیگار میں ملوث افراد کو پکڑتے تھے ۔ جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ ایسے کام کرنے سے ڈرنے لگے ۔ چنانچہ جولائی ۱۹۱۱ء کے "کشمیری میگزین" میں گورنر کشمیر اور بیگار کشمیر کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا تھا ۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس :

" الحمد اللہ ۔ سال گزشتہ سے ہر ایک سفید پوش جس کے دل میں خوف خدا نہ ہوتا تھا وہ ملک میں ہر راہ چلتے کو دو چار جوتے لگا کر بیگاری پکڑ سکتا تھا مگر موجودہ گورنر کے زمانہ کی برکت سے اب سرکاری ملازم بھی کسی کو بیگاری نہیں پکڑ سکتے ۔"

"میں نے (یعنی مضمون نگار نے ۔ جو ایک کشتی میں ایک جمعدار اور کانسٹبل کے علاوہ کئی اور افراد کے ساتھ سوپور کا سفر کر رہے تھے) جمعدار اور کانسٹبل کو کہا کہ آپ لوگ تو راستہ چلتے بلا تحاشہ بیگاری پکڑ لیتے ہیں اب مزدوری دینے پر بھی آپ کو نہیں مل سکتے اس کی کیا وجہ ہے ؟ جواب ملا کہ جب سے چودھری صاحب گورنر ہوئے ہیں ہر ایک ملازم کو اپنی ملازمت کے لالے پڑے ہوئے ہیں ۔ سوپور تو بیس تیس میل کے فاصلے پر سرینگر سے ہے ہم سو میل سے زیادہ فاصلہ پر تحصیل کرناہ میں بھی بیگاری نہیں پکڑ سکتے ۔ ایسا کیوں ہے ؟ صرف اس لئے کہ چودھری خوشی محمد صاحب ملک صالح بادشاہ کی طرح رعایا اور ملازموں کے حالات بھیس بدل کر معلوم کرتے رہتے ہیں ۔ ایک دفعہ بارہمولہ تشریف لائے اور پادری صاحب کی کوٹھی پر جو بارہمولہ سے تقریباً میل کے فاصلہ پر سری نگر کے راستہ پر واقع ہے ٹھہرے اور وہاں سے ایک گوجر کا بھیس بدل کر تحصیل آفس میں تشریف لے آئے اور خزانچی کے پاس قسط ادا کنندہ نمبرداروں میں بیٹھ گئے ۔ خزانچی نے ایک نمبردار سے چار روپے رشوت لی ۔ نمبردار اور موضع کا نام آپ نے بغل ہی میں پنسل سے قلمبند کر لیا اور دیگر حالات بھی نوٹ کئے اور واپس پادری صاحب کی کوٹھی میں آکر اپنا لباس پہن کر تحصیل میں چلے گئے اور تمام نوٹ کردہ بیانوں کو موقع پر ہی تصدیق کر لیا اور خزانچی اور واصل باقی نویس وغیرہ متعلقہ ملازمان کو معطل کر دیا ۔ جو اب تک معطل ہیں اور تحصیلدار صاحب کا تنزل کرا دیا ۔ اسی طرح

محبت تھی کہ انہوں نے بھی جہانگیر کی طرح کشمیر میں ہی جان دی۔

ناظرؔ کی آمد کی وجہ سے کشمیر میں صدیوں پرانی علم و ادب اور شعر و شاعری کی محفلیں پھر رونق پانے لگی تھیں۔ اور "انجمن مفرح القلوب" نام کی ایک ادبی انجمن تشکیل دی گئی جس کے روح رواں ناظرؔ تھے۔ اس انجمن کے اراکین میں اس دور کے اہم ادیب اور شعراء شامل تھے اور سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک یہ انجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رہی۔ اس کے بعد اُن کا تبادلہ ہوا تو وہ لداخ چلے گئے اور بندوبست مال کے انتظامی کام کی وجہ سے انہیں شعر گوئی کی فرصت بہت کم ملی مگر ع "چھُٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی ہے" کے مصداق یہاں بھی فرصت کے اوقات میں کبھی کبھی خفتہ شاعری بیدار ہوتی رہی۔ اور بقول ناظرؔ اس زمانے میں درباری شاعری کا دور شروع ہوا۔ مہاراجہ بہادر پرتاپ سنگھ (سرگباشی) درویش منش مہاتما تھے۔ انہوں نے بعض اعیان دربار سے ناظرؔ کی نظم "جوگی" سنی تھی اور وہ اس نظم سے بہت ہی متاثر ہوئے تھے۔ انہوں نے ناظرؔ کو دربار میں بُلا کر اس نظم کے پڑھنے کی فرمائش کی۔ قدرت نے ان کو اچھا ترنم عطا کیا تھا۔ اس لئے ان کے پڑھنے کا انداز بھی شیریں تھا۔ مہاراجہ بہت محظوظ ہوئے۔ اور اپنے دربار کے مطرب

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۵۴) پانپور کی مسجد میں ایک دن بطور بیوپاری تشریف لے گئے اور رات کو نمبردار کے گھر میں رہے اور تمام حالات زمینداروں، نمبرداروں اور ذیلداروں کے تعلقات کے دریافت فرمائے۔ سنا ہے کہ نمبردار اور ذیلدار بھی معطل کئے ہوئے ہیں۔

ان دو واقعات کے طشت از بام ہونے کے سبب تمام ملازموں میں لرزہ سا پڑ گیا ہے اور خطہ کشمیر میں سوائے چند ادنیٰ ملازموں کے رشوت لینا بظاہر مفقود نظر آتا ہے۔

جہاں جہاں دیہات میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے لوگ عہد نوشیرواں سے چودھری صاحب کی گورنری کو منسوب کرتے ہیں۔"

("شیرازہ" ۔ جلد ۲۷، شمارہ ۱) ۔ ایڈیٹر

کو یہ نظم گانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد مہاراجہ کی طرف سے خاص خاص تقریبوں پر انہیں بلا کر ان سے شعر سنانے کی فرمائش ہوتی رہی۔

ناظر کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت بے اختیار اُن کی یہ معرکتہ آرا نظم 'جوگی' یاد آجاتی ہے۔ اُردو کی اس کلاسیکی نظم کی جملہ خصوصیات پر بحث کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ اُردو کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے شاعر نے اسے تخلیق کرتے وقت سچ مچ جوگ سادھ لیا ہو۔ ورنہ ظاہر ہے یہ قلندرانہ ٹھاٹھ جو نظم کا طرۂ امتیاز ہے کیونکر پیدا ہو سکتی ہے۔ نظم کے خیالات' اس کے الفاظ اور خاص طور پر وہ بحر جس میں یہ کہی گئی ہے ایک دوسرے سے بہت ہی ہم آہنگ ہیں۔ اور اسی ہم آہنگی کی بدولت اس میں بلا کی نغمگی و ترنم اور درد و اثر پیدا ہو گیا ہے۔ اس نظم میں سے چند اشعار یہاں پر پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا:

کل صبح کے مطلعٔ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی' وادیٔ ایمن تھی' ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی' ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے' ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے' عرفان کی تانیں اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے' دلکش وہ سماعِ طیبہ ہوا
بن سے نے لب طاہچائی تھی اور بزم سرور سجائی تھی
بن میں گلشن اور آنگن میں' فرشِ سنجاب و سمور ہوا

تھا دلکش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرؔ دیوانہ

کشمیر میں ناظرؔ کے قیام سے یہاں کی ادبی اور شعری محفلوں میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔ منشی سراج الدین احمد خاں، میرزا سعد الدین سعدؔ، پنڈت ہرگوپال خستہؔ، پنڈت سالگرام سالکؔ، مولانا عبد الصمد، مفتی محمد حسین کاشمیری "انجمن مفرح القلوب" کے روحِ رواں تھے۔ باہر سے بھی مشاہیر شعراء اور ادیب کشمیر آتے رہتے تھے، اور اس طرح کشمیر میں شعر و سخن کی خاص طور پر گرم بازاری تھی۔ ناظرؔ کے مراسم ان سب سے گہرے تھے۔ وہ گگری بل محلہ میں جھیل ڈل کے کنارے پہاڑ کے دامن میں اپنی کوٹھی میں قیام پذیر تھے جہاں بعد میں مرحوم صادق صاحب رہتے تھے۔ ٭

کشمیر میں جھیل ڈل کا منظر دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر طرف سایہ دار درخت اور لذیذ میووں کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں۔ جھیل ڈل کی تعریف میں ناظرؔ نے کیا خوب کہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کشمیر سے متعلق ناظرؔ کی یہ پہلی نظم ہے جو کشمیر کے جھیل ڈل کی شان میں کہی گئی ہے ؎

اللہ اللہ ہے کیا حسین چمن پانی میں
سبزہ و لالہ و گل سرو و سمن پانی میں
کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس میں
کوہ پانی میں چمن پانی میں بن پانی میں

٭ کشمیر سے ریٹائر ہونے کے بعد تقریباً تین سال ناظرؔ ریاست رام پور میں رہے جہاں ان کی ملازمت ۱۹۲۵ء کے آخر سے شروع ہو کر ۱۹۲۸ء کے آخر میں ختم ہو جاتی ہے — گویا رام پور میں ان کی ملازمت تین سال رہی اور مختلف ریاستوں میں ان کی ملازمت کی کل مدت تقریباً ۳۵ سال رہی۔ ("شیرازہ" — جلد ۲۷، شمارہ ۱)
— (ایڈیٹر)

تودۂ سیم ہے یہ ڈل کے خزانے میں یہاں
برفِ کہسار ہے یا عکس نگوں پانی میں

اک طرف کوہ پہ تختِ سلیماں قائم
اک طرف سبزہ پری کا ہے وطن پانی میں

جلوۂ برق ہے ہے نور کا عالم شب کو
طورِ منظر ہے مہاراج بھون پانی میں

عشق پیچاں ہے ادھر اور گلِ ریحاں ہے ادھر
ہے یہ منصور تو وہ دار و رسن پانی میں

آبِ ڈل حسن و لطافت میں ہے گر آبِ حیات
صورتِ خضر ہے ہر شاخِ سمن پانی میں

اک طرف پھول کنول کا وہ سجیلا بانکا
مسکراتا ہے کھڑا حسنِ دہن پانی میں

نیلگوں ڈل میں کنول کی وہ قبائے گلرنگ
حسن کی آگ ہوئی شعلہ فگن پانی میں

ڈل سے کہتے ہیں بہت چاہنے والے اس کے
تیرے عشاق کا ہو گور و کفن پانی میں

بزمِ ناظرؔ کی بھی مستانہ نوائیں سن کر
رقص کرتے ہیں کبھی اہلِ سخن پانی میں

لبِ ڈل آپ کا کاشانہ بنا لیں ناظرؔ
موسمِ گل میں رہے لطفِ سخن پانی میں

آخری شعر میں انہوں نے مشاعروں اور شعری محفلوں کی طرف اشارہ کیا ہے

جو "انجمن مفرح القلوب" کے اہتمام سے کبھی کبھی اُن کے مکان پر بھی منعقد کی جاتی تھیں۔

چودھری خوشی محمد ناظؔر کا مذاقِ سخن شستہ تھا۔ حالیؔ اور شبلیؔ کے اثر سے وہ جدید انداز کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور سر شیخ عبدالقادر کے ساتھ مل کر وہ "مخزن" کے ذریعہ نئی شاعری کو مقبول بنانے میں کام کرتے رہے۔

ناظؔر کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کی طرف اُن کا طبعی میلان کم تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار وہ خود بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: مجھے نہ کوئی معشوق ملا۔ اور زندگی میں عاشق ہونے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا۔ بازاری عشق اور عامیانہ راز و نیاز سے میں ہمیشہ متنفر رہا۔ اور رسمی غزل سرائی کو محض نقالی سمجھتا رہا۔ لیکن کبھی کبھی احباب کی خاطر مولانا حالیؔ کے انداز اور اسلوب میں نیچرل رنگ میں غزل بھی کہتا رہا اور مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ اُن کی غزلوں سے چند اشعار ؎

بُجھائیں پیاس کہاں جا کے تیرے مستانے
جو ساقیا درِ میخانہ تو نہ باز کرے
نہیں وہ لذتِ آزارِ عشق سے آگاہ
ستم میں اور کرم میں جو امتیاز کرے
انہیں کے حُسن سے ہے گرم عشق کا بازار
دُعا خدا سے ہے عمرِ بتاں دراز کرے
ہوا و حرص سے ناظؔر رہے جو پاک نظر
تو ہمسری نہ حقیقت کی کیوں مجاز کرے

٥

کس کی چشمِ مست یاد آتی رہی ہے نیند کیا آنکھوں سے مری جاتی رہی

دل تو شوقِ دید میں تڑپا ہے کیوں آنکھ ہی کم بخت شرماتی رہی

زندگی سے ہم رہے نا آشنا سانس گو آتی رہی جاتی رہی

○

نئے نیرنگ دکھلاتا ہے یہ چرخِ کہن کیا کیا

جہاں میں گل کھلائے گی ابھی خاکِ چمن کیا کیا

جہاں کی سربلندی کا مآل کار پستی ہے

نشاطِ عیشِ منعم پر ہے مفلس خندہ زن کیا کیا

اسی حسنِ ازل کی لوحِ عالم پر ہیں تحریریں

وہی اک عشق کا مضموں ہے اندازِ سخن کیا کیا

○

سرسید کی وفات پر ناظر نے جو مرثیہ لکھا ہے۔ وہ بڑا دلگداز اور پُر درد ہے۔ اس کے ایک ایک شعر سے ان کا خلوص اور احساسات و جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ قومی زندگی میں سرسید مرحوم نے جو رول ادا کیا تھا اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے ؎

ہائے وہ خورشید انور چہرۂ تاباں ترا

ہائے وہ ماہ منور عارض رخشاں ترا

وہ نگاہیں جانفزا اور وہ ادائیں دلربا

وہ جبیں دلکشا وہ دل فروز عنوان ترا

نٹ ناظر نہ صرف یہ کہ سرسید تحریک کے سربرآوردہ تھے بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے ایک دردمند دل بھی رکھتے تھے۔ وادی کے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھ کر ان پر کیا گزرتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یہاں انتظامی ڈھانچے میں ایسی اصلاحات نافذ کیں جن کے نتائج وادی کے اکثریتی فرقے کیلئے سودمند ثابت ہوئے۔ (ادارہ)

ہائے اس ریشِ مبارک پر وہ بارش نور کی

شام پیری میں بیاضِ صبح نورافشاں ہوا

ہائے وہ جان بصیرت تیرا نورانی دماغ

ہائے وہ کانِ محبت سینۂ سوزاں ترا

وہ تری شانِ جلالی وہ ترا رعبِ جمال

پڑ گئی جس پر نظر تھا بندۂ فرماں ترا

مہدیٔ مشتاق ہمدم شبلی و حالی ندیم

اور زین العابدین وہ خاصۂ خاصاں ترا

بام و در کالج کے ہیں تیرے لئے اب سرنگوں

مرثیہ خواں بن گیا ہر کاخ در ایواں ترا

دل سے خشت و سنگ کے کالج میں اٹھے ہے دھواں

کیا ہوا میر عمارت با خانہ ویراں ترا

تا جہاں میں ہے تیرے نانا کی اُمت کو بقا

قوم میں ماتم رہے گا سید احمد خاں ترا

بندہ پرورا وقتِ رخصت یاد فرمایا نہ کیوں

ناظرِ مہجور تھا وابستۂ داماں ترا

مولانا حالی ناظر کے استاد تھے اور ان کے کلام پر اصلاح دیتے رہے۔ ناظر کے کلام پر ان کی گہری چھاپ ہے۔ ناظر کو ان کے ساتھ بھی بڑی عقیدت رہی ہے۔ چنانچہ حالی کی وفات پر ناظر نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ انکی عقیدت کا زندہ ثبوت ہے

تھی نوا خواجہ حالی کی سرودِ افلاک

حال دوران جو وہ کہتا وہی رہتا ہو کر

غمِ ویرانیٔ ملت سے جو وہ گھلتا رہا

گل ہو آیا جیسے باغ رہ صحرا ہو کر

آہ! روتا تھا جو کل ایک جہاں کے غم میں

اس کو روتا ہے جہاں والہ و شیدا ہو کر

غیر فانی ہیں ابد تک وہ نقوش قدسی

روح قوموں میں جو پھونکیں دمِ عیسیٰ ہو کر

باغِ فردوس میں یارب ہو مقام حالی

باغ رضوان میں ہے وہ چمن آرا ہو کر

چودھری خوشی محمد ناظر جب پہلی بار علی گڑھ کے کالج میں داخل ہوئے تھے تو ان کی زندگی میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا تھا اور وہ یہاں کے ماحول کو دیکھ کر بہت ہی متاثر ہوئے تھے۔ زندگی میں انہوں نے ایک نیا احساس، شعور اور نیا ولولہ دیکھ لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حالی کی قومی شاعری کا رنگ و آہنگ اپنایا تھا۔ وہ بدلے ہوئے حالات میں نئے ماحول سے سازگاری حاصل کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تلقین میں وعظ کا انداز کہیں پیدا نہیں ہونے پاتا۔ بلکہ وہ اس معاملے میں لطیف اشاروں، کنایوں اور دلچسپ و عبرت ناک مثالوں سے کام لے کر اپنے بیان میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں تاکہ سننے والے کے کانوں پر بار نہ ہو۔ "روضہ تاج" نظم کے یہ چند شعر اس کی اچھی مثال ہیں ؂

کچھ بتا احوال دل اے منزلِ خاموش زبان!

کیوں نظر آتا ہے حسرت خیز تیرا آستاں؟

دل بھر آیا انقلابِ چرخِ گرداں دیکھ کر

ہستیٔ معصوم کا انجام ساماں دیکھ کر

روضۂ ممتاز میں عبرت کے ساماں دیکھ کر

صفحۂ دیوار پر آیاتِ قرآں دیکھ کر

مے کند از گوشِ ناظر پنبۂ غفلت بروں

از در و دیوار او آیات لایستاخرون

ناظر جب پہلی بار کشمیر آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی جگہ ایسی نہیں جو سر سبز و شاداب نہیں۔ کوئی مقام ایسا نہیں جس کے نظارے سے دل شگفتہ نہ ہو۔ چپے چپے پر نہر و آبشار ہے۔ کیا کوہستان اور کیا میدان تمام خطہ ایک سدا بہار گلزار ہے۔ کوسوں تک سبزہ زار ہی سبزہ زار ہے۔ پھر سبزہ بھی کیا گویا اس پر سفید موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ زمین ایسی صاف اور سوکھی کہ اس پر سو رہنے کو جی چاہتا ہے۔ پھر مجال کیا کہ کپڑے پر داغ لگ جائے۔ کہیں نرگس ہے کہیں سوسن، کہیں گُلِ لالہ کھلا ہوا ہے اور کہیں نسترن اور کہیں گلاب کے پھولوں سے جنگل بھرا ہے اور ناظر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا — مری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا

مگر عالم میں اے گلزارِ کشمیر — کوئی خلدِ بریں تجھ سا نہ دیکھا

چمن زاروں میں آبِ جو کا منظر — وہ موجِ سیم کا لہرانا دیکھا

وہ کوہِ برف پر تنویرِ خورشید — پھر ایسا آتشیں دریا نہ دیکھا

نخلِ چنار جمالیات کشمیر کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس کی شان میں ناظر نے ایک نظم رسالہ شباب اُردو میں اگست ۱۹۲۲ء کے شمارے میں شائع کرائی تھی اس نظم کے چند شعر اسی رسالے سے پیش کئے جاتے ہیں ؎

قسمت پہ اپنی مجھ کو اگر اختیار ہوتا

میں گلشنِ جہاں میں نخلِ چنار ہوتا

ریحاں میں یاسمن میں نسریں میں نسترن میں

میں خیمہ زن چمن میں لیل و نہار ہوتا

شاخِ گلاب مجھ سے گلشن میں یوں ہے ہنستی

گردن میں میری گویا پھولوں کا ہار ہوتا

آمد یہ فصلِ گل کی خیمہ مرا چمن میں

باغِ نشاط ہوتا یا شالیمار ہوتا

گلمرگ سے اُترتیں سرخ اور سفید پریاں

اِندر کا بھی اکھاڑہ جن پر نثار ہوتا

جب آتشیں رخوں سے برقِ جمال گرتی

یہ شالامار اُس سے اک شعلہ زار ہوتا

صدیاں گزرتی جائیں، دنیا بدلتی رہتی

وضعِ کہن یہ ناظر میں استوار ہوتا

میدان چنگ تھنگ لہاسہ اور لداخ کے درمیان ایک سطح مرتفع ہے۔ یہاں کوئی آبادی نہیں۔ جب ناظر نے ۱۹۰۶ء میں یہاں کی سیر کی تھی تو سوائے سبزہ زاروں اور کوہساروں کے کوئی چیز نہ دیکھی تھی۔ چنانچہ ناظر نے اپنے تاثرات کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے ؎

آ گئے ایسی جگہ ناظر جہاں کوئی نہیں

گردِ رہ کوئی نہیں اور کارواں کوئی نہیں

ہم سفر اپنا بجز آبِ رواں کوئی نہیں

ہم نفس ہمدم بجز بادِ وزاں کوئی نہیں

شورِ ناقوس اور آوازِ اذاں کوئی نہیں

نغمۂ سبیح و بہ چمن کا یہاں کوئی نہیں

گل نہیں، بلبل نہیں نسترن سنبل نہیں

مرغ خوش الحاں کا چمن میں آشیاں کوئی نہیں

ناظر آنکھیں بند کر کے اب خدا کو یاد کر

تیرے چشم و گوش کا واقف یہاں کوئی نہیں

"شمشاد کشمیر" ناظر کی ایک اور معرکتہ آرا نظم ہے سری نگر کشمیر میں وزیر بنول کی یادگار، وزیر باغ میں عرصہ تک ناظر کا قیام رہا۔ یہ وسیع رقبہ اقبال پارک اور رام سنگھ کالج کے درمیان واقع تھا اور ایک زمانے میں اپنی خوبصورتی اور شادابی میں بے نظیر تھا۔ یہاں سفید رنگ کے گلاب اور گوناگوں اشجار اور اثمار کے درخت بھی تھے۔ ناظر صبح و شام یہاں کے منظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ یہاں کی تنہائی سکون اور خاموشی سے راز و نیاز کا معاملہ بنا رہا ہے

صبحدم آئی گلستاں سے نسیم مشکبار

کر رہا تھا مدتوں سے جس کا ناظر انتظار

سبزہ و گل کی چمن میں تھیں وہ رنگ آرائیاں

کر رہی تھی فرش مخمل پہ صبا نقش و نگار

قابل نظارہ تھا وہ جلوۂ باغ وزیر

گل چمن اندر چمن سبزہ بہار اندر بہار

ہر طرف صحن چمن میں پھول ڈالوں کی تھی سیر

گل بہ کف تھے ناشپاتی سیب انار اندر انار

"کانگڑی" بھی ناظر کی ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم "انجمن مفرح القلوب" کے دنوں کی یادگار ہے۔ کانگڑی کو دیکھ کر شاعر کے دل پر جو اثرات طاری ہوئے

ہیں ناظر نے ان کو اپنے اشعار پیش کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے یہ نظم کو پڑھ کر اس دور کے کشمیر اور کشمیریوں کی زندگی کی تصویر نظر آتی ہے۔

اے مری آرام جاں، اے میری دلبر کانگڑی
مہر گستر کانگڑی، اے روح پرور کانگڑی

وادئ کشمیر یہ ہے وادئ ایمن کو رشک
دیکھ کر جلوہ ترا، اے طور منظر کانگڑی

عاشق دل سوختہ کا ہے مزار گنبدی
یا کسی سیمیں بدن کا حجلۂ زر کانگڑی

تن بدن میں اُن کے غورا رشک سے لگ جائے آگ
قاف کی پریاں جو دیکھیں تیرے شہر کانگڑی

اس سے تو رخشندہ تر ہے اس سے تو تابندہ تر
جام جم ہے کانگڑی، تاج سکندر کانگڑی

ناف میں تیری نہاں ہے نافۂ آہوئے چین
ہے رگ و ریشے میں تیرے عود و عنبر کانگڑی

اس کی گرمی سے فلک پر ہے دماغ اہل بزم
گاہ ساقی کانگڑی ہے گاہ ساغر کانگڑی

خویش و بیگانہ سے اس کا رشتہ پیوند ہے
شوئے بانو کانگڑی، بانوئے شوہر کانگڑی

برف و باراں میں فزوں ہوتی ہے اس کی آب و تاب
برف کے دریا میں ہے ہر سو شناور کانگڑی

ابر کے سائے میں چلتا ہے درخشاں آفتاب
یا پھرن کے پھیر میں کرتی ہے چکر کانگڑی

گنبد بوسیدہ میں ہے مرقد نور جہاں
یا اندھیری کوٹھری میں تاج اختر کانگڑی

چھوڑ کر تجھ کو بخاری کا جو دم بھرنے لگے
پڑ گئے گویا سمجھ پر اس کے پتھر کانگڑی

پوستین میں کانگڑی ہے آستین میں کانگڑی
کانگڑی زیرِ "پھرن" ہے، زیرِ چادر کانگڑی

رشک سے جل بھن مریں منقل، بخاری اور سٹو
یہ تو ہیں استادہ بر در تو ہے در بر کانگڑی

خلد میں کشمیر والوں کا رہے گا جی اُچاٹ
گر نہ اس جنت میں پہونچی حور پیکر کانگڑی

حال پر اس کے رہے سرکار کا الطاف خاص
تیری بندی دل سے ہے اے شاہِ کشور کانگڑی

ہانجی اور ہانجن میں باہم گر کبھی چھڑ جائے جنگ
روکتی ہے "ہمنلو" کا حملہ اکثر کانگڑی

داغ دیتی ہے دلوں پر اپنے دلداروں کے یہ
لیٹ جاتی ہے جو بستر پر مچل کر کانگڑی

بچہ کاشر کو ہے اک شانِ مادر کانگڑی
بعد مردن نورِ گستر بھی لحد پر کانگڑی

منتظر مدت سے ناظرؔ بھی ہے اس دن کے لئے
جب گورنر کانگڑی ہو اور منسٹر کانگڑی

شکرِ احساں سے ترے غافل تھے اہلِ کاشر
اس لئے ناظرؔ بنا تیرا ثنا گر کانگڑی ؏

ناظر نے ایک نظم "نغمۂ فردوس" کے عنوان سے لکھی تھی جس میں شہنشاہ

؏ یہ مصرع یوں بھی لکھا گیا ہے ؎
"اس لئے ناظر ہوا تیرا ثنا گر کانگڑی" ـــ (ادارہ)

نورالدین جہانگیر کے عہد کی ایک محفل سرود کا نقشہ کھینچتے ہوئے کشمیر کے بارے میں
مشہور شعر ے

اگر فردوس بر روئے زمیں است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

کی تضمین بڑی خوبی سے کی ہے نظم کے کچھ شعر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ے

ادھر اک وارثِ اورنگ اکبر — جلوسِ خسروی فرما رہا تھا

شہ جم نورالدین جہانگیر — شکوہ بزم جم دکھلا رہا تھا

ادھر نور جہاں کا جلوۂ حسن — در و دیوار کو چمکا رہا تھا

ادھر محو نوا سرمست مطرب — سرودِ آسمانی گا رہا تھا

یہ نقشہ دیکھ کر بزم شہنشاہ — سروش غیب یہ فرما رہا تھا

"اگر فردوس بر روئے زمین است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است"

سنہ ۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال، آنریبل میاں شاہ دین محمد، میر محمد شفیع، شیخ
عبدالقادر اور دیگر کئی سربرآوردہ شخصیتیں کشمیر کی سیر کے لئے آئی تھیں۔ اُنکی
ہمراہی میں انہوں نے مختلف مقامات کی سیر کی۔ ان میں نہر لمبودری کے کنارے
کی سیر کا ذکر اس نظم میں کیا گیا ہے اور نظم کا عنوان ہی "لمبودری" ہے ے

کیا آب و تاب تجھ میں نہر لمبودری ہے

ہر بت کی تو ہے دیوی یا قاف کی پری ہے

آب حیات تو ہے روح نبات تو ہے

ہے تجھ سے دل کو ٹھنڈک اور آنکھ کو تری ہے

تو کھیلتی ہے بن میں اور لوٹتی چمن میں

نسرین و نسترن میں تیری مصوری ہے

گہنا رہ رنگیلی ریحان و نیلی نیلی

وہ شال پیلی پیلی کیسی ہری بھری ہے

ناظر نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور ان میں بھی مختلف مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ان کے کلام کی پختگی و شائستگی معلوم ہوتی ہے۔ اور ان کی استادانہ روش کا بھی پورا پورا احساس ہوتا ہے اور ان میں حالی کا رنگ نظر آتا ہے۔ یہ رباعیاں بڑی پُر اثر ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں درد موجود ہے ؎

مضمر ہے تغیر میں بقائے ہستی
ہے ردّ و بدل سے ارتقائے ہستی
ملبوس بہار کیوں آتا نہ رہے خزاں
فطرت کو بدلتی ہے قبائے ہستی

o

وہ شعر و غزل کا اب زمانہ نہ رہا
وہ مطرب عشق کا ترانہ نہ رہا
بدلی ہے فضائے دشت و صحرا ہمدم
وہ نجد میں قیس کا فسانہ نہ رہا

o

زردار کی یہ ہوس پرستی کب تک
بے زر پہ عذاب فاقہ مستی کب تک
تہذیب و تمدن کا یہ تحفہ تا کے
یہ لعنت کار زار ہستی کب تک

o

غرض ان کی شاعری جدید شاعری کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ ناظر عصر اصلاح کے اُن نامور شعرا میں سے ہیں جنہوں نے جدید اُردو شاعری میں ایک حد تک اپنے استاد مولانا حالی کی پیروی کر کے اُسے عام کر دیا۔ انکی شاعری اسلوب و خیال کی سادگی کی بدولت بہت مقبول ہوئی۔ اور اُن کے کلام میں وہی نیا رنگ و آہنگ ہے جو ہماری جدید اُردو شاعری کا جزو لاینفک سمجھا جاتا ہے۔ انقلاب اُنکی ایک اور نظم ہے اس میں انہوں نے بدلتی ہوئی دنیا کا نقشہ کھینچا ہے ؎

دورِ گردوں میں نیا اک انقلاب آنے کو ہے

میکدے میں محتسب مستِ شراب آنے کو ہے

تاجِ سلطانی پہ اب وہ ظلِ سُبحانی نہیں

خسروی زیرِ لوائے انتخاب آنے کو ہے

ٹھن گئی سرمایہ داری اور مزدوری میں جنگ

دیکھیں کون اس معرکے سے کامیاب آنے کو ہے

اب دلوں سے راحت و صبر و سکون جانے کو ہے

احتیاج و احتیاج و اضطراب آنے کو ہے

ناظر کو اہلِ وطن کی نا اتفاقی پر سخت رنج ہوتا ہے۔ اور وہ ان کو اتفاق و اتحاد کی تلقین کرتے ہیں، تاکہ وہ انگریز کے چنگل سے آزاد ہو کے رہ جائیں سے

کاش شیخ و برہمن مل کر کریں کچھ روک تھام

ورنہ بھارت پر کوئی بھاری عذاب آنے کو ہے

بلبل و قمری گلستاں میں رہیں ہم داستاں

ورنہ کوہستاں سے چنگل عقاب آنے کو ہے

خمانہ جنگی سے کٹے مرتے ہیں بھارت کے سپوت

ناظر اس منظر سے با چشم پر آب آنے کو ہے

ناظر کے دل میں ہندوستان کی محبت کا جذبہ موجزن ہے ـــ وطن کی آزادی کے لئے تڑپ ہے۔ ان کا حساس دل محسوس کرتا ہے کہ ان کا وطن غیروں کے تسلط میں ہے۔ انہوں نے بھی وطن کی عظمت کے راگ الاپے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جو قومی ترانے گائے ہیں ان کو دیکھ کر ان کے احساسات اور جذبات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قدرت نے ان کو انتہائی شیفتگی عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مشاہدات

کو اس قدر دلکش انداز میں پیش کرتے کہ پڑھنے والا مسحور سا ہو جاتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان میں جو سادگی، سلاست اور روانی ہے وہ ان کے طرز ادا میں اور بھی جان ڈال دیتی ہے۔ قومی ترانے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

ہائے میرا جان سے پیارا وطن — ہائے میری آنکھوں کا تارا وطن
یہ میرا ہندوستاں جنت نشاں — یہ مرا فردوس نظارا وطن
نہ ہمالے پر شعاع مہر سے — صبحدم جلووں کا فوارہ وطن
کوئلوں اور قمریوں کا نغمہ زار — سرو و سنبل کا یہ چمن آرا وطن
اولیاؤں اور اوتاروں کا گھر — عشق و عرفاں کا گہوارہ وطن
اپنے بیگانوں کا ٹھکرایا ہوا — پھوٹ کا اور لوٹ کا مارا وطن
جو کہ تھا جس کے غلاموں کا غلام — ہائے بے چاروں کا بے چارا وطن
مشرق و مغرب کی روزی کا کفیل — بھوک اور افلاس کا مارا وطن

ناظر سیکولر آدرش کے علمبردار ہیں۔ ان کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ ہندوستان آزاد ہو جائے گا مگر ہندوستانیوں کی نا اتفاقی اور تفرقہ بازی نے وطن کی عظمت پر دھبہ لگایا ہے۔ وہ اہل وطن کو اپنی پر درد لے میں سمجھانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں ؎

مسجد و مندر میں پیکار کیوں — یہ نزاع سبحہ و زنار کیوں
ہمنوا ہمدم تھے ناقوس و اذاں — ان میں اب چلنے لگی تلوار کیوں
ان بتوں کی بھی خدائی تھی کبھی — بندگی سے ہو نہ ان کو عار کیوں
اب جو کعبہ تھا کبھی بت خانہ تھا — ہیں بتوں سے شیخ جی بیزار کیوں
اے گرو کے لال اے گیسو دراز — ہوں یہ برہم گیسوئے خمدار کیوں
وہ موحد اور وحدت کیش کو — تیری مسلم سے رہے تکرار کیوں

لیڈروں کا کیوں یہ غوغا ہر طرف ۔۔۔ انہوں پر چھا گئے اغیار کیوں
ہے یہ جلسوں کے جنازے کس لئے ۔۔۔ یہ تماشا بر سر بازار کیوں
ملک میں ان بن کا یہ پرچار کیوں ۔۔۔ یہ وطن پر پھوٹ کی پھٹکار کیوں
کیوں غنی محتاج سے کھنچتا رہے ۔۔۔ دامن گل سے نہ ہٹے خار کیوں

°

عید پنڈت کو منانا چاہیئے ۔۔۔ شیخ کو ہولی کھلانا چاہیئے
اور یہ دونوں بگڑ بیٹھیں اگر ۔۔۔ ان کو گنگا میں گرانا چاہیئے

°

سری نگر میں ناظر کے نشیمن کے قریب سلیمان پہاڑی کے دامن میں ایک اُلو نے اپنا گھونسلا بنایا تھا۔ شام وسحر کی ہوا خوری میں بلاناغہ اس کی موسیقی ناظر کے گوش گذار ہوتی تھی۔ ذیل کے اشعار میں اس راہبِ غار نشین کی ترجمانی ناظر نے کس انداز سے کی ہے، اہل ذوق داد دے سکتے ہیں؎

میں اُلو ہوں اللہ والا ۔۔۔ ہو کے ترانے گاتا ہوں
اللہ ہو کے نعروں سے ۔۔۔ سوتے پربت کو جگاتا ہوں
دنیا فانی کے دیوانے ۔۔۔ فرزانے کہلاتے ہیں
اللہ اللہ کرنے والا ۔۔۔ میں اُلو کہلاتا ہوں
غاروں کی طلسماتوں میں ۔۔۔ سنسان اندھیری راتوں میں
حرص و ہوا کی آگ بجھا کر ۔۔۔ من کی جوت جگاتا ہوں
شہروں کے ہر فتنہ و شر سے ۔۔۔ میرا بسیرا اونچا ہے
چھینٹوں سے اس پاپ نگر کے ۔۔۔ دامن اپنا بچاتا ہوں
شاہ و گدا کے کان میں ہر دم ۔۔۔ دور فلک یہ کہتا ہے

مزدوروں کے در پہ گردن | فغفوروں کی جھکاتا ہوں
تو بھی پالی پیٹ کے بندے | میری نوائیں کیا سمجھیں !
ناظر ہے اس رنگ کا رسیا | اس کو گیت سناتا ہوں

ناظر کی بیشتر نظمیں اصلاحی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔ ان نظموں میں شاعر نے زندگی کے حقائق بڑے دلکش انداز میں پیش کئے ہیں خاص طور مناظر فطرت کی عکاسی تو ایسے والہانہ انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والا جھوم جھوم جاتا ہے ۔ یہ موضوعات باوجودیکہ اس دور کی اردو شاعری میں عام ہو چکے تھے لیکن ناظر نے ان میں اپنے حقیقی جذبات اور عینی مشاہدات کا رنگ بھر کر جاذب نظر اور سبق آموز بنا دیا ہے اور ان کے اسلوب میں بڑی روانی و صفائی پائی جاتی ہے زبان بڑی شستہ و صاف ہے ۔

ناظر کا مجموعہ کلام "نغمہ فردوس" دو جلدوں میں ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا لیکن افسوس کہ ان کی سوانح عمری اور وہ مقدمہ شاعری جو انہوں نے مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے انداز پر لکھا تھا، اب تک شائع نہیں ہو سکا ۔ ورنہ اس مخلص و ادب دوست کے حالات اور اس کی زندگی اور اس کے نظریہ شعر کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوتیں ۔

ناظر کی ذات کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی کہ اگر انکی فارسی شاعری کے بارے میں کچھ نہ لکھا جائے ۔ ناظر کو بچپن سے ہی فارسی شاعری کے ساتھ بھی دل چسپی رہی ہے ۔ اس سلسلے میں ناظر نے مولوی نور الدین انور سے فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی ۔ چنانچہ ان کی نظم جو انہوں نے غوث الاعظمؒ کی مدح میں ۱۸۸۱ء میں کہی تھی، اگر اس وقت موجود نہیں ہے تاہم اس کا ایک مصرعہ بلبل طبعم بہ باغ وصف تو پرواز کرد جواں کے استاد اولیں مولوی نور الدین کی اصلاح کے بعد یہ شکل اختیار کر گیا تھا

"بلبل طبعم بہ باغ وصف تو رنگین نوا است" دس سال کی عمر میں ناظر کی کوشش فارسی دانی اور موزون طبعی کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے بی اے کے امتحان کے ساتھ ہی فارسی اور انگریزی میں آنرز کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس لئے فارسی زبان و ادب پر بھی ان کو کافی عبور حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ غلام محمد، جو گجرات ہائی سکول میں فارسی کے استاد تھے، فارسی ادب کے بڑے عالم تھے اور انہی کی تحریک پر ناظر نے فارسی شروع کی تھی۔ شیخ غلام محمد نے ناظر کو سرسید کی مشہور فارسی غزل پر غزل لکھنے کی ہدایت کی۔ سرسید کی فارسی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم
مسیحا رشک میدارد بہ درمانے کہ من دارم

ناظر نے حکم کی تعمیل کی اور غزل لکھ کر سرسید کی خدمت میں پیش کی جس کا مطلع یہ تھا ؎

رسد این بام و در در سفرۂ جانم بوی پیراہن
بہر کو یوسفے باشد بہ کنعانے کہ من دارم

سرسید نے ناظر کی غزل کو بہت ہی پسند کیا تھا۔ لارڈ کرزن جب لاہور کے کالج میں آئے تو پرنسپل نے ناظر کو ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ چنانچہ ناظر نے قصیدہ لکھا۔ لارڈ کرزن فارسی زبان کے عالم تھے اور فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اس قصیدے کے چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

مژدۂ عیش و طرب با اہلِ دوراں آمدہ
خرمی را در جہاں صد ساز و ساماں آمدہ
سکہ زد در بزمِ عالم نیّرِ گیتی فروز
درنثار او زرافشاں صبح خنداں آمدہ

از شعاعِ مہرِ تابانِ کوہ برف آمدہ ام شکست

سنگہا شد آب و ہر کیست عطا شان آمدہ

از ہجومِ لالہ و گل ہمچو صحنِ بوستان

کوہ و صحرا جلوہ گاہ تیغ الوان آمدہ

در زبانِ فارسی ناظرؔ شدم شکر شکن

زانکہ اہلِ فارس در یادِ شمع غزل خوان آمدہ

مولانا شبلی جب ترکی سے ہندوستان آئے تو ناظرؔ نے ان کی تشریف آوری پر فارسی کے مشہور شاعر رودکی کے قصیدے کے رنگ میں ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں :-

بازہ ہنگامِ گل و سرو سمن آید ہمے — بلبلِ گم گشتہ در بزمِ چمن آید ہمے

زینتِ این بزم و زیبِ انجمن آید ہمے — آن ادیب و شاعرِ شیرین سخن آید ہمے

ناظرؔ کا اکثر فارسی کلام ضائع ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے۔ تاہم ان کے بعض فارسی اشعار "نغمۂ فردوس" میں موجود ہیں۔ کشمیر میں انہوں نے ذیل کی فارسی غزل لکھی تھی :-

درین رہ ہمعنان ہمرہانم — بہر و ہر جا کہ خواہد کاروانم

نمی دانم نشانِ منزلِ دوست — مگر محوِ سرودِ ساربانم

درین منزل گہے بانگِ درایم — گہے گرد و غبارِ کاروانم

زمین و آسمان جولانگہِ من — مہ و خورشید و انجم ہمرہانم

بیادِ عارضِ تابندۂ اوست — چو حافظ درسِ قرآن خوش بخوانم

من آن مرغم کہ از بانگِ سحرگاہ — نوا آموزِ دشتِ گلستانم

ز داغِ دل درونم لالہ زاریست — بیا بنگر بہارِ بوستانم

خزانم خوشتر از فصل بہاری   قفس بہتر ز عیش آشیانم
دریں وادی من سرگشتہ ناظر   صدائی بازگشت رفتگانم

ناظر نے فارسی کے قدیم اساتذہ شعرا کی طرح نصیحت آمیز باتیں اپنے فارسی اشعار میں بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

غم و شادمانی بہم در ستیز   بہ داماں گل خار آویخت است
تو از یار و اغیار بیگانہ باش   کہ ہر یار با یار آویخت است

ناظر نے فارسی رباعیاں لکھی ہیں۔ ان میں خیام کی رباعیوں کا انداز ملتا ہے، تاہم ان میں لطافت، تاثیر اور تازگی کچھ اور ہی ڈھنگ کی ہے۔ فارسی میں ناظر نے جو کچھ بھی کہا ہے وہ نہ صرف مضمون کے لحاظ سے بلکہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بلند ہے۔ ناظر کا یہ شعر بہت ہی مشہور ہو گیا ہے ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

ناظر نے کشمیر میں اپنی ملازمت کے دوران جہاں یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا وہیں وہ یہاں کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی بھی بھرپور کوششیں کرتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں ان ہی کی تحریک پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مسلمانوں کی تعلیم و ترقی کا جائزہ لینے کی غرض سے یہاں آنا چاہتے تھے تو مہاراجہ نے اُن کے یہاں داخلہ پر کچھ پابندیاں عائد کر دیں جو ناظر نے ہی اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ہٹوالیں اور وہ یہاں آ سکے۔

۱۹۱۲ء میں جب کہ وہ گورنر کے عہدے پر فائز تھے انہیں خانصاحب کا خطاب ملا اور اس کے چند سال بعد خاں بہادر کا۔[۱]

---

[۱] ڈاکٹر انوار احمد خاں صاحب کا کہنا ہے کہ اس کی اطلاع ہمیں فروری ۱۹۱۷ء کے مخزن سے

۱۹۲۵ء میں ناظر کشمیر سے وظیفہ یاب ہو کر سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے ایک چودھری حمید اللہ خاں۔ وہ بڑے کامیاب وکیل، مقرر اور قانون داں تھے، وہ ریاستی پرجا سبھا میں مسلم کانفرنس گروپ کے لیڈر تھے اور بڑے نڈر اور شیر دل انسان تھے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان چلے گئے اور ۱۹۵۷ء میں وفات پائی۔ ان کے دوسرے فرزند فیض اللہ تھے۔ وہ بارہمولہ میں وزیر وزارت کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان چلے گئے۔

(بقیہ صفحہ نمبر ۱۷۶) ملتی ہے۔ اس وقت بھی وہ گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۹۱۷ء میں خان بہادر کا خطاب ملنے پر اس زمانے کے سب سے بڑے ہوٹل "نیڈوز" میں ان کے احباب کی طرف سے ایک شاندار جلسہ منعقد کیا گیا جس میں تقریباً سبھی افسران، معززین اور رؤسائے کشمیر نے شرکت کی۔ کئی حضرات نے ناظر کی شان میں قطعات اور قصیدے پڑھے۔ یہ ساری کارروائی مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر انوار احمد صاحب نے پنڈت گوپی کشن مدن کا ایک قطعہ بھی نقل کیا ہے ؎

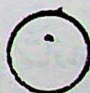
خوشی سے لبریز کیوں نہ ہوں ہم نہ شادمانی سے دل ہو کیوں پر
ملا گورنر کو ہے ہمارے خطاب و اعزاز خان بہادر
ہمارے منصف مزاج حاکم ہیں اہل کشمیر جن کے شیدا
دلوں کو تسخیر کر رہے ہیں یہ کامیابی کا اُن کی ہے گر
زبحر تاریخ غوطہ زن شد مدن چو در قلزم معانی
بگفت ہاتف کہ کن مزین خوشی محمد بہ خان بہادر

("شیرازہ" جلد ۲۷۔ شمارہ ۱) ۔۔ (ایڈیٹر)

نہ ڈاکٹر انوار احمد خان صاحب کی تحقیق کے مطابق ناظر ۱۹۱۸ء میں کسی وقت کشمیر کے ریونیو منسٹر ہوئے ہوں گے اور ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی وفات کے بعد اس عہدہ سے انہوں نے سبکدوشی اختیار کی ہوگی کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ریاست رامپور کے نواحی علاقوں میں نو آبادیات کا کام شروع ہونے والا تھا۔ ناظر اس سے باخبر تھے اور نو آبادی کا کام اپنے ذمہ لینا چاہتے تھے۔ اس کی اطلاع رامپور گزٹ سے ملتی ہے۔ دسمبر ۱۹۲۳ء کے گزٹ میں لکھا ہے:

سنہ ۱۹۴۴ء میں ناظر نے انتقال فرمایا۔ اور کشمیر میں کوہ سلیمان کے دامن میں دفن ہوئے۔ محمد امین داراب نے تاریخ وفات لکھی ؎

دریغا کہ شد در بزم ادب ۔۔۔ ہمہ تیرہ از مرگ ناظر چو شب
بباغ ادب بلبل نغمہ سنج ۔۔۔ کہ بودش بدل از سخن گنج گنج
گہے حکمرانی ہمہ عدل و داد ۔۔۔ دم نغمہ سنجی بفن اوستاد
بعہدش ز رشوت نشانے نماند ۔۔۔ ز بیداد جز داستانے نماند
بدل خواستے دائم آں حق پرست ۔۔۔ رسیدن بفریاد ہر زیر دست
وفاتش بدل داد رنجیدگی ۔۔۔ کہ با او شدہ دفن سنجیدگی
کشادم پئے صید تاریخ شست ۔۔۔ گزیدہ دو تاریخ آمد بدست
یکے ہجری آں خوش تمیز اے عزیز ۔۔۔ دگر عیسوی شاعرے خوش تمیز
۱۳۶۳ ۔۔۔ ۱۹۴۴



(بقیہ صفحہ نمبر) "خان بہادر خوشی محمد خان، مہتمم بندوبست بوجہ خرابی صحت مستعفی ہونا چاہتے ہیں اور سبکدوشئ خدمات سے قبل دو ماہ کی رخصت بلا تنخواہ کے خواستگار ہیں۔ لہٰذا ان کی استدعا کے موافق یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ء سے دو ماہ کی رخصت منظور کی جاتی ہے اس کے بعد وہ ریٹائر ہو جائیں گے"۔

("شیرازہ" ۔ جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۱۰) ۰ ۔ ایڈیٹر

ہ اُن کے انتقال کی تاریخ ۳۰ ستمبر اور یکم اکتوبر کی درمیانی شب بتائی جاتی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے ان کے انتقال کی خبر سننے کے بعد "معارف" دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء میں تحریر فرمایا۔ "کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء کی رات کو مُرجھا کر گر گیا یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضۂ فالج وفات پائی"۔

("شیرازہ" جلد ۲۷ ۔ شمارہ ۱۰) ۰ ۔ (ایڈیٹر)

کتابیات

۱۔ نغمۂ فردوس۔ ج ۱ و ۲، ۔ مرتبہ مولوی محمد عبداللہ ایم اے لائل پور

۲۔ جدید شعرائے اُردو، فیروز سنز مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

۳۔ رسالہ شباب اُردو۔ اگست سنہ ۱۹۲۲ء

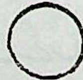
۴۔ رسالہ مخزن۔ شیخ عبدالقادر۔ سنہ ۱۹۱۰ء، سنہ ۱۹۱۱ء، سنہ ۱۹۱۲ء

۵۔ دانش شعبہ فارسی کشمیر یونیورسٹی سنہ ۱۹۸۲ء

۶۔ جدید شاعری عبادت بریلوی اُردو دُنیا لاہور

۷۔ کشمیر میں اردو۔ ج ۲، از سروری مطبوعہ کلچرل اکادمی

۸۔ لداخ کی کہانی۔ محمد امین پنڈت (سنہ ۱۹۶۲ء)



مولوی محمد عبداللہ وکیل

مولوی محمد عبداللہ وکیل کے والد کا نام محمد صدیق لون تھا جو گمی پورہ تحصیل شوپیاں کشمیر کے دُور افتادہ گاؤں میں زمینداری کیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی۔ ایام طفولیت کے بعد آپ بھی زمینداری کرنے لگے۔ سردیاں گذارنے کے لئے راجوری والدین کے ساتھ پیدل جایا کرتے تھے اور موسم گرما میں واپس اپنے گاؤں آتے تھے۔ اسی دوران آپ نے عربی اور فارسی زبان میں سُدھ بُدھ پیدا کرلی۔ گلستان، بوستان پڑھ لی۔ اور پرائیویٹ طور بچوں کو فارسی بھی پڑھانا شروع کیا اور کچھ وقت گذرنے کے بعد شوپیاں میں سکونت اختیار کی۔

اس زمانے میں مسلمانوں میں جماعت اہل حدیث کو باشعور خیال کیا جاتا تھا اور سری نگر کے مولوی غلام حسین شاہ بلطخوان [*] کے مشہور مبلغ اور عالم تھے۔ وہ بھی علم مولویوں کی زبردست مخالفت سے تنگ آ گئے۔ اور سری نگر شہر کو خیرباد کہہ کر شوپیان چلے گئے۔ اور چھانہ پورہ شوپیاں میں سکونت اختیار کی۔

---

[*] آپ بلطخ پورہ سری نگر کے رہنے والے تھے اسی لئے بلطخو کہلاتے تھے۔

مولوی عبداللہ اگرچہ چودہ سال کی عمر کے تھے لیکن حصولِ علم کی پیاس اور تڑپ رکھتے تھے۔ آپ نے موقعہ غنیمت جانا اور باقاعدہ طور مولوی حسین شاہ بطخو کی صحبت اختیار کی۔ آپ سے علم حدیث و قرآن حاصل کیا اور ان کے زیر اثر جماعت اہلحدیث میں شمولیت کی۔ اور وقت یونہی گذرتا گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ (1857-85ء) کا عہد حکومت تھا اور علامہ حکیم نورالدین صاحب مہاراجہ کے طبی مشیر مقرر ہوئے تھے۔ آپ دینی علوم میں دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ دینی خدمات انجام دینے کا جذبہ بھی بدرجہ اتم رکھتے تھے۔ اس لئے آپ نے جموں میں شام کے وقت درس قرآن بھی دینا شروع کیا اور علوم و معارف کے موتی بکھیرنے شروع کئے جس کا شہرہ دور دور تک ہوا، یہاں تک کہ مولوی عبداللہ نے بھی سنا اور ملنے کو بے قرار ہو گئے۔ چونکہ رسل و رسائل کے ذرائع مفقود تھے اس لئے آپ نے کمر ہمت باندھ لی اور بانہال کے راستے پیدل سفر اختیار کیا۔ جموں پہنچ گئے تو علامہ موصوف کے درسوں میں باقاعدہ شریک ہو کر فیض یاب ہوتے رہے۔

1885ء میں مرزا غلام احمد صاحب (قادیانی) نے مجدد صدی چہار دہم ہونے کا دعویٰ کیا جس کا غلغلہ ہر طرف سے ہوا۔ جس وقت حکیم نورالدین نے سنا تو وہ موصوف کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گئے۔ اور اُن سے ملنے قادیان گئے۔ کچھ دنوں کے بعد واپس آنا چاہتے تھے لیکن اجازت نہیں ملی اور وہیں بیٹھ گئے۔ مولوی عبداللہ نے جب سنا کہ علامہ نورالدین قادیان ہی میں نروکش ہو گئے تو وہ بھی وہیں چلے گئے۔ مرزا صاحب کی بیعت کی اور سالہا سال وہیں علم طب، علم دین و فقہ حاصل کیا۔ پہلے مولوی فاضل اور پھر منشی فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا اور حکیم نورالدین کی شاگردی میں رہے۔ کچھ مدت کے بعد ناسنور، شوپیان کے حاجی عمر ڈار جو خواجہ رحمان ڈار کے والد تھے، قادیان گئے اور مولوی عبداللہ موصوف کو کشمیر واپس آنے پر زور دیا اور اصرار کیا

کہ آپ ناسنور (شوپیان) میں اپنا مطب قائم کریں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے واپس آکر ناسنور میں سکونت اختیار کی، اپنا مطب قائم کیا اور بیماروں کا علاج و معالجہ کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں اور نوجوانوں کو پڑھاتے بھی رہے۔

ایک دفعہ کسی مقدمے میں آپ کو شہادت دینے کا موقعہ ملا۔ وہاں وکیل کی طرف سے جرح وقدح کا سامنا کرنا پڑا اور حیران ہو گئے کہ کیا وکیل ایسے بھی ہوا کرتے ہیں کہ بال کی کھال نکالا کرتے ہیں۔ ارادہ کیا کہ کیوں نہ وکالت کا بھی امتحان پاس کر لوں! چنانچہ تیاری کی، امتحان دے دیا۔ پاس ہو گئے اور حکمت کو چھوڑ کر وکیل بن گئے۔

ان دنوں کولگام میں عدالت مُنصفی قائم تھی۔ مولوی صاحب کو کسی مقدمے میں اپنے ایک مؤکل کی طرف سے وہاں پیش ہونا پڑا۔ لیکن فیصلہ آپ کے مؤکل کے خلاف ہو گیا۔ مولوی صاحب نے مؤکل کو اپیل کرنے کی ہدایت کی اور یقین دلایا کہ ضرور جیت جائیں گے۔ چنانچہ مؤکل نے سری نگر میں اپیل دائر کی۔ تاریخ پیشی پر مولوی صاحب کو وکالت کرنے کی غرض سے سرینگر آکر عدالت میں پیش ہونا تھا۔ اس وقت لاریاں تھیں نہ بسیں، اس لئے چادر اوڑھے، کمربند کس لیا اور پتاوہ[1] باندھ کر پیادہ سرینگر پہنچے۔ اسی حالت میں حاضر اجلاس ہوئے تو عدالت میں سارے وکلاء آپ کو دیکھ کر حیران ہو گئے کہ چادر اوڑھے اور پتاوہ پہنے ایک زمیندار وکالت کرنے آ گیا ہے۔ پیشی ہوئی تو آپ نے دلائل بحث کرتے ہوئے پیش کئے اور مقدمہ سچ مچ جیت لیا۔ سرینگر کے وکلاء حیرت میں پڑ گئے کہ اتنا بڑا وکیل اور گاؤں میں بیٹھا ہے۔ چنانچہ وہ آپ کے پیچھے پڑے اور سری نگر ہی میں وکالت کرنے پر زور دیا۔ ایک دو[2] وکیلوں نے چھتہ بل میں ایک مکان کرایہ پر دلوا دیا۔ اور آپ ان دو[2] وکیلوں کی شراکت

---

[1] تنگ چوڑائی کا اونی کپڑا جو ٹانگوں پر تہہ بہ تہہ باندھا جاتا تھا تاکہ نسیں اور پٹھے گٹھے رہیں۔ (ادارہ)

میں چھ مہینے تک کام کرتے رہے۔

چھ ماہ گذرنے کے بعد آپ کو احساس ہوا کہ کام تو مجھے کرنا پڑتا ہے اور فائدہ شریک وکلائے حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے الگ سرائے بالا میں ایک مکان کرایہ پر لیا۔ شراکت چھوڑ دی اور اپنے طور کام کرنے لگے۔

خواجہ عزیز میر "جائے" ایک بڑا رئیس تھا۔ اس کا بھی ایک مقدمہ سری نگر کی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ اس نے ایکدفعہ باتوں باتوں میں ظریفانہ انداز میں مولوی صاحب سے کہا: "مولوی صاحب! میرا ایک کیس ہے۔ اس کی وکالت کرو۔ جیت جاؤ گے تو مکان بخش دوں گا"۔

مولوی صاحب نے اس کا مقدمہ لیا۔ محنت سے پیروی کی اور مقدمہ جیت لیا۔ خواجہ عزیز میر رئیس بھی وعدے کا پکا اور سچا تھا۔ اس نے اپنا مکان واقع محلہ کا جگری مسجد متصل فتحکدل سرینگر مولوی صاحب کے نذر کیا۔ جہاں آپ نے اخیر دم تک زندگی بسر کی اور یہی مکان آپ کے مشاغل کا مرکز بنا رہا۔ یہ تین منزلہ مکان برلب سڑک واقع تھا۔ مولوی صاحب روزانہ شام کو کھڑکی کے اندر بیٹھ کر قرآن پاک کی تفسیر بیان کرتے تھے اور علم کے متلاشی افراد و احباب کچھ اندر کمرے میں بیٹھ کر اور کچھ باہر سڑک پر کھڑے آپکے درس کو سنتے اور محظوظ ہوتے تھے۔ بعض لوگ آپ کے حسن بیان سے متاثر ہوکر آپ کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔ روز ان لوگوں کی اچھی خاصی تعداد التزام کے ساتھ آپ کے درس کو سننے کو موجود ہوا کرتی تھی۔

مولوی صاحب کا سارا بیان معقولیت پر مبنی ہوتا تھا۔ اور آپ عقل و فہم کے استعمال اور معقولیت پر زور دیا کرتے تھے۔ اسلئے نئی پود کے افراد جوق در جوق آپ کے حلقہ میں چلے جاتے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر بہت سے لوگ آپکے خلاف

ہو گئے تھے۔ انہوں نے پیشہ ور غنڈوں کے ذریعہ سے فساد کرائے۔ فتوائے کفر جاری کئے اور مقدمہ بازیاں کرائیں لیکن ہر بار مولوی عبداللہ وکیل کا پہلو غالب رہا کرتا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ درس قرآن کے سلسلے میں مولوی صاحب کے پاس عام طور پر بیان القرآن مفسرہ مولانا محمد علی صاحب لاہوری 'تفسیر قرآن الحکیم مفسرہ مفتی محمد عبدہ مصری' مثنوی مولانا روم وغیرہ کتب رہا کرتی تھیں۔

دن بدن لوگوں کا شعور بیدار ہوتا گیا اور آپ کے گرد دانشوروں کا ایک بڑا حلقہ جمع ہو گیا جنہوں نے مذہبی بیداری' اتحاد و اتفاق' آپسی بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر جہالت اور غربت کیخلاف جہاد کرنا شروع کیا۔ سرینگر میں "عید میلاد النبی" کا ایک اجلاس ۱۹۲۹ء میں بمقام "بٹہ دوب" متصل پتھر مسجد پر وفیسر توشخانی کی صدارت میں منایا گیا جس کے مہتمم و منتظم مولوی عبداللہ وکیل' شیخ عبدالصمد اور خواجہ غلام نبی گلکار تھے۔ اس میں شیخ محمد عبداللہ بھی مدعو تھے۔ اور آپ نے ایک نظم "داغ عشق مصطفٰے سینے میں پنہاں چاہیئے" یہاں پڑھی تھی۔

مہاراجہ ہری سنگھ والئے کشمیر کی پہلی تین رانیوں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ چوتھی مہارانی تارا دیوی کے بطن سے ۹ مارچ ۱۹۳۱ء کو (بمقام فرانس) کرن سنگھ پیدا ہوئے۔ اس پر ساری ریاست میں جشن منائے گئے۔ اس موقعہ پر مولوی محمد عبداللہ وکیل نے "دور جدید۔ کا علمی ہدیہ" کے نام سے ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ مہاراجہ ہری سنگھ کو پیش کیا جس میں ولی عہد کی پیدائش پر مبارک باد یوں پیش کی گئی ہے:۔

"اللہ اکبر۔ کمال اخلاص و عقیدت کے ساتھ والئی سلطنت کشمیر کی حضور میں مبارک باد گذارش ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی التجا ہے کہ خدا نے اب دنیا کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے ...... حضور والا نے

اپنے عہد مبارک میں سلطنت کے سدھار کی طرف کامل توجہ مبذول فرمائی ہے اسی طرح اس سدھار کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے توجہات خسروانہ مبذول فرمائیں گے تاکہ ملک میں:

(۱) کوئی انسان خواہ مرد ہو یا عورت، آیندہ جاہل اور ناتربیت یافتہ نہ رہے، تعلیم عام ہو اور جبریہ ہو۔

(۲) تمام ملک میں کوئی فرد بشر بیکار اور مفلس نہ رہے۔ صنعت و حرفت کو انتہا درجہ کی ترقی دی جائے۔

(۳) گداگری اور مذہب کے غلط استعمال و استحصال کا انسداد ہو۔

(۴) ملک کی تربیت ایسی ہو کہ لوگوں میں ارتکاب جرائم کا خیال نہ رہے اور نہ جیلخانوں کی اور سزاؤں کی ضرورت رہے۔

(۵) حفظ صحت، تندرستی اور صفائی کو یہ درجہ حاصل ہو کہ ملک میں امراض اور بیماریاں نہ رہیں۔

(۶) تمام ملک میں محبت اور پریم کا دور دورہ ہو۔ نفرت اور عداوت پھیلانے والوں کو نابود کیا جائے۔

جب ایسا ہوگا تو یقیناً کشمیر جنت نظیر ہوگی اور فرمانروائی کشمیر جنت کا شہنشاہ ہوگا.....

نیاز مند : محمد عبداللہ وکیل

سارے رسالہ میں قرآن کریم کی پیشگوئی کہ "دنیا پر ایک وقت ایسا آئے گا جبکہ زمین اور آسمان بدل کر اور کے اور ہو جائیں گے......... تاکہ ربانی حکومت ظاہر ہو" کی تشریح و توضیح کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ:

"جس طرح انسان نطفہ کی حالت سے ترقی کرتا ہوا بتدریج مرتبہ بلوغ

حاصل کرتا ہے اور نابالغی کے زمانہ یعنی اصل کے ادراکات اور احساسات ضعیف اور کمزور ہوتے ہیں مگر بلوغ میں وہی ادراکات اور احساسات نشو ونما پا کر کامل طور پر ظاہر ہوتے ہیں تا آنکہ انسان کی پہلی حالت بالکل تبدیل ہو جاتی ہے بعینہ اسی طرح دنیا شخص واحد کی طرح کسی وقت شیر خوارگی کی حالت میں تھی پھر روز بروز مختلف ادوار و اطوار سے گذر کر نشو ونما پاتی رہی تا آنکہ تدریجاً اب زمانہ بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔ اور اگر ابھی درجۂ بلوغ کو نہیں پہنچی تو عنقریب پہنچنے والی ہے۔"

آگے چل کر مولوی صاحب پھر وضاحت کرتے ہیں :-

"آسمان بھی زمین کی طرح بدل رہا ہے ۔ مذاہب اور اقوام میں ایسے نفوس پیدا ہوئے جنہوں نے روحانی دنیا میں ہلچل ڈالدی۔ سوامی دیانند نے ویدبھاشیہ سے ہندو دنیا کی کایا پلٹ دی ۔ توہمات اور بُت پرستی کا آسمان اڑا دیا ۔ سر سید مرحوم نے اسلام کو عقل و فطرت کے مطابق دکھا کر تقالید اور اوہام سے نجات بخشی ۔ اسی طرح جلیل القدر دیگر علماء نے روایات پرستی اور خرافات کا نام و نشان مٹا دیا اور روز بروز افکار و خیالات کے تصادم سے حقائق کا انکشاف ہو رہا ہے اور جس قدر یہ روحانی انقلاب اور آسمانی تغیر دنیا میں پیدا ہو چکا ہے یہی کافی نہیں بلکہ موجودہ اور آئندہ روحانی دنیا کا انسان اس سے زیادہ وسیع تر عقلیت کا متلاشی ہے۔ قرائن حالیہ اور علامات مستقبلہ پر نظر ڈال کر یہ نظریہ قائم ہو رہا ہے کہ دنیائے جدید میں تعصب یا نفرت یا فرقہ بندی کی گنجائش نہیں اور آئندہ دنیا ایسے مذہب یا دین کی تلاش میں ہے جو کسی طرح انسان کی ترقیات جسمانی و

روحانی و ذہنی و عقلی یا کمالات تمدنی کا سد راہ نہ ہو۔ اور جو جدید دنیا کی فضائے کے موافق ہو اور یہ آئندہ ارتقاء کا کفیل ہو۔ جیسا کہ ایسے ترمیب کی جامع اور مانع تعریف قرآن مجید میں موجود ہے: فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالك الدین القیم۔ یعنی جس فطرت انسانی پر خدا تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اس فطرت سے انحراف کر کے اس میں تبدیلی نہ ہو۔ یہی سیدھا سادہ مذہب الٰہی ہے"

اتحاد، قومی یک جہتی اور آپسی بھائی چارہ آپ کے الفاظ سے کس طرح جھلک رہے ہیں؟ ملاحظہ فرمائیں:-

"تمام بنی نوع انسان کو مل جل کر رہنے کے سوا چارہ نہیں۔ تمدن کا نظام وسیع ہو رہا ہے، روابط بڑھ رہے ہیں اس لئے اب اس محدود زمین پر درندوں کی طرح رہنا اور علیحدہ علیحدہ بسر کرنا محال ہو گا۔ دنیا کا میدان، میدان محشر کی طرح صاف اور چٹیل ہو رہا ہے، باہمی کامل معاشرت ضروری ہو گئی ہے .... پس جو باہمی تفرقہ اور تفرقہ پیدا کرنے والا ہو، دوسرے کو نجس یا اشد خیال کرتا ہو بلکہ خود ہی اپنی قوم کے اندر تکفیر اور تبرا بازی کا عادی ہو موجودہ دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ عنقریب تفرقہ برباد ہونے والا اور ملا ازم کا جنازہ نکلنے والا ہے۔" (ص 12، 13)

الغرض یہ رسالہ جستہ جستہ فلسفیانہ خیالات و نصائح سے بھرپور ہے۔ اتحاد اقوام، تعاون للبقا، جلب منفعت، مساوات انسانی، حقوق نسواں، تعلیم اور دیگر ذیلی سرخیوں کے تحت اس میں موتی بکھیرے گئے ہیں اور مسلمانوں کو اتحاد و تنظیم سے رہنے اور تعلیم و تربیت حاصل کر کے شعور بیدار کرنے پر زور دیا گیا ہے اور مہارت

ہری سنگھ جی کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو ذلت و افلاس اور جہالت و نکبت سے آزاد کرنے کے لئے اقدامات کریں۔

چنانچہ مہاراجہ ہری سنگھ نے ایسا بلند پایہ علمی تحفہ بھیجنے پر آپ کو شکریہ کا خط تحریر کیا تھا۔

۱۹۳۱ء کے وسط ہی میں بیرون ریاست کے ایک حریت پسند مجاہد عبدالقدیر کو شعلہ نوا تقریر کرنے پر گرفتار کیا گیا اور آپ کے خلاف سنٹرل جیل میں مقدمے کی پیشی ۱۳ جولائی کو مقرر تھی۔ اس دن جب لوگ مقدمے کی کارروائی کا جائزہ لینے کے لئے سنٹرل جیل کے احاطے میں جمع ہو گئے تو ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ ۹ افراد موقعہ پر ہی شہید ہو گئے۔ اس واقعہ پر تحریک حریت کشمیر کی بنیاد پڑی جس کے روح رواں مولوی محمد عبداللہ وکیل کے علاوہ آپ کے فرزندان عبدالرحیم ایم اے ماسٹر بشیر احمد کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ، شیخ عبدالصمد، غلام نبی گلکار، مستری یعقوب علی، ڈاکٹر یعقوب بیگ، چوہدری غلام عباس اور دیگر افراد تھے۔ [۵]

"انجمن ترقی اسلام" کی بنیاد ملک انگن فتحکدل میں ڈالی گئی جہاں سکول اور تعلیم بالغاں کا انتظام تھا۔ وہاں وقتاً فوقتاً تقاریر کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جن میں بیرونی معززین بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ 26 مارچ ۱۹۳۳ء کا اجلاس جناب غلام مصطفےٰ سپرنٹنڈنٹ پنجاب یونیورسٹی کی صدارت میں ہوا۔ اور ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ کو عید میلاد النبی صلعم کا جلسہ چوہدری خوشی محمد ناظر کی صدارت میں ہوا۔ ۱۴ ربیع الاول کو خانقاہ معلیٰ میں ایک پبلک جلسہ منعقد کیا گیا جہاں مشہور نو مسلم مسٹر خالد لطیف گابا کی تقریر ہوئی جس کا کشمیری ترجمہ بھی مولوی صاحب ہی نے حاضرین کو سنایا۔

---

[۵] صحیح صورت یہ ہے کہ اس وقت بھی اس حریت پسند گروہ کی سب سے نمایاں شخصیت شیخ محمد عبداللہ کی ہی تھی۔ (ادارہ)

تحریک حریت کشمیر کے زور پکڑنے پر مولوی عبداللہ وکیل اس کے سرگرم کارکن رہے ہے۔ جب مہاراجہ نے ۱۹۳۴ء میں پرجا سبھا کے نام سے اسمبلی قائم کی تو مسلم کانفرنس کی ٹکٹ پر مولوی عبداللہ نے انتخاب لڑا اور پرجا سبھا کے ممبر منتخب ہو گئے۔

جب مسلم پولیٹیکل کانفرنس میں پھوٹ پڑی تو مرحوم میرواعظ مولانا یوسف شاہ اور مرحوم شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ میں ٹھن گئی اور ایکدوسرے کی مخالفت کرتے لگے۔ اس مرحلہ پر مولوی عبداللہ کی بھی مخالفت کی گئی۔ انہوں نے مرحوم شیخ صاحب کا ساتھ دیا اور کئی ٹریکٹ شائع کئے جن میں آپ نے مسلمانوں کے مابین تفرقہ وانتشار پھیلانے اور متعدد فرقوں کے علمائے کے مابین چشمک اور ایکدوسرے کو کافر تک قرار دینے کی شدید مخالفت کی۔ یہ ٹریکٹ ۱۳۵۲ھ میں شائع ہوئے تھے۔

ایک دفعہ سٹی مجسٹریٹ سرینگر کی عدالت میں پولیس نے زیر دفعہ ۱۰۷ مولوی عبداللہ اور لسہ خان (احمدی پارٹی) اور حاجی محمد شہداد خان پریذیڈنٹ و عبدالعزیز جنرل سیکرٹری مولوی غلام نبی مبارکی سیکرٹری اہلحدیث یعنی دونوں پارٹیوں کے خلاف چالان کیا۔ اس مقدمہ میں جہاں مولوی مبارکی کو پابند ضمانت کیا گیا وہاں مولوی عبداللہ وکیل اور لسہ خان کو بری کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ ۲۵ چیت ۱۹۸۳ بکرمی کو سٹی مجسٹریٹ نے سنا دیا۔

"پنڈت ٹھاکر داس صاحب سٹی مجسٹریٹ کے اس مبسوط فیصلے کو ۲۴ صفحے کے ایک پمفلٹ کی صورت میں مولوی محمد عبداللہ وکیل نے "اصلی اور جعلی اسلام کا معرکہ" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے صفحہ اول پر جلی حروف میں درج ہے:

"میں اصولاً حنفی المذہب ہوں۔ اگر کوئی شخص دلیل سے ثابت کرے کہ میرا کوئی عقیدہ اصول اسلام کے خلاف ہے تو میں توبہ کر کے ایک ہزار روپیہ بطور تاوان دوں گا۔ اصلی اسلام میں ہندو مسلم اتحاد مضمر ہے۔ پس یہ رسالہ اور صاحب مجسٹریٹ کا فیصلہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے آئینہ

حقیقت نما ہے"۔

محمد عبداللہ وکیل ہائیکورٹ کشمیر

اسکے بعد چند صفحات میں آپ نے اپنا مافی الضمیر اور عقائد یوں ظاہر کرتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم   نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

اصلی اسلام کا مذہب تین بسیط آزادیوں سے مرکب ہے نفس کی آزادی۔ عقل کی آزادی۔ علم کی آزادی۔ یہی وہ اصول ہیں جن پر تہذیب کا انحصار ہے اور مذہب کی غرض وغایت ہی تہذیب ہے۔ اگر کوئی مذہب انسان کو مہذب اور متمدن نہیں بناتا تو ایسا مذہب کسی کام کا نہیں موجودہ مسلمانوں کی جہالت اور بربریت کا پہلا سبب یہ ہے کہ مذہب کی آڑ میں جاہلوں کو اپنا غلام بنانے کے لئے ہمارے مذہبی رئیسوں نے بھی اسی اصول کو نافذ کیا کہ آنکھیں بند کرکے اعتقاد رکھو۔ دین کی بابت سوچنے اور فکر کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ اس غلط اصول کا نتیجہ یہ ہوا کہ تدریجاً خدا کی مخلوق بے جان کلوں کی طرح ان کے ہاتھوں میں آگئی اور جس طرح انہوں نے چاہا لوگوں کو نچایا اور ان سادہ لوحوں کے دلوں میں مبالغہ آمیز مذہبی توہمات سے نقش ہوگیا کہ ہمارے اندر نہ نفس ہے نہ ضمیر۔ ان کی توجہ اور دعا کی بدولت ہماری نجات ہوگی اور ہمارا فرض یہی ہے کہ ہم بطور نیاز و اور چندہ ان بزرگوں کی خدمت کریں کیوں کہ ہماری ابدی سعادت و شقاوت ان کے ارادہ پر منحصر ہے۔ ان کا نام اہل دنیا رکھا گیا جو محنت کرکے کچھ کمائیں"۔

اخیر میں آپ لکھتے ہیں کہ:

"مسلمانو! خدا کے لئے مذہبی منافرت سے باز آجاؤ۔ حکومت کے

وفادار ہوکر دنیا میں محبت کا مذہب جو کہ اسلام کا اصلی مقصد ہے اس کو پھیلاؤ۔ تہذیب اور ترقی کو ترقی دو۔ ہندوؤں مسلمانوں کشمیریوں اور پنجابیوں کا خدا ایک ہے۔ نفسانی اغراض کے لئے مذہب کو آڑ نہ بناؤ تاکہ کشمیر در حقیقت جنت نظیر ہو۔

نفاق و اختلاف ناشناساں از میاں خیزد
کمال اتفاق و خلّت و الفت شود پیدا"

اس کے بعد رسالہ میں نقل فیصلہ عدالت شائع کر دیا گیا۔

بالآخر شیخ محمد عبداللہ کے رویہ اور مسلم اتحاد کے پیش نظر آپ نے سیاسیات سے علیحدگی اختیار کی اور الگ مسلمانوں کی فلاحی، اصلاحی اور دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ چنانچہ مولوی صاحب خود لکھتے ہیں:۔

"یہاں سیاسی تحریک کی بنیاد خدا تعالےٰ نے میرے ہاتھوں سے رکھی، اگرچہ میرا پروگرام قرآن کریم کے منشا کے مطابق تھا جو عمل میں نہ آیا۔ بہرحال ابتدا میں میرے عزیز اور دوست اس تعمیر کے بنیادی پتھر بنے۔ چنانچہ مسٹر غلام نبی گلکار بھی سب سے پہلے میری ہی تحریک پر آگ میں کود پڑا۔ بایں ہمہ مشکلات کی منزل کو طے کر کے قوم کی خاطر میں اور عزیز علیحدہ بھی ہو گئے اور علیحدہ ہو کر بھی ہمیں کسی قومی تحریک سے مخالفت نہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ ہماری فطرت میں داخل ہے"۔[۱]

مولوی صاحب کے دیگر حلقہ احباب شیخ عبدالصمد، مستری یعقوب علی اور خواجہ غلام نبی گلکار وغیرہ بھی مولوی صاحب کی طرح سیاسی تنظیم سے الگ ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں رفتہ رفتہ مولوی عبداللہ وکیل مسلمانوں کے رویہ اور اپنے فرزندان

۱۔ مرحوم شیخ صاحب نے "آتش چنار" میں ان کیخلاف تنظیم کی ضبط شکنی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے ملاحظہ ہو صفحہ ۴۵۱ - ۴۵۲ - ۲ ۔ ایڈیشن ۔ ۲ ۔ ملازم کی اعلیت صفحہ ۸

کی نافرمانی سے بُری طرح متاثر ہو گئے اور بہائی مذہب کی طرف مائل ہونے لگے۔

ایک دفعہ میں ان کے مکان سے گذرا تو نظر پڑتے ہی پاس بُلایا۔ اور کہا کیا اسلام میں والدین کی فرمانبرداری کا حکم نہیں ہے؟ میں نے جواب دیا ضرور ہے.... کہنے لگے میرے فرزند میری نافرمانی کرنے لگے ہیں.. بدزبانی کرتے ہیں۔

میں نے جواباً کہا "اگر بہائیت قبول کرنے سے ایسی منفعا طبیعی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ آدمی بدی اور نافرمانی کے قریب بھی پھٹکنے نہیں پاتا ہے تو کوئی ایسی مثال دکھائیے تاکہ میں بھی بہائیت قبول کرنے کے بارے میں سوچ لوں"۔

کہنے لگے تم جاہل ہو۔

بعد میں کئی سال برابر ہمارے درمیان مختلف مسائل پر نوک جھونک ہوتی رہی مجلسوں میں، پریس کانفرنسوں میں لیکن ہمیشہ بردباری اور صبر و تحمل کا نمونہ پیش کرتے رہے۔

کئی بار مختلف مسائل پر تحریری خط و کتابت بھی ہوئی۔ لیکن کمزور پڑنے پر بلا کسی جھجک کے اعتراف بھی کیا کرتے تھے۔

مولوی عبداللہ وکیل ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ہی حاضر جواب اور بذلہ سنج بھی تھے۔ میں اُن کے ایک دو لطیفے آپ کو سناتا ہوں۔

ایک صاحب آپ کے ہم عصر اور حریف وکیل تھے اور تاشوان کے متصل رہنے کی وجہ سے مولوی عبداللہ کو "تاشوانی مولوی" کہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بڑی مجلس میں وہ اور مولوی عبداللہ دونوں ہی شریک تھے کہ اس نے بھری مجلس میں اُن پر چوٹ کرنے کی غرض سے بلند آواز میں کہا۔

"مولوی صاحب! تاشوان آپ کے گھر سے کتنا دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں۔" فوراً ہی مولوی عبداللہ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "بس

مجھے میرا مکان اور خود کو تماشوالی سمجھ لیجئے۔"

پوری مجلس زعفران زار بن گئی اور بہت دیر تک کوئی بھی اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

O

ایک بار کسی گنوار اور جاہل نے آپکو لڑکی کی گالی دی۔ آپ نے غصے کا اظہار نہیں کیا بلکہ اسے نرمی سے اپنے پاس بلا کر کہا:

"نادان! میری بیٹی ایم۔اے پاس ہے۔ اس کے رشتے کا طالب وہی تعلیمیافتہ شخص ہو سکتا ہے جو کم از کم تعلیم میں اس کے برابر ہو۔"

چنانچہ وہ شخص وہاں سے شرمندہ ہو کر کھسک گیا اور پھر کبھی نہ دیکھا گیا۔

O

۱۹۴۷ء میں مرحوم شیخ صاحب ایمرجنسی ایڈمنسٹریشن کے ناظم اعلیٰ بنے تو کچھ لوگ جو کشمیر کے ہندوستان سے الحاق پر خوش نہیں تھے سرحد پار (پاکستان) چلے گئے۔ ویسے بھی وہ زمانہ افراتفری کا تھا۔ مولوی عبداللہ وکیل کے فرزند بشیر احمد نائب تحصیلدار اور ایم لے صابر ایڈیٹر البرق بھی گرفتار کئے گئے۔ اس سلسلے میں مولوی عبداللہ وکیل شیخ محمد عبداللہ ناظم اعلیٰ سے ملنے گئے۔ لیکن وہاں شیخ صاحب نے انہیں چپراسی کے ذریعہ باہر نکلوا دیا۔ اس کے بارے میں مرحوم شیخ صاحب کا بیان ملاحظہ ہو:

"مولوی عبداللہ سے میری آخری ملاقات شیرگڑھی میں ہوئی جہاں ۱۹۴۸ء میں ریاستی حکومت کا سیکرٹریٹ واقع تھا۔ ان کے صاحبزادے مولوی بشیر کو بخشی غلام محمد کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا تھا کیونکہ وہ حکومت کے خلاف محاذ آرائی کی حوصلہ افزائی میں مصروف تھے۔ مولوی عبداللہ صاحب پدرانہ شفقت سے مجبور ہو کر انہیں رہا کرنے کی سفارش لے کر میرے پاس آئے۔ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوئے تو نہایت غصے کے عالم

میں تھے اور ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا ۔ وہ بھلا کسی کی کیا سنتے ۔ ہمارے خلاف بہت تیز کلامی کرتے رہے ۔ انہوں نے ہمیں بد دعائیں بھی دیں ۔ لیکن زیادہ تکلیف دہ بات یہی کہ وہ اپنے سن اور شعور کو نظر انداز کر کے گالی گلوچ پر بھی اُتر آئے ۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہ سرکاری دفتر ہے ملازم چاروں طرف گھوم رہے ہیں ۔ ان کو ایک بزرگ ہونے کے ناطے اس قسم کا وطیرہ اختیار نہ کرنا چاہیئے اگر وہ اپنے فرزند کی رہائی چاہتے ہیں تو انہیں اپنے صاحبزادے کو نصیحت کرنی چاہیئے کہ وہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے اور حکومت کیخلاف عوام کو بھڑکانے کی روش ترک کر دے لیکن مولوی صاحب ایسے غیض و غضب میں تھے کہ ان پر میری باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ بلکہ وہ اور بھی زیادہ مشتعل ہونے لگے ۔ جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو میں نے مجبور ہو کر اپنے چپراسی سے کہا کہ وہ انہیں کمرے سے باہر لے جائے ۔"

(آتش چنار ۔ صفحہ 54-453)

اس واقعہ کے بعد انہیں برین ہیمرج ہوا اور تین دن تک بے ہوش رہنے کے بعد 12 ، اپریل 1948ء کو صبح نو بجے کے قریب اُن کا انتقال ہو گیا ۔ اس سلسلے میں میں نے "روشنی" کی 17 ، اپریل کی اشاعت میں لکھا تھا :

"......... مولوی عبدالصمد صاحب وکیل کو راقم زمانہ طالب علمی سے جانتا تھا ۔ مولوی صاحب احمدیہ جماعت (لاہوری) کے مبلغ تھے ۔ انہوں نے اپنی عمر کا بہت سارا حصہ کشمیر میں درس و تدریس میں صرف کیا ۔ .. "

" آپ باوجود آسودہ حال ہونے کے انتہائی سادگی سے زندگی بسر کرتے رہے ۔ آپ عمر بھر نڈر طریقہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ۔ مسلمانوں کو بیدار کرنے

میں آپ نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کی ذہنی پستی کو دیکھ آپ اسقدر تنگ آگئے کہ عمر کے آخری حصہ میں آپ اسلام ہی سے برگشتہ ہوگئے اور بظاہر "بہائی ازم" اختیار کیا..... اور انکی شہرت ماند پڑنے لگی۔ آپ کو فشار الدم کا عارضہ بھی لاحق ہوا تھا۔ راقم الحروف نے آپ کے درس و تدریس سے دین فطرت اسلام کے متعلق بہت کچھ سیکھا ہے اور آپ بھی راقم کی قدر کرتے تھے۔ بلکہ تقاریر کرنے کی تربیت بھی آپ ہی سے دی۔ لیکن پھر بھی ہم ثابت نہیں کر سکتے ہیں کہ آپ کو بہائیت کی صداقت پر اطمینان کلی حاصل تھا۔ کیوں کہ اکثر اوقات جب بھی ہم نے آپ کو بہائیت کے متعلق اعتراضات کئے تو آپ اعلانیہ اعتراف کرتے تھے کہ ابھی میں نے اتنی تحقیقات نہیں کی ہے۔

آپ کے لواحقین کے تحریری بیان کے مطابق آپ آخری وقت میں اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیینؐ مانتے تھے۔ اور ایک مسلمان کی موت مرے۔ اسی تحریری شہادت کی بنا پر مسلمانوں کی طرح آپ کی تجہیز و تکفین عمل میں لائی گئی۔ نماز جنازہ حضوری باغ میں مسلمانوں نے پڑھی۔ میت کو ۱/۲ ۱۱ بجے کے قریب بربرشاہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ؔ اور جو ہے میت کو قبلہ رو رکھا گیا اور کفن مسلمانوں کی طرح ڈالا گیا۔ مولوی صاحب کی رحلت فرمانے کے بعد ہمیں ان کے فرزندان اور ان کے دیگر افراد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

یاد رہے کہ جب مرحوم شیخ صاحب مولوی عبداللہ کی وفات کے بعد ان کے گھر تعزیت کے سلسلے میں گئے تو وہاں مولوی صاحب کے فرزندان (جو جیل سے رہا کر دیے

؎ مولوی صاحب کسی قبرستان میں نہیں بلکہ بربرشاہ دفن کئے گئے ہیں جہاں اور کوئی قبر نہیں۔ اگر اس قبر کو محفوظ نہ کیا گیا تو کشمیر کی تحریک آزادی کے اس ابتدائی نقیب کی نشانی مٹ جائیگی۔ (م۔ی۔ٹ)

گئے تھے) اور دیگر افراد خانہ نے اُن سے پاکستان جانے کے لئے راہداری مانگی۔ شیخ صاحب نے انہیں پاکستان جانے کی اجازت دے دی اور وہ بعد ازاں وہاں چلے گئے۔

اس بات کا ذکر بھی کرتا چلوں کہ مولوی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ انکی شادی اپنے ہی ایک رفیق غلام رسول خان[1] کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا نکاح مرحوم کی بہن مہتاب بیگم سے کیا گیا۔

تین بیٹے محمد ایوب صابر[2]، محمد یعقوب[3] اور مولوی عبدالرحیم[4] پہلی بیوی کے بطن سے ہوئے اور تین لڑکے بشیر احمد[5]، ڈاکٹر ہارون رشید[6]، مشتاق احمد[7] عبداللہ اور تین لڑکیاں آمنہ بیگم[8]، حمیدہ بیگم[9] اور محمودہ بیگم[10] دوسری بیوی کے بطن سے ہوئیں۔



---

۱ غلام رسول خان (مرحوم) شوپیان کے ایک معروف شخص ماسٹر نذیر احمد خان کے والد۔

۲ اپنے زمانے کے نڈر اور بے باک صحافی اور اخبار "البرق" کے مالک و مدیر۔ پاکستان میں وفات پائی۔

۳ شوپیان میں میوہ کی تجارت کرتے تھے۔ سرینگر میں وفات پائی۔ شمیم احمد شمیم انہی کے فرزند تھے۔

۴ آپ کا شمار تحریک حریت کے ابتدائی سرگرم کارکنوں میں ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ مسلم کانفرنس کے آرگن اخبار "صداقت" کے مدیر بھی رہے۔ ایبٹ آباد (پاکستان) میں وفات پائی۔

۵ تحریک آزادی میں ان کا رول بھی ناقابل فراموش ہے۔ پہلے سکول ماسٹر اور بعد ازاں نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔ پاکستان میں وفات پائی۔

۶ ڈاکٹر ہارون میڈیکل ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ تھے عین شباب میں وفات پائی۔ پاکستان میں دفن ہیں۔

۷ یہاں محکمہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ آجکل مظفر آباد میں وکالت کرتے ہیں۔

۸ ڈاکٹر بشارت احمد آف لاہور کے عقد نکاح میں تھیں۔ عین جوانی میں رحلت کر گئیں۔

۹ سید نذیر احمد شاہ (ریٹائرڈ سیشن جج) کی اہلیہ محترمہ

۱۰ پاکستان میں ایک کالج کی پرنسپل رہ چکی ہیں۔ محمودہ بیگم کی ایک سے زیادہ شادیاں ہوئیں۔

بلدیو پرشاد شرما

جیوتشی وشولیشور

انیسویں صدی میں جموں کے قصبہ بسوہلی نے جہاں عظیم چِترکار پیدا کیے وہاں ایک ایسا عظیم ڈوگری لیکھک بھی پیدا کیا جس نے نہ صرف ڈوگری الجبر کو ایک نیا روپ دے کر مکمل ورن مالا تیار کی بلکہ جس نے ڈوگری کا پہلا مصنف بن کر ڈوگری کی تاریخ میں قابلِ قدر مقام پایا۔ ڈوگری کے اس پہلے لیکھک کا نام جیوتشی وشولیشور تھا۔

گو جیوتشی وشولیشور کی پہلی ڈوگری کتاب "لیلاوتی" سموت 1930 بکرمی (1873ء) میں بدیا بلاس پریس جموں میں چھپ چکی تھی مگر وہ 1976ء تک تقریباً گمنام ہی رہے اور کسی ڈوگری لیکھک نے ان کا ذکر تک نہ کیا۔ اس لئے جب 5 جون سنہ 1976ء کو راقم نے ڈوگری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جموں کے ایک اجلاس میں انیسویں صدی میں چھپی ڈوگری کتب اور ان کے مصنف جیوتشی وشولیشور کے متعلق ایک ریسرچ مقالہ پڑھا تو اس نے ڈوگری جگت میں ایک تہلکہ مچا دیا۔

ڈوگری پُستک "لیلاوتی" کا ذکر سنہ 1875ء میں جرمنی کے مشہور سنسکرت ودوان ڈاکٹر جارج بوہلر نے اپنی ایک رپورٹ میں کیا تھا۔ ڈاکٹر بوہلر سنسکرت کے قلمی نسخوں

کی تلاش میں جموں آئے تھے۔ اُس وقت کے علم دوست مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ان کو شاہی مہمان رکھا اور اپنے ہمراہ رگھوناتھ مندر جموں کے وسیع احاطہ میں واقع سنسکرت پاٹھ شالہ دکھلانے لے گئے۔ ڈاکٹر بوہلر نے اپنی رپورٹ میں لکھا۔

"مہاراجہ صاحب خود مجھے مدرسہ دکھلانے لے گئے اور مجھے طلباء کا امتحان لینے کی اجازت دی۔ مہاراجہ صاحب اپنی رعایا کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ مدرسہ جو ریاست کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے، اسے سنسکرت کالج کہا جاتا ہے۔ یہاں علم شاعری کے علاوہ گرامر اور فلاسفی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فارسی بھی پڑھائی جاتی ہے اور یہاں طلباء کو ہنر سکھلانے کا سکول بھی موجود ہے۔ علم ریاضی سکھلانے کے لئے "لیلاوتی" کا ڈوگری ترجمہ کیا گیا ہے"۔

"لیلاوتی" ہندوستان کے عظیم ماہر علم ریاضی اور علم ہیئت بھاسکر آچاریہ کی سنسکرت پستک کا نام ہے۔ یہ ڈوگری ترجمہ کس نے کیا اور ڈوگری "لیلاوتی" کب شائع ہوئی، اس کا ذکر نہ تو ڈاکٹر بوہلر نے کیا اور نہ کسی ڈوگری لیکھک نے یہ جاننے کی کوشش ہی کی۔ جموں شہر، بسوہلی، اودہم پور وغیرہ کے علاقوں میں تلاش بسیار کرنے پر بھی ڈوگری کتاب "لیلاوتی" کا کوئی سراغ نہ ملا۔ حیرانی کی بات ہے کہ رگھوناتھ مندر میں واقع مہاراجہ رنبیر سنگھ کی سنسکرت لائبریری میں بھی یہ کتاب موجود نہ تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ ۱۹۷۰ء میں راقم کو رام نگر جانے کا موقعہ ملا۔ یہ قصبہ ضلع اودہم پور میں واقع ہے اور ایک زمانہ میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے بھائی راجہ رام سنگھ کی جاگیر تھا۔ راجہ رام سنگھ خود ایک علم دوست اور جیوتشی تھا جس نے اپنے محل میں ایک اعلیٰ پیمانہ کی لائبریری بنا رکھی تھی۔ دریافت کرنے پر مجھے مرحوم لالہ ہیراج جنڈیال (سابقہ ایم-ایل-اے) نے بتایا کہ لائبریری کی چھت گر چکی تھی

اس لئے تحصیلدار صاحب نے تمام کتب ٹاؤن ایریا کمیٹی کی حفاظت میں رکھی ہیں۔ یہ کتابیں ایک وہ کان کے اندر چار پائیوں پر رکھی گئی تھیں اور چند ایک طاقچوں میں تھیں۔ اتفاق سے راقم کی نظر سرخ جلد والی ایک ضخیم کتاب پر پڑی جس پر سنہری حروف میں بزبان انگریزی "لیلاوتی" کندہ تھا۔ یہ وہی "لیلاوتی" تھی جس کا ذکر ڈاکٹر بوہلر نے کیا ہے۔ جموں واپسی پر میں نے مرحوم خواجہ غلام محمد صادق (چیف منسٹر) کو ان نایاب اور کمیاب کتب کے بارے میں بتایا۔ چنانچہ انہوں نے جناب فدا محمد حسنین (ڈائرکٹر آرکائیوز) کو یہ کتابیں جموں لاکر بہ حفاظت سرکاری محافظ خانہ میں رکھنے کی ہدایت دی۔ اس کے بعد ہی راقم کو ڈوگری کی اپنی لپی میں چھپی "لیلاوتی" کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ سب سے پہلے جس چیز نے راقم کو متاثر کیا وہ لیتھو مشین پر چھپی اس 344 صفحات پر مشتمل کتاب کی نفیس طباعت تھی۔ اتفاق سے کتاب کے آخری صفحہ پر ڈوگری کے اس کاتب کا نام بھی درج تھا جس نے اس ضخیم کتاب کی خوبصورت اور نفیس کتابت کی تھی۔ اس کا نام منورتھ تھا۔

"لیلاوتی" کا دیباچہ جیوتشی وشو یشور کا لکھا ہوا تھا جس میں انہوں نے واضح کیا تھا کہ:

"علم ریاضی عوام الناس کے ہر کام کاج میں کار آمد ہوتا ہے۔ مگر ریاضی کی مشہور سنسکرت کتاب "لیلاوتی" سے عام لوگ مستفید نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اندر مہندر مہاراجہ ادھیراج رنبیر سنگھ جی کے حکم سے "لیلاوتی" کا ڈوگری ترجمہ جموں کی مکھیہ پاٹھ شالہ کے ادھیاپک جیوتشی وشویشور نے کیا تاکہ اسے جموں کی پاٹھ شالاؤں میں پڑھایا جا سکے۔"

اس کے ساتھ ہی دو اہم ڈوگری کتب بھی راجہ رام سنگھ جی کی لائبریری سے ہی ملیں۔ ایک "ڈوگری ورن مالا" اور دوسری "ویوہار گنتا"۔

ڈوگری "ورن مالا" بھی بدیا بلاس پریس جموں میں طبع ہوئی تھی اور یہ اس کا تیسرا ایڈیشن تھا جو سموت 1926 بکرمی (1871ء) میں طبع ہوا تھا۔ اس کی تعداد دو ہزار درج ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلا ایڈیشن تقریباً چار یا پانچ سال پہلے شائع ہوا ہوگا۔ اس "ورن مالا" کی خوبی یہ تھی کہ اس کے ذریعہ پرانی ٹاکری لپی میں سدھار کر کے اس میں زیر، زبر و دیگر علامات ایزاد کی گئی تھیں اور ڈوگری لپی کو دیوناگری کا لپی کے ہم پلہ بنایا گیا تھا صرف حروف کی شکلیں جدا تھیں۔ یہ نئی ڈوگری لپی مہاراجہ رنبیر سنگھ کی منظور کردہ تھی جیسا کہ "ورن مالا" کے دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اس "ورن مالا" کے سوا دوسرے اکھشروں میں ڈوگری لکھنا جرم قرار دیا تھا۔ جیوتشی وشولیشور کی لکھی "لیلاوتی" اور دوسری کتب میں بھی یہی ابجد استعمال ہوئی ہے۔

ڈوگری کی ایک اور اہم کتاب جو جیوتشی وشولیشور کی تصنیف کردہ ہے "ویوہار گیتا" ہے۔ تین جلدوں اور 1230 صفحات پر مشتمل "ویوہار گیتا" ڈوگری زبان میں ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں عام ضروریات کی جانکاری مہیا کی گئی ہے۔ یہ کتاب سمت 1941 بکرمی (1884ء) میں رگھناتھ پریس جموں میں طبع ہوئی تھی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے مزید جو باتیں ظہور میں آئیں ان میں سب سے اہم یہ تھی کہ ڈوگری کا ٹائپ بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ہی تیار کروایا تھا۔ اور "ویوہار گیتا" کے 1230 صفحات میں سے 1073 صفحات ڈوگری ٹائپ میں چھپے ہوئے تھے جبکہ جیومیٹری سے متعلق 157 صفحات لیتھو مشین پر چھپے ہوئے تھے۔

جیوتشی وشولیشور کی لکھی "لیلاوتی" اور "ویوہار گیتا" کے مطالعہ کے بعد ہی راقم یہ ثابت کر سکا کہ ڈاکٹر گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں ڈوگری بھاشا کے متعلق جو باتیں لکھی وہ غلط ہی تھیں۔ ڈاکٹر گریرسن نے دعویٰ کے ساتھ

لکھا تھا کہ ڈوگری بھاشا میں چھپی کوئی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی نہ ہی تب تک ڈوگری کا ٹائپ تیار ہوا تھا۔ جیوتشی وشولیشور کی یہ دونوں کتب ڈاکٹر گریرسن کے جموں آنے سے کئی سال پہلے شایع ہو چکی تھیں۔ ان کتب نے بلاشبہ یہ ثابت کر دیا کہ ڈوگری کا پہلا لیکھک جیوتشی وشولیشور ہی تھا جو سرگباش ہونے کے پچاس سال بعد تک بھی گمنامی کی حالت میں پڑا رہا۔

مزید کھوج کے بعد پتہ چلا کہ جیوتشی وشولیشور جی کا آبائی قصبہ بسوہلی تھا۔ ان کے والد بزرگوار پنڈت برج نندن خود ایک جانے مانے جیوتشی تھے جنہوں نے کاشی میں علم جیوتش کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کی دھرم پتنی کا نام تیووتی دیوی تھا۔ بیساکھ شُکل ایکادشی سموت 1895 بکرمی (1838ء) کے دن ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام وشولیشور رکھا گیا۔

ابتدائی سنسکرت تعلیم اپنے فاضل باپ سے ہی پانے کے بعد وشولیشور کو جموں شہر کی مشہور تعلیمی درس گاہ شری رگھناتھ پاٹھ شالہ میں بھیج دیا گیا جہاں ودیارتھیوں کے قیام اور طعام کا بھی مُفت انتظام تھا۔ اسی پاٹھ شالہ میں سنسکرت اور جیوتش شاستر کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بعد میں اسی پاٹھ شالہ میں جیوتش کے ادھیاپک مقرر ہوئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ ان کی قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو اپنی "بدیا بلاسی سبھا" کا ممبر بنا دیا۔ یاد رہے کہ شہنشاہ اکبر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے علمائی کی ایک سبھا بنا رکھی تھی جس کا اجلاس ہر منگلوار کو ہوتا تھا اور وہ خود اس کی صدارت کے فرائض انجام دیا کرتے۔ اس سبھا میں فارسی، سنسکرت، اُردو، ہندی اور ڈوگری کے علمائ شامل ہوتے تھے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد (1857ء – 1885ء) میں ہی جیوتشی وشولیشور شری رگھناتھ پاٹھ شالہ کے پرنسپل بھی بنے اور اسی زمانہ میں انہوں نے جیوتش شاستر

کے متعلق چار کتابیں بھی لکھیں جن کے نام ہیں: (۱) پرستن مارگ (۲) پرشن کوتوہل، (۳) رنبیر وجیہ اور (۴) جاتک رہسیہ۔ ان میں سے صرف "رنبیر وجیہ" کا قلمی نسخہ ہی رنبیر سنسکرت ریسرچ لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے 325 صفحات ہیں۔ باقی قلمی نسخوں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اسی زمانہ میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سرکاری جنتری کا بنانے کا کام بھی جیوتشی وشولیشور کے سپرد کیا۔ یہ جنتری ہر سال 1885ء تک باقاعدگی سے چھپتی رہی۔ اس کا نام "جمبو پنچانگ" تھا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانہ (1925 - 1885ء) میں جیوتشی وشولیشور نے راج دربار میں بڑی عزت اور منزلت پائی۔ سموت 1961 بکرمی میں جب لالہ ہنس راج مہاجن اور حسرت شاہ وکیل نے ریاست جموں و کشمیر کی اولین عوامی جماعت "ڈوگرہ صدر سبھا" کی بنیاد ڈالی تو جیوتشی وشولیشور بھی اس کے سرگرم ممبر بنے۔ 1962 بکرمی میں آپ "ڈوگرہ صدر سبھا" کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے اور لگاتار دس برس تک یہ خدمت سرانجام دیتے رہے۔ اسی دوران آپ نے ڈوگرہ صدر سبھا کی طرف سے ایک اخبار جاری کرنے کی تجویز کی اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو مندرجہ ذیل درخواست بھیجی:-

"باادب گذارش ہے کہ "ڈوگرہ گزٹ" میں کارروائی ڈوگرہ کمیٹی اور مضامین اغراض و مقاصد ڈوگرہ کمیٹی کے لطور رسالہ درج ہوں گے۔ کیوں کہ سوائے ایسے رسالہ کے اجرائے کے کارروائی و تجاویز کمیٹی کا اظہار عام ڈوگرہ رعایا میں نہیں ہو سکتا براہ نوازش منظوری عطا فرمائی جائے۔ زیادہ حد آداب۔ معروضہ 16 ماگھ سمت 1962 بکرمی ـــ
عرضی نیاز جیوتشی وشولیشور۔ پریذیڈنٹ ڈوگرہ کمیٹی۔ جموں"۔

یہ درخواست جموں کے سرکاری محافظ خانہ کے فائل نمبر 51/1/21 1905ء میں موجود ہے اور اسی فائل میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا مندرجہ ذیل حکم بھی موجود ہے:-

"از پیشگاہ سری سرکار والا مدار

حکم ہوا

بواپسی کاغذات ممبران ڈوگرہ کمیٹی جموں کو لکھا جائے کہ اگر اس رسالہ میں (جو کمیٹی جاری کرنا چاہتی ہے) مضامین جیسا کہ رپورٹ پریذیڈنٹ کمیٹی مورخہ 16 ماگھ سمت 1962 بکرمی میں ظاہر کیا گیا ہے کہ صرف متعلق اغراض و مقاصد ڈوگرہ کمیٹی کے درج ہوا کریں گے تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اجرائے رسالہ مذکور کی اجازت دی جاتی ہے۔

تحریر 22 ماگھ سمت 1962 بکرمی دستخط مہاراجہ پرتاپ سنگھ"

محافظ خانہ کے فائل نمبر 145، حصہ اول 1906ء میں اس زمانہ کے جن تین اخبارات کا نام درج ہے اس میں ماہوار رسالہ "ڈوگرہ گزٹ" کے متعلق مندرجہ ذیل تفاصیل درج ہیں:

ملکیت: ڈوگرہ صدر سبھا جموں

ایڈیٹر: پنڈت ہرکشن لال وزیر آبادی

طباعت، پرتاپ پریس جموں

ڈوگرہ صدر سبھا کے ریکارڈ سے جیوتشی وشولیشور کے متعلق ایک اور بات دریافت ہوئی کہ وہ ریاست کی صنعت و حرفت کو فروغ دینے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مندر دیوان جوالا سہائے کے وسیع صحن میں صنعت و حرفت کی سالانہ نمائش کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔

مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے جیوتشی وشولیشور کو دھرم ارتھ ٹرسٹ کا مہتمم بھی مقرر کیا تھا۔

جیوتشی وشولیشور ریاست کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں پیدا ہوئے ، مہاراجہ رنبیر سنگھ کے 29 سالہ عہد میں ڈوگری لپی کو مکمل کیا۔ "لیلاوتی" اور "ڈیوہار گیتا" جیسی ڈوگری کتب شائع کیں اور جیوتش شاستر کے متعلق چار کتب لکھیں۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے چالیس سالہ عہد میں ریاست کی اولین عوامی مجلس ڈوگرہ سدر سبھا کی صدارت کی۔ "ڈوگرہ گزٹ" نام کا اخبار شائع کروایا اور دھرم ارتھ کے مہتمم کے فرائض سرانجام دیے۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا راج تلک دیکھنے کے بعد سمت 1983 بکرمی (1926ء) میں وفات پائی۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی 88 بہاریں دیکھ چکے تھے۔

جموں میں جیوتشی وشولیشور کی مستقل یادگار زیر گمٹ "جیوتشی وشولیشور کا مندر" ہے۔ شری رام چندر جی کا یہ مندر مہاراجہ رنبیر سنگھ کی مہارانی نے تعمیر کروایا تھا اور جیوتشی وشولیشور کو دان میں دے دیا تھا۔ اسی مندر کے ساتھ ہی مہارانی نے جیوتشی جی کو ایک رہائشی مکان بھی بنوا دیا تھا۔



برج پریمی

پریم ناتھ پردیسی

میرے بچپن کا زمانہ ـــــ

جانے کون سا سن تھا جاڑے کی چھٹیوں میں ہمارے یہاں اکثر محفلیں ہوا کرتی تھیں ۔ میرے والد کے دوست احباب جمع ہو جاتے تھے ۔ والد اُردو اور فارسی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے تھے ۔ ان کے احباب میں نند لال طالب، دینا ناتھ وارِ یکوش آمد، پریم ناتھ بزاز، دینا ناتھ دلگیر، پریم ناتھ پردیسی اور جانے کون کون لوگ تھے ۔ ان لوگوں کے آتے ہی گھر میں سناٹا ہو جاتا تھا ۔ ہم لوگوں کو وہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی ۔ اس چھوٹے سے کمرے میں یہ لوگ کیا کرتے تھے معلوم نہیں ۔ کبھی کبھی قہقہے اُڑتے تھے، باتیں ہوتی تھیں ۔ خوشبودار قہوے کے اُبلتے ہوئے سماوار اور سُلگتے ہوئے کشمیری حقے کی ریل پیل ہوتی تھی ۔ آج جب اس زمانے کی یادوں کو کھرچنے کے لئے ذہن کے در و دیوار ٹٹولتا ہوں ۔ خالی خالی نظریں سامنے کی دیوار پر ڈالتا ہوں تو ماضی کے دھندلکوں میں غبار سا اُٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے ۔ میں پھر سے ایک چھوٹا سا شریر سا بچہ بن کر بہکنے لگتا ہوں ۔ دھندلے

دھندلے ان گنت سے منظر سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ میرا چھوٹا سا گھر، میرے والد، میرا خاندان، میرا پڑوس، میری گلیاں میرے ذہن کے آنگن میں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ پریم ناتھ سادھو (برسوں بعد معلوم ہوا کہ یہ کہانی کار پردیسی ہیں) جو "پریہ کاک" کہلائے جاتے تھے، انہی یادوں کی ایک شبیہہ ہے۔

برسوں بعد غالباً ۱۹۵۰ء کے آس پاس جب میں اپنے دوست (ادیب اور شاعر) ارجن دیو مجبور کی تحریک پر سٹیٹ کلچرل کانگریس میں شریک ہوا اور اس کی کارکردگی سے دلچسپی لینے لگا تو وہاں کئی بزرگوں کو دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا۔ پریم ناتھ پردیسی سے یہیں پر تجدید ملاقات ہوئی جو اس ادبی اور ثقافتی محاذ کے بانیوں میں سے تھے کئی برس اور بیت گئے۔ یہ زمانہ زبردست ادبی سرگرمیوں کا زمانہ تھا۔ کلچرل کانگریس کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹی چھوٹی ادبی انجمنیں وجود میں آئی تھیں، جن کی مختلف نظریاتی بنیادیں تھیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن، ینگ رائٹرس ایسوسی ایشن، ہندی سنسد۔ ہندی سنسد بظاہر ہندی ادیبوں کا مرکز تھا لیکن اس میں ہر زبان کے ادیب شامل تھے۔ اس کے روحِ رواں میرے دوست وسنت کمار تیجسوی (اب کے فلمی دنیا سے وابستہ ارن کول) تھے۔ میں اس انجمن میں سیکرٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اور کارروائی اُردو میں لکھتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس انجمن نے شہر کے ادبی حلقوں میں اور خاص طور پر نئی نسل کے لکھنے والوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ اس انجمن میں مختلف نظریات کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ بزرگوں میں خاص طور پر پریم ناتھ پردیسی کی سرپرستی شامل تھی۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ ہر ادبی نشست میں شریک ہوتے تھے۔ یہاں انہوں نے کئی کہانیاں پڑھیں "جھنجھنا" "خون اور سکے" "امام صاحب" "نئی سڑک" "بہتے چراغ"، "بنفشہ کے پھول"* اسی دور کی کہانیاں ہیں، جو بعد میں ان کے مجموعے

---

* "بنفشہ کے پھول" "بہتے چراغ" میں شامل نہیں ہے۔ "شاہراہ" دہلی کے سالنامہ میں شائع ہوئی تھی۔

"بہتے چراغ" میں شامل ہوئیں۔ راقم السطور نے اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اور ہندی سنسد کی ان نشستوں میں کہانیاں پڑھتا۔ پردیسی جی ہم سب کی تخلیقات انتہائی شفقت اور دھیان سے نہ صرف سُنتے اُن پر اظہار خیال کرتے بلکہ فن کے اسرار و رموز سکھاتے۔

اس کے بعد میں برابر ان کے کوارٹر پر حاضر ہوتا۔ وہ اس زمانے میں فتحکدل کے اپنے گھر سے ریڈیو کوارٹرس میں منتقل ہوئے تھے جو امیرا کدل ٹانگوں سے ملحق بارکوں میں واقع تھے۔ ریڈیو اسٹیشن پولو گراؤنڈ میں ہوا کرتا تھا۔ اور ریڈیو کا عملہ انہیں بارکوں میں اقامت پذیر تھا۔ اپنے دوست کے بیٹے کی حیثیت سے جس شفقت سے انہوں نے مجھے رکھا اسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے اس زمانے میں کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ میری کہانیوں کی تصحیح کرتے بلکہ کہانی بننے کے فن اور کردار سازی پر لیکچر دیا کرتے تھے۔ میرے ساتھ کبھی کبھی تنجبوی المعروف ارن کول بھی ہوا کرتے تھے۔ یہاں ہم انہیں ہمیشہ ریڈیو کے لئے اسکرپٹ تیار کرتے ہوئے پاتے۔ اکثر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہتے اور اپنے کام سے فارغ ہو کر مسکراتے ہوئے ہم سے مخاطب ہوتے۔ وہ ایک زمانہ سے معدے کے مریض تھے۔ کئی بار اس زمانہ میں بھی 'بلیک موشن' کے شکار ہوئے۔ لیکن اس حال میں بھی کہ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا وہ "جوابی حملہ" اور "گنبد کی آواز" جیسا مستقل پروپیگنڈا فیچر تیار کرتے رہتے تھے۔ اب ان کا تخلیقی کام برائے نام رہ گیا تھا۔ ان کے اندر کا فن کار سسکیاں لے رہا تھا اور قلم کی تمام جولانی اور ذہن کی تمام توانائی سرکاری پروپیگنڈے کی نذر ہو چکی تھی۔

چند ہفتوں کے بعد معلوم ہوا کہ معدے کے السر کے آپریشن کے لئے منشل ہسپتال میں داخل ہو گئے ہیں۔ ہم پہنچے تو اُن کا آپریشن کئی روز ہوئے ہو چکا تھا۔ ملے تو اسی پیار

سے۔ لیکن نقاہت بہت بڑھ گئی تھی لیکن ذہن بیدار تھا۔ چہرے پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ طاری تھی۔ سوچا تھا صحت یاب ہوں گے تو پھر وہی ملاقاتیں ہوں گی۔ لیکن دوسرے دن سارے شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی مانند پھیلی کہ پردیسی جی پرلوک سدھار گئے ہیں۔ یہ ۱۹۵۵ء کی جنوری کا ایک منحوس دن تھا۔

پریم ناتھ سادھو (جو پہلے رزولنق اور بعد میں پردیسی کے قلمی نام سے مشہور ہوئے) کے جد امجد پنڈت سہج کول سادھو تھے۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں بڑے صاحب اختیار تھے اور انتظامیہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے ان کی اصلی قیام گاہ بڈی بار حبہ کدل میں تھی جسے اب بھی بعض بزرگ روپ سنگھ کی حویلی کہتے ہیں۔ پنڈت سہج کول کے فرزند پنڈت مکند کول تحصیلدار تھے اور بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ فتح کدل کے نواح میں جہاں آج کل بھی یہ خاندان اقامت پذیر ہے یہ بات اب تک مشہور رہے کہ پورے علاقے پر ان کا زبردست اثر تھا۔ لیکن زمانہ کس کا ساتھ دیتا ہے۔ نہ وہ زمانہ رہا اور نہ وہ لوگ۔ جاگیردارانہ نظام کے طفیل حاصل کی ہوئی یہ املاک آہستہ آہستہ ہاتھ سے نکل گئیں اور جب پنڈت مکند کول سادھو کی آنکھیں بند ہوئیں تو ان کی اولاد کے ہاتھ میں حکمرانی نہ رہی۔ افلاس اور ناداری ان کا منہ چڑانے لگی۔ ٹھاٹھ کے دن تمام ہوئے اور باپ دادا کی حاصل کی ہوئی وہ دولت ہاتھ سے نکل گئی۔ زمین کے وہ بڑے بڑے قطعات اور عمارتوں کی وہ قطاریں بک گئیں یہانتک کہ پنڈت مکند کول کی اولاد کو پیٹ بھرنے کے لئے ادنی ملازمتوں کا سہارا لینا پڑا اور اپنے لئے الگ جائے پناہ تلاش کرنا پڑی۔

پنڈت مکند کول کی اولاد میں سے ایک فرزند پنڈت مہادیو کول تھے جو محکمہ انسداد سیلاب کاری میں ملازمت پا چکے تھے۔ محکمہ عارضی تھا اور جب تک وہ اپنی

پوری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ان کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اب پیٹ کے لالے پڑ گئے لیکن خاندان مشترکہ تھا۔ گھر میں دوسرے بھائی اور ان کے خاندان تھے اس لئے کسی نہ کسی طرح چولہا جلتا رہا۔ ان ہی کے گھر میں سنہ ۱۹۰۹ء کے آس پاس ایک بیٹے کا جنم ہوا جس کا نام مدھوسودھن رکھا گیا۔ یہی بچہ آگے چل کر پریم ناتھ پردیسی کے نام سے ریاست جموں و کشمیر کے ادبی حلقوں میں چھا گیا اور کشمیر کا پریم چند کہلایا۔

مدھوسودھن کے اوائل بچپن کا زمانہ صاحب ثروت دادا کی گود میں بڑے ناز و نعم سے گزرا۔ جب خاندان پر برا وقت آیا تو ننہال منتقل ہو گئے۔ یہیں ان کی تعلیم کا انتظام ہوا اور انہیں پریم ناتھ کہا جانے لگا۔ یہی نام اسکول کے رجسٹر میں درج ہوا۔ میٹرک کا امتحان باغ دلاور خان کے سرکاری ہائی اسکول سے پاس کیا اور ایس۔ پی کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیج دیا گیا۔ لیکن اس اثنا میں ذمہ داریوں نے سر اٹھانا شروع کیا۔ خاندان کے بزرگوں اور ننہال کے توڑے ہوئے لقمے کہاں تک پیٹ بھرتے۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کا افسوس انہیں زندگی بھر رہا۔ اس کا ذکر انہوں نے تفصیل سے خود کیا ہے۔ ایک اقتباس:

"سری نگر میں رہتا ہوں اور سرکار کی نوکری کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوا۔ فراغت کا ایک لمحہ بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس لئے کالج میں داخل ہو کر تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا اور زندگی کے بھنور میں کودنا پڑا۔ حالانکہ وہ عمر بھنوروں میں کودنے کی نہ تھی، ہنسنے، قہقہے لگانے اور کھیلنے کی تھی مگر افلاس اور کم مائیگی کے شدید احساس نے تمام آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔"

—— (ماہنامہ "فسانہ" الہ آباد نمبر ۸)

کشمیر کے مشہور صحافی 'ادیب' دانشور اور عوامی رہنما پنڈت پریم ناتھ بزاز کا تعلق پردیسی کے ساتھ گہرا رہا ہے۔ دونوں نے مدت دراز تک ادب اور صحافت کے میدان میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کیا۔ راقم السطور نے بزاز صاحب کو جب ان دنوں کی یاد دلائی تو انہوں نے اپنے خط میں لکھا:-

"روحق کے والد ان کے بچپن میں انتقال کر گئے تھے اور ان کے لئے جدوجہد حیات آسان نہیں تھی۔ ایک حساس اور غیرت مند انسان کی حیثیت سے انہوں نے ماضی کے افلاس زدہ دنوں کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ جب ہم ملے تو وہ میٹرک کر چکے تھے اور ایک وکیل (جو میرا خیال ہے ان کے ماموں تھے) کے ساتھ منشی گیری کا کام کرتے تھے"

— (راقم السطور کے نام پنڈت بزاز کے ایک خط سے اقتباس)

پردیسی نے اپنی تحریروں میں اپنے والد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے اپنے دادا پنڈت مکند کول سادھو کے بارے میں قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی ادبی دلچسپیوں کا چشمۂ فیض دادا جان کی ان محفلوں کو قرار دیا ہے جہاں شعر و ادب کے مسائل پر بحث و تمحیص ہوتی تھی۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد کا انتقال ان کے بچپن میں ہوا تھا اور بزاز صاحب کے بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ والد کے انتقال کے بعد مشترکہ خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔ بڑے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ رشتوں اور ناطوں میں بال پڑ گیا تھا۔ پریم ناتھ گھر سے بے گھر ہو گئے اور ننھیال میں پنڈت رادھا کرشن وکیل کے گھر پناہ لی جہاں زندگی کے بہت اچھے ماہ و سال گذارے۔ ان کی ایجنسی کرتے رہے۔ کچھ عرصہ مقامی ریلوے ایجنسی میں کلرک رہے اور آخر ان کا تقرر محکمہ کسٹم اور ایکسائز میں محاسب کی حیثیت سے ہوا۔ سال ہا سال تک وہ اسی محکمے میں تعینات رہے۔ اس ملازمت کے دوران انہیں

ریاست کے مختلف علاقوں میں گھومنے کا موقعہ ملا جہاں انہوں نے طرح طرح کے لوگوں کو قریب سے دیکھا اور ان کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ پردیسی کی تحریروں میں ان سب حقائق نے بنیادی حیثیت حاصل کی۔ ان کے یہاں ان کرداروں کی مرکزی حیثیت ہے جن کی آرزومندیاں ان کی بجھی بجھی آنکھوں میں لرز رہی تھیں، جن کی نفسیات[۳] جن کے دل کا درد، جن کی بے بسی اور روتی بسورتی بس سانس لیتی ہوئی زندگی کا قریب سے وہ مطالعہ کر چکے تھے۔ یہی بعد میں ان کے ادب کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ محکمہ اکسائیز کی ملازمت ہی دراصل پردیسی کے باطن کے شعلے کو ہوا دیتی ہے، اور وہ سامنے کے مواد کو تخلیقی عمل کی خراد پر چڑھا کر ایک ٹھوس پیکر خلق کرتے ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل جو کہانیاں انہوں نے لکھیں ان میں پراسرار اور نادیدہ دنیاؤں کی سیاحت کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔

پردیسی نے زندگی کا بہترین حصہ، اپنے شباب کا پورا ہیجان خیز دور اس محکمے کے سب انسپکٹر کی حیثیت سے گذارا جہاں بعد میں وہ انسپکٹر ہو گئے تھے اور جہاں سنہ ۱۹۴۷ء تک پندرہ سولہ سال ملازمت کرنے کے بعد بھی ان کا مشاہرہ اسی روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں تھا۔ مجال داری کو پا کر پردیسی نے دنیا جہاں کی بادشاہت جیسے حاصل کرلی تھی اور وہ بہت خوش تھے۔ میرے ایک استفسار پر پنڈت بزاز لکھتے ہیں:-

"جوں ہی ریاست کے محکمہ کسٹم میں ان کو نوکری ملی وہ تمام دوسرے کشمیری پنڈتوں کی طرح بہت خوش تھے کہ انکو سرکار کی ملازمت حاصل ہوئی ہے کیونکہ اس سے گذر بسر کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔"٭

(٭ ۔۔ راقم السطور کے نام پنڈت پریم ناتھ بزاز کے ایک خط کا اقتباس)

---

[۳] سرکاری ملازمت کشمیری پنڈتوں کی ایک بڑی کمزوری رہی ہے اور اب بھی ہے جس کی طرف بزاز صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ پردیسی نے بعد میں اپنی کئی کہانیوں میں اس رجحان کو خود بھی تضحیک کا نشانہ

لیکن یہ سب طفل تسلیاں تھیں۔ محالداری میں ان کو کم از کم دو وقت کی روٹی ملنے کی بشارت تھی۔ اس میں شاید "بالائی" آمدنی کے بھی امکانات تھے کہ جس سے پریم ناتھ سادھو نہ صرف اپنی اور اپنے کنبے کی پرورش کر سکتے تھے۔ بلکہ کچھ پیسہ پس انداز بھی ہو جاتا۔ لیکن یہ بھرم زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور وہ اپنی قسمت کی ستم ظریفی پر نالاں نظر آتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جب ریڈیو کشمیر کا قیام عمل میں آیا تو اُن کو بھی بعض دوسرے اہم قلمکاروں اور فنکاروں کے ساتھ ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ اس وقت تک وہ برصغیر کے اُردو ادبی حلقوں میں معروف ہو چکے تھے۔ اور ان کو صفِ اوّل کے افسانہ نگاروں میں جگہ ملتی تھی۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "شام و سحر" اور "دنیا ہماری" شایع ہو چکے تھے۔ ریڈیو میں ۱۹۵۳ء تک وہ لگن اور تندہی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ لیکن یہی لگن ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ریڈیو کشمیر اپنے تشکیلی دور میں تھا اور انہیں شب و روز کام کرنا پڑتا تھا۔ حق تو یہ ہے ریڈیو کشمیر کی آبرو ان کی ذات سے قائم تھی۔ یہاں ان کو تخلیقی کام کے لئے کوئی فرصت نہیں تھی۔ پھر بھی جب فرائض منصبی سے کچھ لمحات ملتے تو کچھ نہ کچھ لکھتے۔ ان تحریروں میں فن کی مشاقی اور شعور کی گہرائی کار فرما ہے۔ وہ افسانہ نگاری سے ڈرامہ نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس دور کی یادگار ان کے چند قابل قدر ڈرامے ہیں لیکن اے وائے ظالم موت کے سفاک ہاتھوں نے جب وہ بہ مشکل چھیالیس ۴۶ برس کے تھے، کشمیر کے اس حقیقت آمیز ترجمان کو ہم سے چھین لیا جس نے اُردو کہانی

(بقیہ صفحہ ۲۱۱) بنایا ہے۔ ان کا "جھنجھنا" کشمیری پنڈتوں کی نفسیات کا اچھا مطالعہ ہے اپنے ایک کردار کو جوان کے ذریعے دوسرے کردار گنگا دھر کو کہلواتے ہیں، "اب نہیں چلے گا پنڈت تم بزدل ہو، نوکریوں کے لئے مرتے ہو۔ مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں پیٹ بھر کر روٹی ملنی چاہیئے۔"

اور اُردو ڈرامے کے توسط سے کشمیر کی آواز پوری اُردو دنیا تک پہنچائی تھی۔

لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی پردیسی کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ ان کے دادا پنڈت مکند کول صاحب علم تھے اور اردو و فارسی ادبیات سے شغف رکھتے تھے۔ ان کے یہاں علم و ادب کی محفلیں ہوا کرتی تھیں، جن میں شہر کے اکثر اہلِ علم شریک ہوتے تھے۔ پنڈت مکند کول بیٹے کے انتقال کے بعد پوتے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ پردیسی دادا جان کی ان محفلوں میں بیٹھ کر بڑے بزرگوں کی باتوں اور ان کے مباحثوں کو سنا کرتے تھے۔ ان محفلوں میں بیٹھ کر پردیسی کے اندر کے تخلیق کار کی تہذیب ہوئی اور ان کی خفتہ صلاحیتوں میں اُبال آنے لگا۔ اپنے ایک مضمون میں ان محفلوں کی کارگزاری کا ذکر کرتے ہوئے پردیسی خود رقمطراز ہیں:

"لکھنے پڑھنے کا شوق ابتداء سے ہی تھا۔ خاص کر طبیعت اردو زبان کی طرف بیحد مائل تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ میرے دادا جان، جو اپنے وقت کے عالم مانے جاتے تھے، اپنے گھر میں کبھی کبھی ادبی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ سارے شہر کے ادب نواز بزرگ اور سخن فہم حضرات ان میں حصہ لیتے تھے اور گرما گرم بحثیں چھڑ جاتی تھیں۔ کبھی مولانا حسن نظامی کے مضامین پر، کبھی چکبست کی قومی شاعری پر، کبھی منشی پریم چند کے افسانوں پر اور کبھی مولانا حالی کی نیچرل شاعری پر۔ میں ان دنوں چھوٹا تھا اور دادا جان کے چلم پر آگ رکھنے کی ڈیوٹی میرے ذمہ رکھی گئی تھی۔ میں ایک کونے میں بیٹھا ان بزرگوں کی بحثیں توجہ اور دلچسپی سے سنا کرتا اور متاثر ہوتا تھا...... کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ کہانی

لکھنا کیا مشکل کام ہے ۔ میں ضرور کہانیاں لکھوں گا ۔ مگر دوسری مجلس میں جب شاعری پہ بحث ہوتی تھی اور وہ تڑپانے والے شعر سنائے جاتے تھے اور میرا ارادہ بدل جاتا تھا اور میں شاعر بننے کی ٹھان لیتا ——"

٥ ــ (میں اور میرے افسانے)

پردیسی کے داداجان کی یہ محفلیں کافی عرصہ تک منعقد ہوتی رہیں۔ اور وہ بڑی خاموشی سے داداجان کی چلم میں آگ سلگاتے رہے لیکن کانوں میں پڑی ہوئی شعروادب کی باتیں ان کے دل میں آگ سلگاتی رہیں جو بعد میں بقول ان کے شعلہ جوالا بن گئی اور وہ نثر اور شعر دونوں میں اپنے باطن کے کرب کا اظہار کرنے لگے لیکن کچھ عرصہ کے بعد پنڈت کند کول کا انتقال ہوا اور شعروسخن کی یہ بزم اجڑ گئی ۔ اس دوران وہ چکبست، حالی، اقبال، جوش، ٹیگور، پریم چند اور دوسرے ادباء وشعراء کے کارناموں سے متعارف ہو چکے تھے اور انکی کہانیوں اور اشعار سے ان کے دل پر ایسے اثرات مرتب ہو رہے تھے جو انہیں زندگی بھر تڑپاتے رہے ۔ ایک ایسی ہی محفل میں جب "زمانہ" کانپور میں پریم چند کی شائع شدہ کہانی "بوڑھی کاکی" پڑھ کر سنائی گئی تو پردیسی بے چین ہو اٹھے ۔ اس کا ذکر خود کرتے ہیں :۔

" مجھے آج تک یاد ہے کہ جب ایک صاحب نے منشی صاحب کی کہانی "بوڑھی کاکی" سنائی تو میں ساری رات اس کی بے بسی پہ روتا رہا ۔"

اس دوران منشی پریم چند کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے ۔ پریم چند کے ساتھ ساتھ سجاد حیدر یلدرم، مہاشے سدرشن، اعظم کریوی، نیاز فتح پوری،

مجنوں گورکھپوری اور کئی اور افسانہ نگاروں نے نئے فنی تصورات اور امکانات کے ساتھ اُردو افسانے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ادھر رابندر ناتھ ٹیگور کے ادب لطیف اور نثری شاعری کے اُردو ترجموں نے زبان و بیان کا فسوں جگا دیا۔ پردیسی کا کمسن ذہن اسی فضا میں پروان چڑھا۔ چنانچہ ان ملے جلے اثرات کے تحت جب انہوں نے اپنے جذبات کو لفظ و معنی کا جامہ پہنانا چاہا تو وہ اپنے لئے کوئی راستہ معین نہ کر سکے۔ شروع شروع میں وہ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور رونق تخلص اختیار کیا۔ لیکن یہ میدان راس نہ آیا تو ٹیگور اور رومانی دبستان کے لکھنے والوں کے تتبع میں ادب لطیف لکھنے لگے۔ بعد کے برسوں میں جب ذوق نکھرا تو پردیسی کے قلمی نام سے کہانیاں لکھنے لگے۔

پردیسی کے تخلیقی سفر کا آغاز ۱۹۲۴ء سے ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک وہ شعر کہتے رہے جب اس میں بھرپور اظہار نہ کر سکے تو اس میدان کو ترک کر دیا۔ اس کی طرف خود اشارہ کرتے ہیں:-

"سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک میں نے شاعری کی لیکن بعد میں اس سے نفرت ہو گئی اور کہانیوں کی طرف مائل ہوا"

(میں اور میرے افسانے) —— ٥

ان کا ابتدائی کلام پنڈت گوپی ناتھ گورٹو نام کے ایک کشمیری پنڈت کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ "اخبار عام" میں شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا اور اس میں کشمیر اور کشمیریوں سے متعلق چند صفحات مخصوص ہوا کرتے تھے۔ لیکن اسی دوران میں لالہ ملک راج صراف نے جموں سے ریاست کے پہلے اخبار "رنبیر" کا اجرا کیا تھا۔ پردیسی اس زمانہ میں دسویں جماعت کے طالبعلم تھے۔ انہوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی ادبی زندگی کا آغاز "رنبیر" سے

ہوا ہے اور جب ان کے اشعار شائع ہونے لگے تو انہیں لگا کہ جیسے دنیا جہاں کی بادشاہت حاصل ہو گئی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ پردیسی کی شاعری کی یہ شروعات تھیں اور اخبار عام میں ان کی اکا دُکا چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ البتہ لالہ ملک راج صراف نے ان کے کلام پر اصلاح دی اور ان کی حوصلہ افزائی ضرور کی۔ پردیسی جو اس زمانہ میں پریم ناتھ رونق تھے، اس کا اعتراف خود کرتے ہیں:

"جب میرا نام پہلی بار اس اخبار میں شائع ہوا تو میں خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بڑا آدمی بن گیا ہوں اور میرے ہاتھوں میں ایسی طاقت آگئی ہے جس سے میں ساری دنیا میں سیاسی لحاظ سے انقلاب لا سکتا ہوں۔ اس کے فوراً بعد میں نے چند نظمیں موزوں کیں جن کو شری ملک راج صراف نے مناسب اصلاح کے بعد اپنے اخبار میں شائع کیا۔ اس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ میری ادبی زندگی کا آغاز رنبیر سے ہی ہوا"

اس کے بعد کافی عرصے تک پنڈت بزاز کے اخبار "وِتستا" میں ان کا کلام شائع ہوتا رہا۔ لیکن جب شاعری راس نہ آئی تو شعر گوئی ترک کی۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کے اخیری دور تک ضرورت کے مطابق وہ کبھی کبھی شعر کہتے رہے جبکہ ان کا وسیلۂ اظہار کلی طور پر نثر تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد محکمہ کسٹم اور ایکسائز میں محال دار (سب انسپکٹر) کی حیثیت سے جب ان کا تبادلہ جموں ہوا تو انہوں نے پردیسی کا قلمی نام اختیار کیا۔ پنڈت بزاز کے مطابق یہ ۱۹۳۲ء کا زمانہ ہے۔ لکھتے ہیں:-

"۱۹۳۲ء کے سرما میں کچھ عجیب حالات کے باعث مجھے تین ماہ تک جموں میں رہنا پڑا۔ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ پریم ناتھ پردیسی بھی جموں

شہر کے نواحی علاقے کے ایک محصول خانے میں محالدار کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے قریبی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اس لئے ہماری ملاقاتیں اکثر و بیشتر ہونے لگیں۔ انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا تھا اور اپنا تخلص رونق بھی ترک کیا تھا۔ کیوں کہ یہ میدان ان کو راس نہ آیا تھا اور یہ ان کے لئے مشکل کام تھا۔ وہ اب کہانی کار بن گئے تھے اور پردیسی کا قلمی نام اختیار کر لیا تھا۔"

• — (راقم کے نام پنڈت بزاز کے خط سے اقتباس)

سبب کچھ بھی ہو لیکن حق بات تو یہ ہے کہ رونق کا میدان شاعری نہیں تھا۔ انکی شاعری میں کوئی دم خم نہیں ملتا۔ نہ تو ان کے یہاں خیال کو شعری قالب میں ڈھالنے کی صناعی ملتی ہے۔ موضوع کا تنوع اور بیان کی لطافت بھی نظر نہیں آتی۔ بلندی خیال اور نظر کی گہرائی بھی نہیں ملتی۔ وہ صرف قافیہ پیمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ ان کے جذبات میں ایک بے چینی سی نظر آتی ہے اور اس کے لئے وہ مسلسل کوشش کئے جا رہے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ بھی تھی کہ اس دور تک آتے آتے کئی پختہ مشق اور سربر آوردہ لوگ چھا گئے تھے جو روایتی انداز میں شعر کہتے تھے اور مقابلتاً اچھے شعر کہتے تھے۔ کئی لوگ شمالی ہندوستان کے معیاری پرچوں میں اپنے کلام کے توسط سے پہچانے جانے لگے تھے۔ اس لئے رونق کا شعر و شاعری کے میدان سے ہٹ جانا قابل فہم ہے۔

پنڈت پریم ناتھ بزاز نے اگست ۱۹۳۵ء میں "وتستا" کے بعد ایک نیا ہفت روزہ "ہمدرد" کے نام سے جاری کیا جو جولائی ۱۹۴۳ء میں روزنامہ ہوگیا۔ "وتستا" کے بعد یہ پہلا ہفت روزہ تھا جو سری نگر سے جاری ہوا۔ کشمیر میں اردو صحافت کا سنگ

بنیاد ڈالنے اور اسے بلندیوں تک لے جانے میں بزاز صاحب کی مساعی ناقابل فراموش ہے۔ انہوں نے ہمدرد کا معیار بلند تر کرنے کے لئے اس دور کے مقبول، معروف اور باصلاحیت فن کاروں اور ادیبوں کا تعاون حاصل کیا۔ پردیسی اسی حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کے گہرے مراسم تھے۔ "وتستا" میں لکھنے کے بعد اب پردیسی ہمدرد کے مستقل کالم نویس ہو گئے اور برسوں تک قلمی تعاون دیتے رہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ ہمدرد کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن مرتب کرتے رہے۔ پردیسی اس دور میں کئی فرضی ناموں سے لکھنے لگے تھے۔ سبب یہ تھا کہ وہ صرف ادب ہی تخلیق نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے ملکی سیاست اور انتظامیہ کو بھی ہدف بر ملامت بنانا شروع کیا تھا۔ ایسا کرتے ہوئے ان کے قلم میں زبردست جولانی پیدا ہوتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب مہاراجہ ہری سنگھ کی تاناشاہی کے خلاف کشمیر میں ایک تحریک کا آغاز ہوا تھا اور ریاست کے لوگ تاناشاہی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے برسرپیکار ہو گئے تھے۔

قبل اس کے کہ ہم پردیسی کی ادبی سرگذشت کا ذکر آگے کریں یہ بات کہنا ضروری ہے کہ شعر گوئی کو مکمل طور پر ترک کرنے سے قبل وہ نثر کے شعبے کی طرف مائل ہوئے اور انہوں نے ادب لطیف، انشائیے اور مختصر کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ کبھی کبھی نثری نظموں کی طرف بھی توجہ کرتے رہے۔ چنانچہ وہ "رنبیر" جموں کے ساتھ ساتھ "وتستا" "ہمدرد" "مارتنڈ" "رتن"* کے علاوہ "ملاپ" (لاہور) "کرم ویر" (لاہور) "جانِ سرور" (لاہور) اور ماہنامہ "شاہکار" (لاہور) ہلالہ تاجور نجیب آبادی کی ادارت

* "رتن" لالہ ملک راج نے جموں سے جاری کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں شایع ہوا۔ اس کے پہلے مدیر شانتی سروپ نشاط تھے۔ یہ ہندوستان میں شایع ہونے والے بھی بعض بچوں کے رسائل میں کافی مقبول تھا۔ لالہ نرسنگھ داس نرگس کے مطابق پردیسی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اسی پرچے سے کیا تھا۔ لالہ صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے برسوں پہلے ان کا کلام اور دوسری تخلیقات شایع ہوتی رہی ہیں۔ (پ۔ پ)

میں شائع ہونے والے پرچے کے صفحات میں نظر آتے ہیں۔ ان کی نثری تخلیقات اس زمانہ میں بھی رونق کے قلمی نام سے شائع ہوتی رہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعد کے برسوں میں جب وہ پردیسی کے قلمی نام سے معروف ہو چکے تھے وہ رونق کے قلمی نام سے بھی لکھنا پسند کرتے ہیں۔

ذیل میں چند نگارشات کے عنوان اپنے سن اشاعت کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پردیسی نے بلا کسی تخصیص کے اپنے قلمی ناموں کا استعمال مختلف اوقات پر کیا ہے۔ یہ تخلیقات ان کے کسی مطبوعہ مجموعے میں شامل نہیں ہیں:

عنوان	قلمی نام	تاریخ/سن اشاعت	رسالہ/اخبار
• اندھا (افسانہ)	رونق کاشمیری	یکم جنوری ۱۹۳۳ء	"وتستا" سرینگر
• امال (")	پریم ناتھ سادھو رونق کاشمیری	۵ فروری ۳۳ء	" "
• راگنی کے گیت (")	پریم ناتھ رونق کاشمیری	فروری ۱۹۳۴ء	کرم ویر لاہور
• پُنر وواہ (")	" "	مارچ ۱۹۳۴ء	" "
• افسانہ (")	رونق کاشمیری	ستمبر ۱۹۳۴ء	ملاپ لاہور
• بن مالا (")	پردیسی	جون ۱۹۳۶ء	" "
• سندھیا کا شرات (")	پریم ناتھ سادھو رونق	۹ اپریل ۱۹۳۸ء	شاہکار "
• سازش (ادب لطیف)	" " "	جنوری ۱۹۳۹ء	" "
• نابینا (" ")	" " "	ستمبر ۱۹۳۹ء	" "
• روندی ہوئی کلیاں (افسانہ)	پردیسی	جولائی ۱۹۴۲ء	بہار کشمیر "

یہ صرف چند مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پردیسی نے رونق صرف تخلص کے طور پر استعمال نہیں کیا تھا اور اسے صرف شعر و شاعری کے میڈیم کے لئے ہی

استعمال نہیں کیا تھا بلکہ شاعری ترک کرنے کے بعد بھی اس نام سے اپنے آپ کو الگ نہ کر سکے۔

پریم ناتھ پردیسی اب تخیلی داستان طرازی کے سراب سے باہر آچکے تھے۔ مثالیت پسندی کے عناصر جو شروع شروع میں ان کی کہانیوں میں نظر آتے ہیں اب نہیں رہے تھے۔ اب وہ کشمیر کے فاقہ مست اور افلاس زدہ لوگوں کی کہانیاں لکھنے لگے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پردیسی کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں ہمدرد کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ روزنامہ "مارتنڈ" کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جو ۱۹۳۵ء میں ہی معرض وجود میں آچکا تھا اور جسے بہت جلد اپنے معاصر اخباروں کی دنیا میں بڑا نام حاصل ہوا۔ اس اخبار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنے اولین دور میں بڑے کارنامے انجام دئے۔ اس کے سالناموں، افسانہ نمبروں اور خاص اشاعتوں نے شمالی ہندوستان کی اُردو دنیا میں نام پایا۔ مارتنڈ اور ہمدرد کے درمیان عرصہ دراز تک معاصرانہ چشمک رہی اور دونوں اخباروں کے کالم نویس ایک دوسرے کو تضحیک کا نشانہ بناتے رہے۔ پردیسی مارتنڈ اور ہمدرد دونوں میں مستقل لکھتے تھے اور اس دوران انہوں نے نثر کے شعبے میں کئی نئے تجربے کئے۔ دونوں اخباروں میں ان کی تحریریں مختلف ناموں سے شائع ہوتی رہیں۔ پریم چند اور سعادت حسن منٹو کی طرح وقتی مصلحتوں کے پیش نظر انہوں نے اپنے لئے کئی قلمی نام وضع کئے تھے۔ عرصہ دراز تک وہ 'سادھو کاشمیری'، 'رونتی'، 'پریم ناتھ سادھو'، 'علائی'، 'بابو پردیسی' اور آخر میں 'بالک رام باری' کے نام سے لکھتے رہے۔ اس پورے دور میں ان کا ذہن اپنی پوری توانائی کے ساتھ بڑے کارنامے انجام دیتا رہا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی تخلیقی قوتوں کو جلا ملی بلکہ انہوں نے مارتنڈ اور ہمدرد کے قد و قامت میں اضافہ کیا۔

اپنی نجی زندگی میں پردیسی نے کافی اتار و چڑھاؤ دیکھے تھے۔ والد کی بے وقت موت کے بعد جب دادا جان چل بسے تو پردیسی پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ابھی دسویں جماعت کا امتحان کامیاب کیا تھا اور کالج میں داخلہ لیا تھا کہ افلاس کے مہیب سائے آسیب زدہ روح کی طرح چاروں طرف منڈلانے لگے۔ افلاس کے جان لیوا اور اذیت ناک تجربے نے ان پر غریبی اور محتاجی کی جان کنی ظاہر کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تاناشاہی کا جبر و استبداد کشمیری عوام کی جڑوں کو کھوکھلا کر چکا تھا۔ جاگیردارانہ اور جکدارانہ نظام کا استحصال، نوکرشاہی کی بدعت، ناخواندگی اور اقتصادی بدحالی نے پوری ریاست کو پامال کر دیا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی شخصی حکومت نے شروع شروع میں اپنی سیاسی حکمت عملی سے اپنی آزاد خیالی اور جمہور نوازی کا احساس دلایا تھا۔ لیکن یہ محض ایک سراب تھا اور بہت جلد یہ بات کھل گئی کہ نظام دار و رسن وہی ہے صرف قاتل بدل گئے ہیں۔ رشید تاثیر اس خونین دور کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس نے (مہاراجہ نے) بیگار کے قدیم رواج کو محض رسمی طور پر بند کرنے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی زمین پر لوگوں کے حق کو برائے نام تسلیم کیا گیا۔ عملی طور پر کشمیری برابر بیگار کے ٹٹو اور جاگیردارانہ نظام کے غلام در غلام تھے۔ جلسہ، جلوس تحریر و تقریر ان دنوں لغاوت سے بھی زیادہ خوفناک جرم تھا کشمیری عوام کو درخت بونے کی اجازت تو تھی مگر کاٹنے کے لئے حکومت سے اجازت لینا پڑتی تھی۔ فوج میں بھرتی ہونا تو در کنار چھ انچ لمبا چاقو رکھنے سے برسوں جیل کی ہوا کھانا پڑتی تھی ____"

● ___ ("تحریک حریت کشمیر" حصہ اول ص ۷۳" - رشید تاثیر)

مہاراجہ کی مقبولیت بہت جلد ختم ہو گئی ۔ وہ اپنے مفاد پرست، عوام دشمن اور نااہل مشیروں کے نرغے میں آ گیا اور عوام کے ساتھ اس کا رشتہ کٹ گیا۔ مہاراجہ کی عیاش پسند طبیعت، حکمراں طبقے کا دباؤ، ٹیکسوں کی بھرمار، بے روزگاری، ناخواندگی اور روز بروز بڑھتی ہوئی غربت، ۔ عوام کے سینے بغاوت کی آگ سے دہکنے لگے ۔ مہاراجہ کے سیاسی مشیر اور وزیر خارجہ البین بینرجی نے اس گھٹن سے مجبور ہو کر اپنے عہدے سے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا کہ ریاستی انتظامیہ کی مشینری کو سرے سے بدلنے کی ضرورت ہے ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء میں شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کی تشکیل ہوئی ۔ یہی جماعت ۱۱ جون سنہ ۱۹۳۹ء کو آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہوئی اور ہندوستان کی تحریک آزادی سے تحریک پا کر اس نے ایک نئی انگڑائی لی ۔ پردیسی کو پہلی بار احساس ہوا کہ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ ضایع کیا ہے، وقت کی آہٹ پا کر اپنی کم مائیگی اور فرض ناشناسی کا احساس کیا ۔ اس کا اعتراف خود کرتے ہیں :-

"سنہ ۱۹۳۲ء سے سنہ ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا اس پر فخر نہیں کر سکتا .... اس وقت مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطن عزیز کے کیا فرائض ہیں ۔ اس وطن کے، جس کے چالیس لاکھ باشندے پونے چار سو سال غلام در غلام چلے آ رہے ہیں ۔ جس کی جڑیں افلاس اور لوٹ کھسوٹ سے کھوکھلی ہو چکی ہیں ..... اس سال ہمارے قائد حضرت شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے مسلم کانفرنس کو توڑ کر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا ۔ یہ ایسی تبدیلی تھی جس نے میرے سامنے نئی راہیں کھول دیں بلکہ ہمارے

ملک کے سامنے نیا نظریہ رکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب بھی اگر میں اس نظریہ کا ساتھ نہ دوں تو میری افسانہ نگاری بے کار ہے اور آنیوالا مورخ خدا جانے کن ناموں سے مجھے یاد کرے گا۔ سرکاری ملازم ہونے ہوئے میں نیشنل کانفرنس میں شامل تو نہیں ہو سکتا تھا مگر درون پردہ میں عوام کو اپنی کہانیوں سے غلامی، افلاس اور استحصال کا احساس دلا سکتا تھا۔"

(میں اور میرے افسانے) ---۰

یہ سب اپنی جگہ، ریاست میں قومی تحریک کے پیدا ہونے سے قبل پریم چند، کپی اور بیدی سے متاثر ہو چکے تھے جن سے ان کی ذہنی اور جذباتی تہذیب ہو چکی تھی۔ ریاست میں سیاسی بیداری پیدا ہونے سے قبل وہ پریم چند کی حقیقت پسندی سے متاثر ہو چکے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے آس پاس "انگارے" شائع ہو چکی تھی جس میں ایک نئے ادراک کا آہنگ تھا۔ فنی لحاظ سے انگارے کے افسانوں میں کئی کوتاہیاں تھیں۔ لیکن اس میں جس نئے شعور کی آہٹ تھی اس نے پریم چند کی کھوکھلی جمال پرستی اور زندگی کی رمق سے عاری تخیل پرستی اور جذباتیت کو دھچکہ پہنچایا تھا "کفن" کی اشاعت نے سماجی حقیقت نگاری کی ایک نئی منزل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ اس بات پر یقین کرنے لگے تھے کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کس طرح انسانی قدروں کو پامال کر سکتا ہے اور اس کی زد میں آنے والوں کو DEHU- MANIZE کر سکتا ہے۔ انہیں یہ بھی محسوس ہوا کہ ٹیگور کے تتبع میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی معنویت ختم ہو چکی ہے اس لئے انہوں نے اپنے مطالعے کو وسیع تر کر لیا اور انہوں نے مغربی اور اشتراکی فن کاروں خصوصی طور پر گورکی اور چیخوف کا مطالعہ کیا جس سے ان کے ذہن کے دریچے وا ہونے لگے۔ خود اعتراف

کرتے ہیں:۔

"جب ترقی پسند مصنفین کی پہلی کتاب "انگارے" شائع ہوئی تو مجھے شدّت سے اس امر کا احساس ہوا کہ جو کچھ آج تک میں نے لکھا ہے سب بیکار ہے کیوں کہ اس میں رومان کے سوا کچھ نہ تھا"۔

۰ــ (میں اور میرے افسانے)

پردیسی نے ایک باشعور فن کار ہونے کا ثبوت فراہم کرکے ان تمام حالات کو اپنی شخصیت کا حصّہ بنالیا اور اپنے قلم کی جولانیوں سے نئے پیکر تراش لئے۔ انہوں نے موضوع کی ہمہ گیری کے ساتھ فن کے اعلیٰ نمونے خلق کئے اور اس میدان میں سب سے آگے اپنا جھنڈا گاڑ دیا۔

بیسویں صدی کے چوتھے دہے تک آتے آتے پردیسی اب ایک وسیع تر ادبی دنیا میں آ چکے تھے۔ بچپن کے بےفکرے دنوں میں دادا جان کی جن ادبی محفلوں میں وہ تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے اب برخاست ہو چکی تھیں لیکن غیر شعوری طور پر ان کے سینے میں جو چنگاری سلگ اٹھی تھی وہ اب شعلۂ جوالہ بن چکی تھی۔ چنانچہ اب وہ خود اپنے احساس کو نثر اور شعر میں ڈھال رہے تھے۔ انہوں نے اپنے چند دوستوں کے ایما پر "حلقۂ اربابِ ذوق" کے نام سے ایک ادبی انجمن تشکیل دی۔ سری نگر کے نوجوان ادیبوں کا ایک مختصر سا حلقہ قائم ہوا۔ اس کی نشستیں پردیسی کے مکان تک محدود تھیں جہاں ان کے دادا جان کی محفلوں کی طرح شعر و ادب کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کے دریچے بند ہوئے لیکن ایک نیا دروازہ وا ہوا۔ دورِ حاضر کے مشہور فلمساز اور ہدایت کار اور اس زمانہ کے ترقی پسند ادیب اور فکشن

رائٹر راماننداساگر پردیسی کے بہت قریب آگئے۔ راماننداساگر چہ اگرچہ کشمیر کے رہنے والے ہیں، بیشتر وقت کشمیر سے باہر رہتے تھے جہاں وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے پردیسی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ سرینگر میں کھولنے کی تحریک دی۔ پردیسی جو پہلے ہی اس تحریک سے متاثر ہو چکے تھے فوراً اس طرف مائل ہوئے۔ چنانچہ حلقہ ارباب ذوق کے وہی احباب اس نئی انجمن میں شریک ہوئے۔ ابتداء میں اس انجمن کے جلسے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو پردیسی کے مکان پر ہوا کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ انجمن کا حلقہ اثر وسیع ہوتا گیا۔ اور انجمن کی کارگذاریوں سے ادب نواز لوگ دلچسپی کا اظہار کرنے لگے۔ تب لب کو سکول کے ہال اور ایس پی کالج کے ہال میں میٹنگیں منعقد ہونے لگیں۔ اس چھوٹی سی انجمن کی کارگذاری نے ریاست میں ایک ہمہ گیر ادبی تحریک کی شکل اختیار کر لی اور بعد میں نہ صرف اردو کی نشوونما میں مدد کی بلکہ کشمیری اور ڈوگری ادب کے لئے نئی راہیں کھول دیں۔ اس انجمن کے سیکرٹری مختلف وقتوں پر سوم ناتھ زتشی، قیصر قلندر، علی محمد لون وغیرہ تھے۔ ان ادبی نشستوں کی کاروائی نندلال واتل کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار "نوویگ" میں چھپتی تھیں اور بعد میں ہفت روزہ "نظام" بمبئی کی اشاعتوں میں شائع ہوتی رہیں۔ اس انجمن کی نشستوں میں مقامی ادباء اور شعراء اور ادب نواز حضرات کی خاصی تعداد شریک ہوتی تھی۔ اسی دوران یہاں راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، بلراج ساہنی، دیویندر ستیارتھی جیسے لوگ بھی آتے رہے اور انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ مقامی ادباء میں پروفیسر لشٹپ، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، صلاح الدین احمد، پران کشور، کنول نین پرواز، محمود ہاشمی، الیس این کول، مہندر رینہ، حمید فطرت، ڈاکٹر ندر الاسلام، پریم ناتھ در، مرزا عارف، ماسٹر

زندہ کول ثابت خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا تعلق ان ادبی نشستوں سے تھا۔ اس انجمن کے بانی اور روحِ رواں پریم ناتھ پردیسی تھے۔ اسی دور میں انہوں نے کتنے 'کاغذ کی جھنڈیاں' جواری اور ان کوٹ جیسی کہانیاں لکھیں جن میں مہاراجہ کے استحصالی نظام کی دھجیاں اڑا دی گئی ہیں۔

۱۹۴۵-۱۹۴۶ء کے آس پاس بلراج ساہنی کی تجویز پر کشمیر پیوپلز تھیٹر کا قیام عمل میں آیا۔ اس دوران شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں ساری ریاست متحرک ہو چکی تھی اور مہاراجہ کے جاگیردارانہ نظام کے خلاف بغاوت کی آگ دہک اٹھی تھی۔ ہندوستان کی قومی تحریک نے ہماری تحریک حریت میں ایک نئی روح بیدار کی تھی، حتیٰ کہ خواتین بھی گھر کی چار دیواری سے باہر نکل آئی تھیں اور کشمیر کے طبقۂ نسواں کو منظم کرنے لگی تھیں۔ ان خواتین میں خاص طور پر بیگم اکبر جہاں (شیخ صاحب کی رفیقۂ حیات) اور زینب بیگم (صادق صاحب کی ہمشیرہ) قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں غذائی بحران بڑھ گیا تھا اور عوام کو دو وقت کی روٹی مہیا کرنے میں سرکار ناکام رہی تھی۔ اس کے خلاف زبردست احتجاج ہونے لگا۔ جگہ جگہ فوڈ کمیٹیاں بن گئی تھیں پردیسی نے اسی زمانے میں "ان کوٹ" کے عنوان سے ایک کہانی لکھی جو غذائی بحران کے اس دور کی عکاسی کرتی تھی۔ یہ کہانی پہلی بار لاہور کے مشہور ماہنامہ "ہمایوں" میں شائع ہوئی اور اس کی اشاعت نے پردیسی کو شہرت کی بلندیوں سے ہمکنار کیا۔ اسی طرح انہوں نے اپنا پہلا کشمیری ڈرامہ "بنہ ہر" کے عنوان سے لکھا جو دراصل "ان کوٹ" کا ڈرامائی روپ تھا جسے کشمیر پیوپلز تھیٹر کے زیرِ اہتمام اسٹیج کروانا مقصود تھا لیکن اس سلسلے میں جب معاملہ اس وقت کے گورنر مہاراج کرشن کول کے پاس پہنچا، تو ڈرامے کا مسودہ ضبط کیا گیا اور اس کو اسٹیج کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس طرح سے یہ ڈرامہ تلف ہو گیا۔ یہ کشمیر کے عوامی تھیٹر پر پہلی کاری ضرب تھی۔ یہ بات

قابل ذکر ہے کہ اس تھیٹر کے ساتھ وہی لوگ وابستہ تھے جن کو کشمیر کی عوامی زندگی اور عوامی مسائل سے دلچسپی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کا تعلق ترقی پسند تحریک سے کسی نہ کسی طرح شعوری یا غیر شعوری طور پر ضرور تھا۔ ان میں پران کشور، قیصر قلندر، شیام لعل ایما، صلاح الدین احمد، سوم ناتھ زتشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب کی پشت پر پریم ناتھ پردیسی کی دیو قامت شخصیت تھی۔

اس سے قبل کہ ہم پردیسی کی شخصیت کے چند اور پہلوؤں کا ذکر کریں چند ایک حقائق کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے پردیسی کو مقبول و معروف کہانی کار بنایا اور ان کے فن میں عصری شعور کی تب و تاب پیدا کی۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کے "ہمدرد" کے ساتھ ان کا تعلق اب بھی براہ راست موجود تھا۔ یہ تعلق پردیسی کے ذہنی تضاد کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ پردیسی ایک طرف خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کی ذہنی نشوونما میں پریم چند بابت "انگارے" اور پھر ترقی پسند تحریک کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ دوسری طرف وہ پریم ناتھ بزاز سے ذہنی قرابت رکھتے ہیں۔ بزاز صاحب لکھتے ہیں:۔

"حقیقت پسند ادب کے لئے پردیسی کی صلاحیتیں بڑی زبردست ثابت ہوئیں۔ انہوں نے ایک کہانی کے بعد دوسری کہانی تخلیق کی۔ ہر کہانی دوسری کہانی سے زیادہ مزاحیہ، زیادہ روشن اور زیادہ بامقصد تھی۔ لیکن یہ سب کہانیاں کشمیر کے غریبوں اور رفاقہ مستوں کی زندگی کی صحیح ترجمانی سے متعلق تھیں۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ "ہمدرد" کی پالیسیوں کو ایمانداری سے آگے بڑھایا اور ان کی تقلید کی۔"

— (پنڈت بزاز کے خط سے اقتباس)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمدرد کی پالیسی کیا تھی۔ ہمدرد ابتدا میں ایک قوم پرستانہ اخبار تھا اور پریم ناتھ بزاز کی قوم پرست پالیسی کا ترجمان۔ خود بزاز صاحب ہندو فرقہ

پرستی کے محدود دھارے سے باہر نکل آئے تھے اور کشمیری پنڈت سماج سے کٹ گئے تھے۔ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ کے ساتھ مل کر ایک قومی سیاست کا خواب دیکھا تھا۔ بزاز صاحب کا پرچہ کشمیر میں ایک طرح سے وہی کارنامہ انجام دے رہا تھا جو کسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور "البلاغ" ہندوستان میں دے رہا تھا۔ بزاز شیخ محمد عبداللہ کی مقناطیسی شخصیت کے اس قدر مداح تھے کہ انہوں نے اس زمانہ میں ان کی شخصیت پر ایک پوری کتاب "کشمیر کا گاندھی" (۱۹۳۵ء) لکھی تھی۔ تحریک حریت کے دوران ایک عرصے تک "ہمدرد" شیخ محمد عبداللہ اور ان کی قومی سیاست کی حمایت کرتا تھا لیکن بعد میں ان کی ذہنی وفاداریاں بدل گئیں۔ انہوں نے شیخ محمد عبداللہ سے شدید اختلاف کیا اور نیشنل کانفرنس کی اس تحریک کی مخالفت کی جس کے وہ خود بھی رہنما رہ چکے تھے۔ یہاں بزاز صاحب کے نظریاتی اختلاف کے علل و اسباب سے بحث نہیں، صرف پردیسی کے ذہنی تضاد کو پیش کرنا مقصود ہے۔ پردیسی جن کی ذہنی فضا بدل چکی تھی اور جو بقول خود اپنے پرانے انداز فکر و نظر سے متنفر تھے، ایسی کہانیاں لکھنا چاہتے تھے جن کا تعلق براہ راست عوامی زندگی کے ساتھ ہو اور انہوں نے ایسا کیا بھی۔ خود لکھتے ہیں :-

"سرکاری ملازم ہوتے ہوئے میں نیشنل کانفرنس میں شامل تو نہیں ہو سکتا تھا مگر درون پردہ میں عوام کو اپنی کہانیوں سے غلامی، افلاس اور استحصال کا احساس دلا سکتا تھا۔ ہر چند کہ ملازمت کے قوانین کی رو سے یہ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میں نے شروع ہی سے یہ RISK لے لیا اور ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہا جس کا تعلق براہ راست میرے بھائی بندوں سے تھا کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ ہمارے دن بھی آنے والے ہیں اور غلامی کی یہ زنجیریں کٹنے والی ہیں۔"

پریم ناتھ بزاز کا خیال ہے کہ بچپن میں پردیسی نے جو افلاس اور ناداری دیکھی تھی اُس کے باعث وہ بزدل بن چکے تھے۔ عام لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی جس سے وہ پریشان تھے اور ان کے اندر کا باشعور اور حساس فن کار چاہتا تھا کہ وہ ان بدنصیبوں کی صحیح زندگی پیش کرے اور وہ کشمیر کی حسین سرزمین میں چھُپے ہوئے جہنم زار کی طرف دنیا کی توجہ مرکوز کریں لیکن ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ وہ معتوبِ عتاب ہوں گے۔ اس لئے اپنی ایسی تحریریں جو حکومت کی پالیسیوں کی نکتہ چینی کرتی تھیں، فرضی نام سے لکھتے ہیں۔ غالباً اسی زمانہ میں انہوں نے بالک رام باری کا نام اختیار کیا تھا۔ پردیسی نے خود اس کا ذکر کہیں پر بھی نہیں کیا ہے لیکن بزاز صاحب کا یہ بیان ملاحظہ کیجئے:۔

"پردیسی اس بات کے لئے متفکر تھے کہ ان کی ایسی تحریریں جو سیاسی نوعیت کی تھیں، سیاسی لیڈروں اور ارباب اختیار پر کھُل نہ جائیں۔ انہیں مجھ پر مکمل اعتماد تھا اور میں نے بھی کبھی ان تحریروں، ڈراموں اور کہانیوں کے مُصنف کی شخصیت کسی پر ظاہر ہونے نہیں دی۔ حالانکہ ان کی اشاعت سے ارباب اختیار اور بڑے بڑے لیڈروں کی ناراضگی مجھے مول لینا پڑی"۔

(پنڈت بزاز کا ایک خط راقم السطور کے نام) ۵

لیکن بات پردیسی کے اس ذہنی تضاد کی ہو رہی تھی جو وقتی طور پر ان کے یہاں پیدا ہوا تھا۔ اس حقیقت کے باوصف کہ وہ ترقی پسند تھے وہ بزاز صاحب کے رائے ازم کے فلسفے سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ لیکن ایک خاص حد تک۔ یہ اثرات غیر شعوری طور پر ان کے یہاں موجود تھے ___ وقتی طور پر ہی سہی ___ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ "ہمدرد" میں مسلسل اور مستقل طور پر قلمی تعاون دے

کہ وہ اپنے آپ کو ہمدرد کے ساتھ شعوری طور پر وابستہ کر چکے تھے اور بعض اوقات قومی لیڈر شپ کو بھی نہیں بخشتے تھے۔ وہ ہمدرد کے مزاحیہ کالم "برق زار" میں بزاز کے زاویۂ نظر کی تبلیغ کرتے رہے اور نیشنل کانفرنس اور بزاز صاحب کے درمیان جو نظریاتی اختلاف پیدا ہوا تھا اس میں وہ بزاز کے موقف کی حمایت کرتے رہے۔ وہ ہمدرد ہی کے کالموں میں کافی دنوں تک مسلسل طور پر "سیاسی قاعدہ" لکھتے رہے جو بزاز صاحب کے موقف کا ترجمان تھا۔ یہ پردیسی کی بزدلی تھی، ان کی مروّت تھی، ان کی دوست کے تئیں وفاداری تھی یا ان کے سماجی شعور کا عدم استحکام تھا۔ میں اس وقتی تضاد سے بحث نہیں کروں گا!

لیکن یہ معاملہ زیادہ دنوں نہ رہا۔ اس بزدلی اور شرافتِ نفسی کے باعث جب اختلاف کا موقعہ آیا تو انہوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ اختلافِ رائے کیا۔ پریم ناتھ بزاز کے ساتھ نظریاتی اختلاف کے باعث ہی وہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور ان کو احتجاجی خطوط لکھے۔ دونوں دوستوں کے درمیان اختلافات کی دیوار کبھی پاٹی نہ جا سکی۔ بزاز پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی تائید کرتے رہے اور پردیسی نے اپنی تمام قوت اور طاقت سے اس کی مخالفت کی۔ بزاز صاحب اس ڈراپ سین کا ذکر یوں کرتے ہیں:-

"ہم دونوں برصغیر کے بٹوارے کے خلاف تھے اور اپنی تحریروں سے ملک کے اتحاد کے لئے جدوجہد کرتے رہے لیکن میرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ملک کی تقسیم کا نظریہ مذہبی بنیادوں پر قبول کرنے کے بعد کانگریس کے رہنماؤں کو عوام کی مرضی کے خلاف کشمیر پر قابض ہونے کا کوئی حق نہیں۔ تمام ہندوؤں کی طرح اس کے برخلاف پردیسی مجھ سے شدید اختلاف کرتے رہے اور نہرو اور عبداللہ کے موقف کو اپناتے رہے کہ

عوام کی آزادانہ رائے جانے بغیر کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ رکھا جائے

آزادی سے چند ماہ قبل انہیں محکمہ کسٹم میں سب انسپکٹری کے عہدے پر ترقی دی گئی تھی اور دومیل میں تعینات کیا گیا تھا۔ وہ مجھ سے مل نہ سکے لیکن اپنے مشترکہ دوستوں کی معرفت میرے اس طرح کے خیالات پر زبردست احتجاجی خطوط بھیجتے رہے"۔

•—(پنڈت پریم ناتھ بزاز کے راقم السطور کے نام ایک خط سے)

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں انگریزی سامراج کی شہ پر پاکستان نے قبائلی دراندازبھیج کر ہمارے وطن کے ننگ و ناموس کو اپنی ہوسنا کی کا نشانہ بنایا۔ یہ وہ دن تھے جب شاہی نظام آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی افواج پسپا ہوگئیں۔ تب شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں پہلی عوامی حکومت ریاست جموں وکشمیر میں قائم ہوئی۔ ہندوستان کے ساتھ الحاق ہوا اور ہندوستانی افواج کی مدد سے قبائلی درا ندازوں کو بھگا دیا گیا۔ یہ تاریخ کشمیر کا انتہائی نازک موڑ تھا۔ ہر چہار اطراف ایک عجیب دہشت، خوف اور سنسنی کا عالم تھا۔ اس لئے نہ صرف خارجی دفاع کی ضرورت تھی بلکہ اندرونی امن و سکون بھی اسی قدر لازمی تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر "نیشنل ملیشیا" کے نام سے ایک چھوٹی سی فوج وجود میں آئی۔ نیشنل ملیشیا کے ایک جزو کے طور پر دانش وروں، ادیبوں، شاعروں اور باشعور نوجوانوں کی ایک جماعت منظم ہوئی جس کا نام کلچرل فرنٹ رکھا گیا۔ پردیسی نے اس محاذ کے لئے اپنی خدمات سب سے پہلے پیش کیں اور اس طرح بیسیوں ادیبوں اور دانشوروں کے ساتھ بندوق کاندھے پر اٹھائے وہ رات رات بھر شہر کی سڑکوں پر پہرہ دیتے رہے۔ اس دور میں انہوں نے "قدم قدم بڑھیں گے ہم، محاذ پر لڑیں گے ہم" جیسا قومی ترانہ لکھا اور کئی کہانیاں اور ڈرامے تخلیق کئے

جن کا موضوع وطن عزیز کے ننگ و ناموس کے لئے عوام کے لہو کو گرمانا تھا خواجہ غلام محمد صادق اسی دور کا ذکر کرتے ہوئے پردیسی کے افسانوی مجموعے "بہتے چراغ" کے تعارف میں رقم طراز ہیں :-

" وہ جہاں اپنے گیتوں سے قومی فوج کے جوانوں کے لہو کو گرماتے رہے وہاں عوام کے حوصلوں کو بلند رکھنے اور ان کے اتحاد کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کے لئے گیت، کہانیاں اور ڈرامے تخلیق کرتے رہے ان کے دو ڈرامے "مجاہد شیروانی" اور "سوالی" اسی زمانے کی تخلیق ہیں جو نیشنل فرنٹ کے اسٹیج پر بہت ہی مقبول ہوئے "قدم قدم بڑھیں گے ہم + محاذ پر لڑیں گے ہم" پردیسی کا یہ ترانہ جو اس زمانے میں ہر بچے، لڑکے اور جوان مرد اور عورت کی زبان پر تھا آج بھی ہمارے ذہن نشین ہے۔ پردیسی نے اسی زمانے میں نہ صرف قلم ہی سنبھالا بلکہ بندوق بھی سنبھالی اور قومی جوانوں کے ساتھ باقاعدہ پریڈ بھی کی "۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کا وہ دن اور وہ سیاہ ڈراؤنی رات جب قبائلی دراندازر راکھشس بن کر کشمیر پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس دن دسہرے کا تہوار منایا جا رہا تھا اور چاند ماری کے وسیع میدان میں راکھشسوں کے پتلے جلائے جانے والے تھے۔ لیکن آج تو درانداز راکھشسوں کے بھیس میں کشمیر رکھیا پار کرنا چاہ رہے تھے۔ پریم ناتھ پردیسی کے شعلہ بار قلم نے اس کی تصویر یوں کھینچی تھی :-

" لنکا کا راون ایک راکھشس تھا جس کے سر میں ایک راکھشس کا دماغ تھا۔ اگر اس نے اجودھیا کے امن کو درہم برہم کرنا چاہا تھا

لیکن وہ اس سے زیادہ مواخذہ کا سزاوار تھا۔ مگر پنجاب اور سرحد
کے یہ راون جو علم اور روشنی کے اس زمانے میں رہتے ہوئے الن
نہ بن سکے، صرف جلائے جانے کے حق دار نہ تھے۔ بلکہ صفحۂ ہستی سے
مٹائے جانے کے مستحق تھے تاکہ انسانیت بے داغ ہو اور کشمیر
کا تیر جس کے کندھے پر زمانے نے رام کا دھنش رکھا تھا اپنی ہستی
فوجوں کو جمع کر رہا تھا۔ اس کے "وشسٹ" نے آج سے کئی
سال پہلے اسے دہلی اور الہ آباد سے فلسفۂ حیات کا درس دیا تھا۔
اسی فلسفے کی روشنی میں وہ تیر کمان سنبھالے راون سے مقابلہ
کرنے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔"

• "تعمیر"۔ سرینگر (دورِ اوّل) ۱۹۴۷ - ۱۹۴۸ء - ص ۱۲-۱۳)

یہ تھا پریم ناتھ پردیسی کا باطن ۔ اس کے انتر آتما کی آواز اور یہی وہ سرحد
ہے جہاں پریم ناتھ بزاز اور پریم ناتھ پردیسی کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔
پردیسی اپنے دورِ شباب میں کافی وجیہہ تھے۔ لباس اور وضع قطع کے
اعتبار سے سادگی پسند تھے۔ روشِ زمانہ کے مطابق عرصۂ دراز تک سر پر پگڑی
باندھتے تھے۔ بعد میں ٹوپی کا استعمال کرنے لگے تھے۔ عادات صاف ستھرے
تھے۔ بذلہ سنج تھے۔ مزاج میں حاضر جوابی تھی۔ فقرے کسنے میں جواب
نہیں تھا۔ لیکن دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ ان کے ایک ہم عصر ادیب فدا صبوحی
نے ایک زمانہ میں ان کا قلمی چہرہ لکھا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"آپ کا چہرہ بڑا گورا مورا اور پیارا پیارا ہے کسی نوخیز حسینہ
کے اٹھتے ہوئے شباب کی طرح ابھرے اور سرخ و سپید گال،
پتلے پتلے ہونٹ گویا چغتائی آرٹ کا کامیاب تتبع۔ اختر شیرانی

کے کسی نوجوان مگر آوارہ گرد شاعر کی طرح چھوٹی چھوٹی اور گہری

چمکدار آنکھیں اور ان بھنویں پر ایک نازک سی عینک ....

سر پر پگڑی باندھتے ہیں ۔ لباس سادہ مگر بے تکلف اور انداز گفتگو

انتہائی دلکش کہ ہر بات کی بلائیں لینے کو جی چاہے ...... ترقی پسند

ادب کے شیدائی اور اعتقاداً "کمیونسٹ" مگر اپنے آپ کو کامریڈ

کہنے میں ذرا ہچکچاتے ہیں ...."

● ۔ ("چاند" جموں ۳۱ دسمبر ۱۹۴۶ء)

گو پردیسی اصطلاحی معنوں میں کمیونسٹ نہیں تھے پر ترقی پسند ضرور تھے ۔ مارکسزم کا مطالعہ کیا تھا ۔ ترقی پسند تحریک سے انسپائر ہوتے تھے ۔ گورکی، چیخوف اور موپاساں کے عاشق تھے ۔ اردو کے لکھنے والوں میں علاوہ ترقی پسند مصنفین کے پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، علی عباس حسینی اور احمد ندیم قاسمی انہیں پسند تھے ۔

پردیسی سگریٹ کے شوقین تھے ۔ ہمیشہ چھوٹی اور درمیانی انگلی کے درمیان نمبر تین کا سگریٹ داب کر پیتے تھے ۔ انتہائی سلیم الطبع، شریف، بے ضرر امن پسند اور انسان دوست تھے ۔ جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے سے بھاگتے تھے ۔ یہ شرافت نفسی ان کی ذاتی زندگی ہی میں نہیں ان کی تحریروں میں بھی جھلکتی تھی ۔ پروفیسر لیشپ کے لفظوں میں "He had no sectional mind." کشمیری پنڈت ہونے کے ناطے کشمیری پنڈتوں کی خوش حالی کے متمنی تھے ۔ لیکن ان کی سماجی برائیوں اور دوسری کمزوریوں کے باعث ان کے سب سے بڑے ناقد اور نکتہ چین تھے اور ان کی برائیوں کو بے نقاب کرنے سے کبھی کتراتے نہیں تھے ۔

پردیسی لکھتے وقت پارکر پین کا استعمال کرتے تھے۔ ہمیشہ بلیو بلیک روشنائی سے لکھتے تھے۔ تخلیقی کارنامے دفتری اوقات کے بعد انجام دیتے تھے۔ لکھنے کے لئے کسی وقت کے پابند نہ تھے۔ کبھی ہفتوں نہیں لکھتے تھے۔ کبھی لکھنے کا موڈ بنتا تو روز ہی لکھتے تھے۔ تمام طور سے ایک ہی نشست میں پوری کہانی یا مضمون لکھتے تھے۔

ذکر ہو چکا ہے کہ پردیسی نے بڑے پُر آشوب دن دیکھے تھے اس لئے انہیں ہمیشہ عدمِ تحفظ (INSECURITY) کا شدید احساس ڈستا رہا۔ اس صورتِ حال نے انہیں بزدل بنایا تھا، جس کا ذکر پنڈت پریم ناتھ بزاز نے بھی کیا ہے۔ وہ حد سے زیادہ احتیاط برتتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ سیاست کے میدان میں دخل دینے سے ان کی ملازمت چلی جائیگی اور ان کے بال بچوں کو روٹی کے لالے پڑیں گے۔ اس لئے وہ ہمیشہ خواہش کے باوجود عملی سیاست سے کنارہ کش رہے۔ وہ جیل خانے کے تصور سے ہی کانپ اٹھتے تھے۔ لیکن اس کے باوصف اپنے ہم وطنوں کی خوش حالی کے متمنی تھے۔ وہ صدیوں کی اس غلام قوم کو سربلند، آزاد اور فارغ البال دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے شخصی حکمرانی کے اس تاریک دور میں انہوں نے اپنے قلم کو رازدار بنایا اور فرضی ناموں سے اپنی نفرت، اپنے غم، اپنے غصے کا لاوا بہلتے رہے۔ یہ ان کا ذہنی اور جذباتی جہاد تھا۔ وہ ہمیشہ تقریر کرنے یا مجلسوں میں بولنے سے بھی احتراز کرتے تھے۔ اسی کامپلیکس کے باعث وہ بحث و مباحثے سے بھی کتراتے تھے۔ لیکن لکھنے کے میدان میں شہ سوار تھے۔ اختلاف پر آتے تو ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ ہمدرد میں کافی دنوں تک "اپنی اپنی مذاق اپنا اپنا" کے عنوان سے ایک مستقل کالم شائع ہوتا تھا۔ پردیسی

یہ کالم مستقل لکھتے تھے اور اکثر دوسرے لوگوں کی آراء سے اختلاف کرتے ۔

پردیسی کے موضوعات کشمیری تھے ۔ وہ کشمیری میں سوچتے تھے ۔ جوں جوں ان کا شعور بالیدہ ہوا، انہوں نے رومانوں سے اُتر کر کشمیر اور کشمیریوں کے مسائل کو بطور خاص اپنا موضوع بنایا ۔ کرشن چندر کے وہ مدّاح تھے لیکن کرشن چندر اور عزیز احمد نے جس طرح کشمیر کی زندگی کی غلط ترجمانی کی اور فرضی رومان تراش کر یہاں کی معصومیت کا مذاق اڑایا، پردیسی اس سے متنفر تھے ۔ پردیسی کو ملال تھا کہ ان لوگوں نے اس قوم کے ساتھ درد کا رشتہ پیدا نہیں کیا اور اس کا غم ٹٹول کر نہیں دیکھا جس نے اس کے انگ انگ کا رس چوس لیا تھا ۔ پریم چند نے جس طرح شمالی ہندوستان کے دیہاتوں میں رہنے والے کسانوں اور مزدوروں کو زبان دی تھی پردیسی نے کشمیر کے عوام کے لیے یہی کچھ کرنے کی سعی کی ۔ پردیسی نے خود کہا تھا :-

"میں نے کبھی محض لکھنے کے لئے کہانی نہیں لکھی اور ہر بار محسوس کرنے کے بعد لکھی ۔ میں نے خدا کے فضل سے بہت لکھا اور لکھتا ہوں ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کشمیر کا ہر باشندہ بذاتِ خود ایک افسانہ ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی .....
یہاں کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے، شخصی حکومت ہے ......"

● ــــ (میں اور میرے افسانے)

یہ مضمون پریم ناتھ پردیسی کے ادبی کارناموں پر محیط نہیں ہے اور نہ ہی یہاں ان کے ادبی کارناموں پر اظہارِ خیال کرنے کا محل ہے ۔ البتہ یہ عرض کروں گا کہ پردیسی نے اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ لکھا ۔ وہ کافی زود نویس تھے ۔

شروع میں جب شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے تو غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی۔ پھر ادبِ لطیف، انشائیے اور نثری نظمیں لکھیں۔[1] اس کے بعد افسانے کی طرف آئے۔ زندگی کے آخری دور میں ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک ناول لکھا[2] عرصۂ دراز تک بچوں کی کہانیاں لکھتے رہے۔ ایک آدھ بار تنقید پر بھی قلم آزمایا لیکن اس میں بات نہ بن سکی۔ 'پانچ دن' کے عنوان سے ایک رپورتاژ لکھا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں۔ "چار بیٹے"۔ "جانباز بچے"۔ "چورنگی"۔ "کرنیں" لکھیں، جو شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی حیات میں ان کے افسانوں کے دو مجموعے "شام و سحر" (سنہ ۱۹۴۱ء) اور "دنیا ہماری" شائع ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے افسانوں کا ایک انتخاب "بہتے چراغ" مکتبہ لالہ رخ سرینگر نے شائع کیا۔ ان کے دو مسودے "کیچڑ کا دیوتا" اور "ڈھول" (افسانوی مجموعے) اشاعت کی راہ دیکھ رہے تھے جس کے لئے وہ خط و کتابت کر رہے تھے (مخطوطے میری نظر سے گزر چکے ہیں)۔ ان کے افسانے ریاست اور ریاست سے باہر ہندوستان اور پاکستان کے معروف اور معیاری رسائل میں آخیر تک شائع ہوتے رہے جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اگر ان کا تخلیق کیا ہوا پورا ادب شائع ہوتا تو ان کی تخلیقی شخصیت اپنی ہمہ پہلو جہتوں کے ساتھ سامنے آجاتی۔ مستقبل کا کوئی محقق شاید ایسا کرے۔

پردیسی بنیادی طور پر کہانی کار ہیں اور اس شعبے سے ان کو فطری مناسبت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم السطور کے مضامین "پردیسی کی شاعری"۔ "پردیسی — شخص اور فن کار" (مطبوعہ ذوق نظر از برج پریمی)

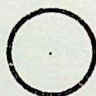
[2] پردیسی کے بڑے صاحبزادے سورگ باشی سوم ناتھ سادھو نے مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ پردیسی کا ایک ناول "پوتی" لاہور کے ایک پبلشر ناجو نے قومی کتب خانہ سے شائع کیا تھا جو تقسیم کے دوران تلف ہوا۔ (ب۔ پ)

ہے ۔ وہ کہانی کے کرافٹ (CRAFT) سے پوری واقفیت رکھتے ہیں اور کہانی کہنا جانتے ہیں۔ ان کی کہانیاں اپنی مختلف منزلوں سے گذرتی ہوئی بڑے منطقی انداز میں انجام تک پہنچتی ہیں۔ اور ہر حال میں تاثر کی وحدت کو قائم رکھتی ہیں ۔ وہ اپنے کرداروں، ان کے ذہنی رویوں اور ان کی سائیکی کو نفسیاتی دروں بینی سے پرکھ کر پیش کرتے ہیں ۔ وہ اپنے الفاظ کا اسراف نہیں کرتے بلکہ بہت ہی اختصار کے ساتھ پلاٹ، مقصد اور دلچسپی کے عناصر کو سمیٹ کر ایک نقطے پر لے آتے ہیں ۔ راجندر سنگھ بیدی نے ان کے دوسرے مجموعے "دنیا ہماری" کے پیش لفظ میں صحیح تجزیہ کیا ہے:-

> "اس مجموعے کی کہانیاں سادہ ہیں اور اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ہمیں ٹالسٹائی کی یاد دلاتی ہیں۔ ان میں نہ صرف عنصری عواطف اور نفس انسانی کی بنیادی کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے بلکہ تفسیر کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہے"۔

پردیسی نے ہیئت اور تکنیک کے بہت سے تجربے کئے۔ ایسی کہانیاں لکھیں جن میں نظم اور نثر دونوں کا التزام ہے۔ منی کہانیاں اور ایسی کہانیاں بھی لکھیں جن میں دوسرے فن کاروں کا اشتراک شامل ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی کی مثال "مارتنڈ" سری نگر کے افسانہ نمبر (اپریل ۱۹۳۶ء) میں ملتی ہے۔ یہ کہانی "پربھات" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ شروع کا حصہ ملاپ کے ایڈیٹر نامدار اور مشہور کہانی کار رنبیر سنگھ ویر نے لکھا تھا جبکہ آخری حصہ پردیسی نے لکھا تھا۔ کہانی پڑھ کر کہیں کسی پیوندکاری کا احساس نہیں ہوتا اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ دو کہانی کاروں کی کاوش ہے۔ تکنیک اور اسلوب حیرت انگیز حد تک مماثلت رکھتا ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کو کشمیر، اس کی زندگی، اس کے کلچر، اس کی روایات، اس کے تقدس اور اس کی خوشبو سے پیار تھا۔ صدیوں کی غلامی نے اس سرزمین کے روم روم اور انگ انگ میں غم اور ملال کا زہر گھول دیا تھا۔ عملی سیاست سے دور رہ کر انہوں نے اپنے قلم کی نوک سے اس زہر پر تریاق رکھ دیا اور ایک سچے فن کار کی طرح اپنے عصر کی رُوح کا درد فن کے میڈیم سے پیش کیا ــــ اور یہی ایک بڑے فن کار کا منصب ہے۔



بلدیو پرشاد شرما

دیوان نرسنگداس نرگس

جموں کے مشہور صحافی اور روزنامہ "ہند سماچار" کے ایڈیٹر آنجہانی پنڈت دیا کرشن گردش نے ۱۹۴۲ء میں نرسنگداس نرگس کا قلمی چہرہ پیش کیا تھا جس میں نرگس صاحب کے خدوخال ان الفاظ میں پیش کرتے تھے:۔

"عروس صحافت کے جذبۂ خود سپردگی کی چہچہاتی طلب، قد میانہ اور سڈول، تمکنت آمیز نقوش، نیم گندمی رنگ، بیضوی چہرہ، روشن اور چوڑی پیشانی، نگاہ میں عقاب کی تیزی، حکمرانوں کے غرور سے اُبھری ٹھوڑی، داڑھی مونچھ پر کرزن کا سایہ، آواز کرخت نہ شیریں، لباس کے معاملہ میں اکھنڈ بھارت، نیپالی نمونہ کی ٹوپی، لکھنوی اچکن، پنجابی کرتہ، مدراسی دھوتی، گجراتی جاکٹ اور ان تمام میں اُلجھے ڈوگرہ انداز"۔

نرسنگداس نرگس کا جنم موضع گوندل (تحصیل سیالکوٹ حال پاکستان) میں ۱۶، ستمبر ۱۹۰۲ء کو ہوا۔ ان کے والد بزرگوار دیوان بیلی رام ریاست میں ہی ملازم تھے۔ اور ریٹائر ہونے کے بعد جموں شہر میں ہی آباد ہوئے۔ نرگس نے مڈل کا امتحان رنبیر ہائی سکول

جموں سے اور میٹرک کا اکبر اسلامیہ ہائی سکول جموں سے پاس کیا۔ ۱۹۱۵ء میں جب آپ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے تو اردو زبان میں شاعری کی شروعات کیں۔ میٹرک کے بعد پنجابی زبان میں شاعری کا آغاز کیا۔

۱۹۲۳ء میں نرسنگداس نرگس رام کوٹ کے راجہ کے دفتر میں کلرک کے عہدہ پر بھرتی ہوئے اور اپنی محنت اور ایمانداری سے راجہ صاحب کو ایسا متاثر کیا کہ تین سال کے بعد انہیں جاگیر رام کوٹ کا مختار عام بنا دیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ سولہ (16) برس مامور رہے۔

رام کوٹ جموں ڈویژن کی تحصیل سانبہ میں ایک چھوٹی سی جاگیر تھی۔ نرگس صاحب نے عمر کے بہترین سال رام کوٹ میں ہی بتائے جہاں انہیں عوام سے ملنے' ان کے رہن سہن، رسم و رواج' ان پر کئے جانے والے مظالم وغیرہ کا بغور مشاہدہ کرنے کا موقعہ ملا اور ان سب کا اس غیور نوجوان کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ جاگیردار کے ساتھ کسی معاملہ پر اختلاف رائے ہو جانے کی وجہ سے ملازمت سے مستعفی ہو کر جموں چلے آئے۔

نرگس صاحب کے برادر اصغر دیوان گیان چند اس زمانہ میں اخبار رنبیر جموں کے منیجر تھے جس کی تحریک پر آپ نے پورانی منڈی جموں میں "دیوان پریس" کے نام سے اعلیٰ پیمانہ پر ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اس پریس کی افتتاحی رسم ۱۲ جون ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوئی۔ دیوان گیان چند کے ساتھ راقم کے دوستانہ تعلقات تھے۔ انہی کے ذریعہ میری ملاقات نرگس صاحب سے ہوئی۔ نرگس صاحب نے میرے تجربہ اخبار نویسی کا فائدہ اٹھانا چاہا اور جموں سے ایک باتصویر ہفتہ وار اردو اخبار شائع کرنے کی تجویز پیش کی جسے میں نے قبول کر لیا۔ نرگس صاحب کے اپنے الفاظ میں اخبار چاند کا اجرا اس طرح ہوا:

پریس نو جاری کر دیا اور خود ایک ایجنسی کے طور پر پریس میں بیٹھ گیا۔ سخت پریشانی کا عالم اور مایوسی اس شدت کی تھی کہ چھاپہ خانہ کی ہر چیز کھانے کو دوڑتی تھی ...... میری اس جان سوز پریشانی اور ذہنی کوفت میں مجھ پر اخبار چاند کی ادارت ٹھونسی گئی جس کے لئے میں مطلق تیار نہ تھا۔ بچپن سے مجھے شعر و شاعری میں ضرور رغبت تھی۔ افسانے بھی لکھتا تھا اور لاہور کے سربر آوردہ ادبی رسائل میں بھیجتا تھا۔ جب شائع ہوتے تو خوش ہوتا۔ لیکن اخبار نویسی اور افسانہ نگاری میں کافی فرق ہے۔ ایک اخبار نویس اچھا افسانہ نگار نہیں ہو سکتا۔ ایک افسانہ نگار کامیاب اخبار نویس نہیں کہلا سکتا۔ چنانچہ پنڈت بلدیو پرشاد شرما نمائندہ ایسوسی ایٹڈ پریس کی رفاقت سے اخبار چاند اپنی دل بستگی کا ذریعہ بنا کر جاری کر دیا۔"

ان خیالات کا اظہار مرحوم نرگس نے اپنی ضخیم "تاریخ ڈوگرہ دیش" کے اختتامیہ میں کیا ہے۔

۱۳ چیت سمت ۱۹۹۶ بکرمی (اپریل ۱۹۴۰ء) کو ہفتہ وار چاند کی رسم افتتاح کے موقعہ پر پنڈت دیا کرشن گردش ایڈیٹر ڈوگرہ گزٹ "شری وشوا ناتھ کیرنی ایڈیٹر "سدرشن"، لالہ رام سرنداس ملہوترہ ایڈیٹر "زندگی"، منشی معراج الدین احمد ایڈیٹر "پاسبان"، عبدالمجید قرشی ایڈیٹر "جمہور" اور لالہ شو رام گپتا ایڈیٹر "امر" موجود تھے۔

ہفتہ وار اخبار چاند دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس کی سیکولر پالیسی کی شیخ محمد عبداللہ پریذیڈنٹ آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس نے بھی سراہنا کی۔ نرگس صاحب نے "ممولا رام کوٹی" کے نام سے چاند میں مختصر افسانے لکھنا شروع کیے۔ اس کے بعد "پریم منوہر" کے مجازی جامہ میں ڈوگرہ کلچر، رسم و رواج اور جموں کی دیہی اور شہری زندگی پر طویل کہانیاں ہفتہ وار چاند میں لکھیں۔ یہ تمام افسانے اور کہانیاں بعد میں کتابی صورت میں شائع کی گئیں جن کے نام "کھیا دیس"، "پردیسی پریتم"

اور "سنزلیہ" ہیں۔ اس کے بعد آپ نے "جانکی"۔ "نرملا" اور "پاربتی" کے نام سے ناول شائع۔ ان افسانوں اور ناولوں میں نرگس نے جاگیردارانہ نظام میں فاقہ کش اور مفلوک الحال ستم رسیدہ عوام کی مجبوریوں اور مظلومیت کے وہ مناظر بیان کئے ہیں جو جاگیر رام کوٹ ریاست چمبہ یا تحصیلات کٹھوعہ، بسوہلی اور رام نگر میں ملازمت کے دوران ان کے مشاہدہ میں آئے تھے۔

نرگس۔ ایک تاریخ داں ۔ ایک تاریخ داں کی حیثیت میں بھی نرگس نے ایک بلند مقام پایا۔ نرگس اس طرف کیسے راغب ہوئے؟ اُن کے اپنے ہی الفاظ میں:۔

"جب رام کوٹ کے جاگیردار کے کام کے لئے دورہ کرنے جاتا تو راستے میں بے شمار آثار قدیمہ دیکھتا۔ پہاڑیوں پر غیر آباد قلعوں۔ قدم قدم پر دہریوں، باولیوں اور سُونے پڑے ہوئے مندروں اور کھنڈروں کی طرف نظر جاتی تو ٹھٹک کر رہ جاتا۔ کتنی کتنی دیر وہاں ٹھہر کر اس سوچ میں پڑا رہتا کہ ان سب میں اس دیس کا ماضی اور پراچین اتہاس پنہاں ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھتا لیکن جواب میں من گھڑت کہانیوں کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ اُن دنوں بھی میرے دل میں یہ خیال کبھی کبھار پیدا ہوتا تھا کہ اس سارے علاقہ کی تاریخ لکھنا چاہیئے جو کبھی اتنی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا جن کی پارینہ عظمت کے نشان میرے سامنے ہیں.....

اور یہی تھا وہ مقام جس نے میرے دل میں ایک خلش اور ایک انوکھی سی کریدہ پیدا کی کہ مجھے خود ماضی کے دھندلے پردوں کو ہٹا کر سرزمین جموں کی اس پارینہ عظمت کو بے نقاب کرنا چاہیئے جس سے چشم عالم تو کیا، خود میرے ہم وطن بھی آگاہ نہیں۔"

نرگس صاحب نے تاریخ نویسی کا کام ۱۹۵۶ء میں شروع کیا اور اپنی منزل پہ

پہونچنے کے لئے گیارہ سال کا طویل سفر کیا۔ "تاریخ ڈوگرہ دیس" کی ترتیب کا کام ۱۹۵۶ء میں ہی شروع کیا۔ انہوں نے اس کا ایک حصّہ "تاریخ گلاب سنگھ" سنہ ۱۹۵۹ء میں شائع کر دیا۔ اس کے پانچ سال بعد جولائی سنہ ۱۹۶۴ء میں انیسویں صدی کے عظیم جرنیل و فاتح لداخ "وزیر زورآور سنگھ" کی تاریخ شائع کی۔ اسی سال انہوں نے کوہستانِ جموں کے گوریلا جرنیل میاں ڈیڈو کی تاریخ بھی شائع کی۔ نرگس صاحب کا تاریخی شاہکار اُن کی ضخیم "تاریخ ڈوگرہ دیس" ہے۔ ۱۱۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب جنوری سنہ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں ڈوگرہ دیس کی ۲۲ ریاستوں کی تاریخ زمانۂ قدیم سے مہاراجہ ہری سنگھ کے دورِ حکومت تک درج ہے۔ تعارف نگار پنڈت دیاکرشن گردش نے لکھا ہے کہ:-

"ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) کی طرح نرگس نے بھی ماضی کے ایک ناپدید سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر وہ گہر پارے اہلِ علم کو پیش کئے ہیں جن سے موجودہ یُگ کا مؤرخ قطعی طور پر ناآشنا تھا..... اب ڈوگرہ جانبازوں کی سرزمین کو اگر بھارت کے اہلِ تاریخ حصص کی صفِ اوّل میں قدم رکھنا نصیب ہوا ہے تو نرسنگداس نرگس کی بدولت ڈوگرہ بھومی یقیناً نرگس کے اس احسان کو کبھی فراموش کر نہیں سکے گی..... نرگس کو اس کی اس تاریخی کاوش کیلئے صدیوں یاد کیا جائے گا۔"

اور اب روزنامہ چاند کی بات کرتے ہیں۔ اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں اخبار چاند ایک روزنامہ کی صورت میں شائع ہونے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریاست جموں و کشمیر ایک زبردست سیاسی الجھن میں پھنسی تھی۔ ملک کے دو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ ریاست کا الحاق دونوں میں سے ایک مملکت — ہند یا پاکستان سے ہو سکتا تھا مگر مہاراجہ

ہری سنگھ اس سلسلہ میں بروقت کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ نتیجے کے طور پر اکتوبر کے تیسرے ہفتہ میں ریاست پر زبردستی قبضہ جمانے کے لیے پاکستان کی طرف سے ایک منظم قبائلی حملہ ہوا۔ ریاست کی مؤثر اقتصادی ناکہ بندی کر دی گئی۔ آزاد کشمیر کے علاوہ صوبہ جموں کے مختلف حصوں سے ہزاروں کی تعداد میں شرنارتھی جموں شہر میں پناہ گزین ہوئے۔ یہی وہ سیاسی حالات تھے جنہوں نے نرگس کو ایک روزنامہ جاری کرنے کی تحریک دی۔

ریاست میں ایمرجنسی حکومت قائم ہو چکی تھی جس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ اور نائب سربراہ بخشی غلام محمد تھے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ایمرجنسی حکومت نے اخبار چاند کو غیر معین عرصہ کے لئے بند کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔ گو اس حکم میں اخبار پر بندش عائد کرنے کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی تھی مگر بعد ازاں معلوم ہوا کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۴۷ء کو چاند میں "گاندھی جی کا ارشاد" کے عنوان سے جو ایڈیٹوریل چھپا تھا اسے قابل اعتراض قرار دیا گیا تھا۔

۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو ایمرجنسی حکومت کی جگہ پہلی عوامی سرکار وجود میں آئی۔ اس کے پرائم منسٹر شیخ محمد عبداللہ مقرر ہوئے۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں شیخ محمد عبداللہ نے چاند پر عائد کردہ پابندی اٹھالی اور چاند ۲۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو دوبارہ مطلع اشاعت پر روزنامہ کی شکل میں آیا لیکن تین ماہ بعد اسے پھر ایک باتصویر ہفتہ وار اخبار بنا دیا گیا اور وہ آخری وقت تک اس کے ساتھ منسلک رہے۔

وہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں نرگس صاحب پنجابی کوی دربار کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے اور جنوری ۱۹۴۱ء میں بزم ادب جموں کے سینئر وائس پریذیڈنٹ۔ ماہ اگست ۱۹۴۱ء میں آپ جموں جرنلسٹس ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ منتخب ہوئے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز کی زیر صدارت اپریل ۱۹۴۳ء میں جب جموں میں آل جموں و کشمیر پریس کانفرنس منعقد ہوئی

تو نرگس صاحب نے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے خطبہ پڑھا۔

نرگس صاحب شعر و سخن کے رسیا تھے۔ پنجابی اور اردو کی ہر محفل میں شامل ہوا کرتے تھے۔ ایک انٹرویو میں اپنی شاعری کے متعلق انہوں نے کہا ہے

شعر کا جب ذہن کے ہاتھوں میں لیتا ہوں رباب
سامنے میرے چلی آتی ہے فطرت بے حجاب
ڈھونڈتا ہوں میں حسین نغموں کے زینوں پہ کبھی
تیرتا ہوں میں ستاروں کے سفینوں پہ کبھی

مولانا ملکوتی، پریم منوہر اور نرگس — یہ تین تخلص رکھنے والے دیوان نرسنگ داس اپنے نام کے ساتھ "رئیس التحریر چاند" کا لقب بھی لکھا کرتے تھے۔

چونتیس برس علمی اور ادبی خدمت سر انجام دینے کے بعد آپ ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۷۲ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ اس وقت انکی عمر ۷۱ برس تھی۔

نرگس صاحب نے "تاریخ ڈوگرہ دیس" میں چھپی اپنی تصویر کے نیچے شائع کرنے کے لئے ایک نہایت موزوں شعر کا انتخاب کیا ہے۔ ملاحظہ ہو

جس قدر تصویر کے کاغذ کو ممکن ہے بقاء
اُس قدر ممکن بقا کب صاحب تصویر کو



عبدالغنی شیخ

گیشے ایشے تنڈوپ

گیشے ایشے تنڈوپ جدید لداخ کے ایک سرگروہ مذہبی عالم تھے۔ بدھ دھرم، خاص طور پر تبتی بُدھ مت سے متعلق وہ گہری بصیرت اور بڑی علمیت رکھتے تھے۔ تبتی بُدھ مت (TIBETAN-BUDDHISM) کی اصطلاح مغربی اسکالروں اور مستشرقیات نے وضع کی ہے۔ مشہور ماہر تبتیات (TIBETOLOGIST) پروفیسر گیسیپ ٹوچی نے لکھا ہے۔ "تبتی بُدھ دھرم کا علمی سرمایہ اتنا بڑا ہے کہ ایک آدمی کو انہیں پڑھنے کے لئے اتنی لمبی عمر چاہیئے جو دو طبعی زندگیوں کا احاطہ کرے"۔ یہ کتابیں زیادہ تر سنسکرت سے ماخوذ یا ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ ان میں مذہب، فلسفہ، منطق، جیوتش اور طب کے علوم شامل ہیں جو بُدھ از منہ قدیم اور وسطیٰ کے ہندی بودھ عالموں اور تبتی درشیوں منیوں کی دین ہیں۔ ان میں بدھ سے براہِ راست منسوب مذہبی صحیفوں کی ۱۰۸ ضخیم جلدیں اور ان کی ۲۲۵ ضخیم تفاسیر بھی شامل ہیں جو ہر بڑے گنپہ میں موجود ہیں۔

گیشے ایشے تنڈوپ نے تبت میں مذہبیات میں ڈاکٹریٹ کیا تھا۔ گیشے ڈاکٹریٹ

کا تبتی متبادل لفظ ہے، اس لئے وہ گیشے کہلاتے ہیں ۔

گیشے ابشے تنڈوپ سے متعلق لداخی ادیب ٹشی ربگیش نے لکھا ہے، وہ بودھ دھرم کے کسی بھی مضمون یا موضوع پر آسان اور عام فہم زبان میں اظہار خیال کرنے صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کے اپدیش سننے کے لئے عام لوگوں کے علاوہ نئی نسل کے پڑھے لکھے جوان بھی آتے تھے۔ انہوں نے اجتماعات میں بدھی آچاریہ شانتی دیوا اور ناگ ارجن کے فلسفے کو سلیس اور بول چال کی زبان میں پیش کیا ہے۔ تانترک کے موضوع پر تعلیم و تدریس دینے سے انہوں نے ہمیشہ گریز کیا۔

ٹشی ربگیس نے گیشے ابشے تنڈوپ کو علم کا خزینہ قرار دیا ہے۔ بقول ان کے لداخی یا تبتی صرف و نحو اور کوی درشن میں ہم عصر عالموں میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

گیشے ابشے تنڈوپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے کئی تبتی داستانوں اور جھاتا کا کی حکایات کو لداخی میں ڈرامائی روپ دیا۔ ان کے لئے منظوم مکالمے لکھے۔ شروع میں سن ساٹھ کی دہائی میں لیہہ اور مختلف دیہات میں یہ ڈرامے اسٹیج کئے گئے۔ ان ڈراموں کے اخلاقی پہلو اور نفس مضمون کو سماج سدھار اور دھرم کے پرچار کے لئے بروئے کار لایا گیا۔ بدھ کی تعلیمات اور زندگی پر بھی انہوں نے ڈرامے لکھے۔ یہ ڈرامے لوگوں میں بڑے مقبول تھے۔ ڈراموں سے حاصل آمدن گنپوں اور یادگاروں کے تحفظ اور مرمت کے لئے خرچ کی گئی۔ ان کی پہل سے لمڈوں ڈرامیٹک کلب قائم ہوا۔ کلب کی کوششوں سے لمڈون پبلک سکول اور لمڈوں ویلفیر سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں نے تعلیم اور سماجی میدان میں نمایاں کام کیا ہے۔

گیشے ابشے تنڈوپ کی علمیت اور خدمات کے لئے ریاستی کلچرل اکیڈمی نے ان کو خلعت سے بھی نوازا۔ شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے ٹیگور ہال سری نگر میں ان کو یہ اعزاز بخشا۔

ان کے لداخی ڈرامہ "ستنار زری رژون" کے لئے انہیں کلچرل اکادمی کی طرف سے انعام ملا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی اور اچھے ڈرامے لکھے ہیں جن میں لہاسا موا یتوق اور ٹیمیت کونڈن شامل ہیں۔ ان ڈراموں کی کہانی سنسکرت سے ماخوذ ہے۔ اور ان کا تبتی میں ترجمہ ہوا ہے۔ انہوں نے لداخ کی ایک مختصر تاریخ بھی تصنیف کی ہے۔ ایشے تنڈوپ نے گیت اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہؒ کی تعریف میں بھی انہوں نے ایک نظم لکھی ہے۔

گیشے ایشے تنڈوپ ایک قابل مترجم تھے۔ جب دلائی لامہ نے لیہہ میں کلاسیکل تبتی میں بودھ فلسفہ 'کالاچکرا' پر ایک طویل اُپدیش دیا تو گیشے صاحب کو بطور مترجم منتخب کیا گیا۔ دلائی لامہ نے ان کو لوتزاوا یا "عالم چشم بینا" کے نام سے مخاطب کیا۔ گیشے ایشے تنڈوپ نے زندگی کا بڑا حصّہ ایک معلّم کی حیثیت سے گذارا۔ وہ لداخ کے زرد فرقہ کے مشہور گنپہ پیتک سے وابستہ تھے جہاں انہوں نے مختلف اہم عہدوں پر کام کیا۔ ۱۹۶۰ء میں وہ لداخ بُدھسٹ ایسوسی ایشن کے صدر منتخب کئے گئے۔ آخری عمر میں وہ بیلی کوٹی کرناٹک میں تبتی پناہ گزینوں کے گنپہ ٹشی لونپو کے خنپو یا ہیڈ لامہ بنائے گئے۔ ان کے شاگردوں میں ہمس اور رنبیرزونگ گنپوں کے کوشک ابڑے لاما بھی شامل تھے۔

تبت کے متعدد عالموں سے ان کی راہ و رسم تھی۔ موخر الذکر ان کے علم کے معترف تھے۔ ان کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ تبتی بدھ مت کے تمام فرقوں کے تئیں ان کے دل میں احترام تھا۔ اگرچہ وہ خود گیلُوکپا یا زرد فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ زرد فرقہ کو اصلاح شدہ فرقہ (REFORMED SECT) بھی کہا جاتا ہے۔ گیشے ایشے تنڈوپ ایک بڑے لاما اور لیوگین ڈوڈجام رینگمو چھے کے بڑے مدّاح تھے جو ایک قدیم فرقہ نینگماپا سے تعلق رکھتے تھے۔

گیشے ایشے تنڈوپ لیہہ سے ۱۴ کلومیٹر دور ستوق گاؤں میں ایک عام گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں انہوں نے گھر چھوڑ دیا اور پیتک گنپہ کے بودھ سنگھ میں شامل ہوئے۔ تقریباً دس سال کی عمر میں مذہبی تعلیم حاصل کرنے کیلئے وہ تبت چلے گئے جہاں انہوں نے پانچین لامہ کے مشہور گنپہ ٹشی لونپو میں داخلہ لیا۔ یہاں انہوں نے مختلف اشلوکوں اور دھاؤں کے علاوہ پانچ سنجیدہ مضامین کا مطالعہ کیا۔ یہ مضامین ونیا (بھکشو کے اخلاقی اصول)، پرجنا پرامتا (ماورائی دانائی)، پرمنا وردنیکا (منطق) مدھمیکا (درمیانہ راستہ) اور سروستاوڈین (بودھ فلسفہ) ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تبتی زبان کے صرف ونحو کا گہرا مطالعہ کیا۔

پندرہ سال تک ٹشی لونپو میں علوم حاصل کرنے کے بعد وہ ہندوستان لوٹے۔ چند ماہ کے لئے کالمپونگ کے ایک پریس میں کام کیا۔ وہاں سے وہ کلکتہ آئے اور مشہور علمی ادارہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں ملازم ہو گئے۔ سوسائٹی کے انگریز ڈائرکٹر نے ان کی علمیت اور گہرے مطالعے کی سراہنا کی ہے۔ چند ماہ سوسائٹی میں کام کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی وطن لداخ آئے جہاں مڈل سکول لیہہ میں وہ بودھی (لداخی) زبان کے استاد مقرر ہوئے۔ مڈل سکول میں بودھی میں ایک سینیر ٹیچر کی آسامی خالی پڑی تھی۔ گیشے صاحب کی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سکول کا بودھی استاد موروپ گیا لیکن گیشے ایشے تنڈوپ کے حق میں رضاکارانہ طور دستبردار ہو گیا۔ اس طرح لداخ کے بودھی پڑھنے والے طلباء کو ایک عالم استاد ملا۔ ان کی شاگردی میں بودھی میں کئی ہونہار طلباء اُبھرے۔

بودھی میں ان کی علمیت اور تجربات کے پیش نظر ان کی ملازمت کی مدت میں دو بار توسیع کی گئی اور وہ لگ بھگ ستر سال کی عمر تک اس عہدے پر فائز رہے۔

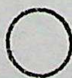
گیشے ایشے تنڈوپ نے لداخی میں پہلی سے دسویں جماعت تک کی درسی کتابوں

کی تصنیف و تالیف کی۔ اس کام میں ایک اور لداخی مدرس ڈُشی پنچگس نے انکی اعانت کی۔

گیشے ایشے تنڈوپ تبتی اور لداخی کے علاوہ ہندی اور اردو میں بھی شُد بد رکھتے تھے۔ گیشے صاحب بہ حیثیت انسان بڑے ہی بھلے مانس، ملنسار، روادار اور حلیم تھے۔ وہ بڑے کم گو تھے اور بلا ضرورت یا بلا فرمائش کسی موضوع پر لب کشائی نہیں کرتے تھے۔ وہ لداخ کی متنازعہ سیاسیات سے ہمیشہ ہی کنارہ کش رہے جو ان کے زمرے کے کئی مذہبی رہنماؤں کے لئے باعث کشش رہی ہے۔ ڈُشی پنچگس نے ان سے متعلق ایک مضمون میں لکھا ہے کہ انہوں نے سفر اور حضر دونوں میں کبھی اپنا راہبانہ لباس ترک نہیں کیا۔ اپنے لباس کو وہ ہمیشہ صاف ستھرا رکھتے تھے۔

وہ بڑے کفایت شعار تھے۔ ان کی کفایت شعاری کنجوسی کی حد تک مشہور تھی، لیکن یہ کنجوسی بھی انہوں نے دوسروں کے لئے اختیار کی، جو رقم وہ پس انداز کر سکے وہ انہوں نے گنپوں یا کسی فلاحی تنظیم کو نذر کی۔

گیشے ایشے تنڈوپ سنہ ۱۹۸۰ء میں ۸۳ سال کی عمر میں کشی نگر، کرناٹک میں بیلی کوٹی کے مقام پر چل بسے۔ ان کے ایک عزیز اور عقیدت مند لاما جگمت دورجے نے مجھے بتایا کہ وہ وفات سے پہلے اڑتالیس گھنٹے تک مراقبے میں رہے۔



سید رسول پونپر

پروفیسر سری کنٹھ توشخانی

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سورگباشی توشخانی صاحب پر کچھ لکھتے وقت مجھے مرزا غالب کے اس شعر کا سہارا اس لئے لینا پڑ رہا ہے کہ یہ ہمارے ناسازگار ماحول کا بھرپور ترجمان ہے جس کے زیر اثر توشخانی صاحب جیسے سینکڑوں انسانوں کی اپنی شخصیت کی تکمیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے رہ جاتا ہے اور ہم اُن کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ محرومی انفرادی نہیں اجتماعی نوعیت کی ہوتی ہے جس کے لئے ہمارا ناقدرشناسی کا حاوی سماجی رجحان ذمہ دار ہے۔
سری کنٹھ توشخانی سرینگر کے ایک متمول گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور ازل سے حساس طبیعت لے کے آئے تھے جسکی وجہ سے وہ ایک جگہ نہ ٹک سکے، اور ایک ہی پیشہ کے ہو کے نہ رہے۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی کر کے وکیل ہوئے تو زیادہ دیر جم نہ سکے، کیوں کہ کامیاب وکیل کے لئے پیشہ ورانہ چالاکی کے داؤ پیچ کے بغیر

کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا جا سکتا۔ ناول "کملا" لکھا تو ادھورا رہ گیا۔ خواتین کی حالت زار پر ایک فلم بعنوان "تہ طاقِ نسیاں" کی زینت بنی۔ کشمیری نثر کی طرف متوجہ ہوئے تو سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور ہم ان کے انمول موتیوں سے تہی دامن رہے۔ مختصر یہ کہ توشخانی صاحب کی شخصیت ایک بھرپور، مربوط اور منضبط شخصیت نہیں تھی بلکہ ان کی ذات بھی عصری انتشار کی شکار رہی جس کی وجہ سے اُن کی انسانی ہمدردی و مروّت کا جذبہ پورے انداز سے نکھر نہ سکا۔ بھلا ہو اُن کے حُبِ وطن اور کشمیری زبان سے والہانہ لگاؤ کا کہ وہ غیر ارادی طور رہی سہی بالواسطہ اور بلاواسطہ کشمیری زبان کے لسانی اور صوتیاتی پہلوؤں سے کما حقہ دلچسپی لیتے رہے۔ وہ کشمیری زبان کے موجودہ رسم الخط کے ہر ہر ارتقائی مرحلہ سے وابستہ رہے جس کی بنا پر ان کا رول اس سلسلہ میں ایک زبان دان کی حیثیت سے ناقابل فراموش قرار دیا جا سکتا ہے۔

جناب موتی لال ساقی توشخانی کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ دستاویزی شواہد کے مطابق توشخانی صاحب کا جنم ۱۸۹۷ء میں سری نگر کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ہوا۔ مگر اپنی اصلی اور صحیح تاریخ پیدائش یا عمر کے بارے میں تفاصیل دینے سے وہ ہمیشہ کتراتے رہے۔ توشخانی صاحب کو زمانے کے رواج کے مطابق اعلیٰ تعلیم سے سنوارا گیا۔ چنانچہ آپ نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے ایل ایل۔بی کیا۔ تکمیل تعلیم کس سن میں ہوئی اس کے بارے کچھ معلوم نہیں البتہ اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ آپ ۱۹۲۳ء میں اننت ناگ میں وکالت کرتے تھے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ۱۹۲۰-۲۱ء کے آس پاس تعلیم مکمل کی تھی۔ اسی زمانے میں آپ نے کشمیری نثر لکھنے کی ابتدا کی۔ انکی تخلیقی کاوشیں لاہور کے رسالے "بہارِ کشمیر" میں چھپتی تھیں۔ اسی رسالے میں کشمیری

دیوناگری میں چھپتا تھا۔ مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے کے علاوہ آپ کے ناول "کملا" کی ایک دو قسطیں بھی اسی رسالے میں چھپی ہیں۔ حفظانِ صحت کے بارے میں ان کے ایک کشمیری مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ یہ مضمون "ذوٗہ تہٕ ژم" کے نام سے چھپا ہے:

"مگر کلس تہٕ منتشس چھےٚ اکھ فرق ــــ ژیر گُل دیہ تٕہ ژیر پھلے تہٕ ژرن پھلے دیہ ژہٕ شنی۔ مُنش نے گُنہ خاص وگہ دٕٹھ پانس ممکن چھ پٕتہ پُنش گژھِ ژلیتھ۔ اَمہ کنہٕ چھُ ضروری پننہ باپتھ کانٛہہ خاص آدرش تھاوُن"۔

دیوناگری میں کشمیری کی تمام آوازیں ادا نہیں ہو سکتیں۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لئے توشخانی صاحب نے ۱۹۲۳ء میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس ضمن میں پہل کی۔ ماسٹر زندہ کول اور دوسرے لوگوں نے اس سلسلہ میں اپنے کام کی بنیاد توشخانی صاحب کے کام پر ہی رکھی۔

مندرجہ ذیل دیوناگری حروف ان مجوزہ تبدیلیوں کے ساتھ ملاحظہ ہوں:۔

ॹ ــ ٕ ، ॴ ــ اہ ۔ ॶ ــ ٕ

ۆ ــ ॵ اہ ــ ॶ ، ۓ ــ ॷ

پروفیسر توشخانی پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیف الدین تارہ بلی کے بعد کشمیری کے لئے رسم الخط وضع کرنے کی سنجیدہ کوشش کی۔ حالانکہ اس سے پہلے بھی ۱۹۰۵ء میں سرتیج بہادر سپرو کے "کشمیر درپن" میں اسے موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ جہاں تک پیش رفت کا سوال ہے وہ نگی کے برابر بھی توشخانی صاحب کو یار محمد خان پر اس لئے سبقت حاصل ہے کہ جہاں یار محمد خان نے

بائبل کا ترجمہ کرکے کشمیری نثر کی ابتدا کی وہاں توسخانی صاحب نے طبع زاد کشمیری نثر کی مستحسن بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد انہوں نے کشمیری کے لئے رومن رسم الخط کو بین الاقوامی صوتیات کے معیار کے مطابق مرتب کیا۔ اُن سے پہلے سانگرام کول نے یورپیوں کے لئے رومن میں کشمیری ریڈر تیار کئے تھے لیکن توسخانی صاحب نے جو ریڈر تیار کیا تھا وہ غیر ملکیوں کے لئے نہیں بلکہ کشمیریوں کے لئے تھا۔ یہ ریڈر کچھ عرصہ تک ویمنز ویلفیئر ٹرسٹ کے تحت چلنے والے سکولوں میں پڑھایا جاتا تھا جیسے رومن حروف میں "اچھر مال" (ACHHARMAL) کے نام سے ۱۹۳۱ء میں کشمیر ویمنز ویلفیئر ایسوسی ایشن سنیا اگرام پریس سرینگر میں طبع کرکے جاری کیا۔ ملاحظہ ہوں چند اقتباسات:

Mol Măj	Gās" āv	ăs Vath	Lāv buad Sāv
مول ماج	گاش آو	اَس وَتھ	لاو بود ساو
Duod Phyr	Kăr Thav Syaz		Kuang Phulay Laj
دود پھیر	کار تھو سیئز		کونگ پھلے لج

Sinis Trāv Tung

سنس تراو رنگ[1]

یہ کوششیں واضح وجوہات کی بناء پر قبول عام حاصل نہ کرسکیں۔ اولاً اس لئے کہ وادئ کشمیر کی اکثر آبادی ناخواندہ، پسماندہ اور مفلوک الحال تھی، اور پڑھا لکھا محدود طبقہ بھی کشمیری زبان کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اردو کو سرکاری اور دفتری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اس لئے اپنے مقدر اور مستقبل

---

[1] توسخانی صاحب ۔ موتی لال ساقی ۔ شیرازہ اردو ۔ جلد ۲۲ ۔ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۷ ۔ ۹ ۔ مطبوعہ جموں کشمیر کلچرل اکاڈمی۔

سے ناآشنا اکثریت توشخانی صاحب کے مثبت اقدام کو تحریک کا ذریعہ کیسے دے سکتی تھی۔ آج ۱۹۴۷ء کے چالیس سال بعد بھی حالت زیادہ نہیں بدلی ہے۔ کشمیری زبان کو اب بھی نہ عوام کی پشت پناہی حاصل ہے اور نہ ہی سرکار کی سرپرستی۔ گنے چنے ادیب اپنے مفادات اور اپنی اپنی مصلحتوں کے شکار ہیں۔ وہ کوئی تحریک منظم کریں تو کیسے؟ ان حوصلہ شکن حالات میں توشخانی صاحب کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے گھُپ اندھیرے میں چراغ راہ کا کام دیا۔

۱۹۲۹ء میں کشمیری رسم الخط وضع کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی اس کے ارکان میں توشخانی صاحب بھی شامل تھے۔ توشخانی صاحب نے اس دفعہ خطِ نسخ کی بنیاد پر کشمیری رسم الخط وضع کیا۔ اس میں کشمیری صوتیات کو سمونے کی مقدور بھر کوشش کی گئی تھی۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ٹائپ بھی آسانی سے تیار ہو سکتا تھا۔ اعراب کو حروف ہجی میں سمو کر رسم الخط کو ممکنہ حد تک سائنسی بنایا گیا تھا۔ مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے دورِ حکومت میں یہ رسم الخط ۱۹۵۳ء تک سکولوں میں رائج ہوا۔ پہلی سے پانچویں جماعت تک اسی رسم الخط میں نصابی کتابیں بھی تیار ہوئیں۔[1]

ظاہر ہے کہ ۱۹۵۳ء کی سیاسی تبدیلی کی وجہ سے کشمیری زبان کا مستقبل بھی تاریکی کے دلدل میں پھنس گیا۔ ساری کی ساری نصابی کتابیں محکمۂ تعلیم کے گوداموں میں برسہا برس تک سڑتی رہیں۔ سائنسی بنیاد پر تیار کئے گئے اس رسم الخط

---

[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اردو۔ جلد ۲۲، شمارہ ۱ (جنوری ۸۳ء) ص۔ ۹، (۱۹۴۸ء میں تشکیل دی گئی کمیٹی توشخانی صاحب کے علاوہ مرحوم جی اے عشائی، جے۔ لال کول، مرزا عارف پر مشتمل تھی اور ۱۹۵۵ء میں قائم کردہ کمیٹی کے جنرل سیکرٹری ٹی این خزانچی تھے۔ کشمیری رسم الخط کمیٹیوں کی تشکیل ۱۹۴۸ء، ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۵ء میں عمل میں لائی گئی —

(Studies in Kashmiri : J. L. Kaul - Page 23-27

کو خود ساختہ و مفاد پرست دانشوروں اور سیاست دانوں کے کشمیری زبان و کلچر سے نابلد انتظامی مشیروں نے "لچہ دار کاشر" (دم دار کشمیری) کہہ کر تعلیمی اداروں وغیرہ سے اس طرح خارج کردیا کہ اب اسے اپنی سرزمین بھی دھتکار رہی ہے۔ کہ جا تو کون ہوتی ہے میری چھاتیوں کو چھونے والی ۔۔۔!

اس طرح سے کشمیری زبان کے ساتھ اپنی ہی سرزمین پر سوتیلی ماں کا سا سلوک ہوتا رہا ۔۔۔ لیکن یہ سخت جان (ہماری مادری زبان) جو ٹھہری ۔۔۔ ارباب اختیار کو احساس جرم تو ہوتا رہا اور جو کلیدی کوششیں توشخانی صاحب کر چکے تھے وہ بالآخر بار آور ثابت ہوئیں اور دسمبر سنہ ۱۹۵۲ء میں ایک اور کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا نام کشمیری تکمیل کمیٹی (Kashmiri Perfecting Committee) رکھا گیا۔ اسی کمیٹی کی سفارشات پر ہمارا موجودہ مروجہ رسم الخط وجود میں آیا۔ اس طرح توشخانی صاحب کو مروجہ کشمیری رسم الخط کی ترتیب و تشکیل میں کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں ایک اور رسم الخط کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔

بے محل نہ ہوگا اگر سنہ ۱۹۵۳ء تک توشخانی صاحب کے وضع کردہ اور رائج شدہ رسم الخط سے تھوڑی سی شناسائی حاصل کی جائے:

اری تاہ کھاری ژاہری — زیٹھی ناری کھہوان سال

(أریہ کھری ژاری) — (زیٹھی نری کھہوان سال)

ساندرج دوان زالی — تیتی کہاتی پکین ساتی

(سُندی چھ دوان زالی) — (تیتی کتی پکن سیتی)

کوہ کاہ چھیپ نچھپان تاہ پوتی چھ چھیپ چھپان — هند گچھ ناہ کرن

(کوہ کہ چھ نچھپان تہ پوتی چھ سیچھپان) — (هند گرزھ نہ کرن)

تس چھُ چھمبرٹ تد

(تس چھُ ژھوٹ تد)[1]

ریاضی کی نصابی کتاب جو مرتب کی گئی تھی اس میں درج کچھ قابلِ قبول اصطلاحیں ذیل میں دی جاتی ہیں:-

تقسیم = باگرُن / باگ   حاصلِ تقسیم = باگیہ پھل

ضرب = گونُن   حاصلِ ضرب = گونن پھل

جمع = سوم برُن / یکٹرُن   تفریق = والُن

حل کیجیے (Simplify) = ژوٗمرِتھ

یہی وہ مثبت پس منظر تھا جس کے پیش نظر توشخانی صاحب کو نومبر ۱۹۶۶ء میں کلچرل اکیڈمی کے ڈکشنری پروجکٹ کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ اس سے قبل وہ محکمہ تعلیم میں فلاسفی کے پروفیسر رہ چکے تھے اور بہت پہلے ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ ان کی نگرانی میں "لفظہ راش" کے نام سے کشمیری ڈکشنری کی پہلی جلد ۶۹-۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی جسے بعض تکنیکی کوتاہیوں کی بنا پر جاری ہونے سے روک دیا گیا اور بعد میں تلف کر دیا گیا۔ موجودہ کشمیری کشمیری ڈکشنری کی ترتیب و تدوین کا کام، جو سات جلدوں پر مشتمل ہے ۱۹۷۹ء تک مکمل ہوا جس کے بعد توشخانی صاحب ۱۹۸۰ء میں اکادمی کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اُن کا یہ نہایت ہی اہم کارنامہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی کی زیر سرپرستی کشمیر زبان و اُدب کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ اردو ۔ کشمیری فرہنگ، جس کے ساتھ اُنکی نگرانی میں وابستہ رہنے کی سعادت مجھے حاصل رہی ہے بھی ۸۲-۱۹۸۱ء میں پایہ تکمیل

---

[1] توشخانی صاحب ۔ موتی لال ساقی ۔ شیرازہ اردو ۔ جلد ۲۲ ۔ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۱۰ ۔ مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی ۔

کو پہنچی ۔ یہ بھی بارہ جلدوں پر مشتمل ہے ۔ ان دونوں فرہنگوں کی خصوصیت یہ ہے
کہ ان میں الفاظ کے ساتھ ساتھ مواخذ بھی دئے گئے ہیں جن سے انکی سائنسی
بنیاد مستحکم ہوتی ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان لغات میں بعض الفاظ شامل ہونے
سے رہ گئے ہیں ۔ اس بارے میں عرض ہے کہ زندہ زبانوں کے ذخائر الفاظ کا
دامن کبھی نہیں سمٹتا ۔ اس لئے یہ اگلی نسلوں کا فرض ہے کہ وہ اس اہم کام کو
آگے بڑھائیں ۔ جموں و کشمیر میں ۱۹۵۸ء میں کلچرل اکادمی کا قیام ایک فال نیک
تھا ۔ اگر ایسا نہیں ہوتا، تو توشخانی صاحب کی فرہنگ سازی اور زبان دانی
کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور ان کی شخصیت یہاں
بھی تشنۂ تکمیل ہی رہتی ۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں مئی ۱۹۶۲ء میں اکادمی کے شعبۂ لغت سے
وابستہ ہوا کہ توشخانی صاحب الفاظ کے معانی اور مترادفات و مواخذ کی تہہ
تک پہنچنے کے لئے معمولی سے معمولی آدمی کا مشورہ بھی خندہ پیشانی اور شکر کے
ساتھ قبول کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداً شعبۂ لغت کا سارا عملہ ایک ہی بڑے
کمرے میں مل بیٹھ کر کام کرتا ۔ راقم کے علاوہ ایڈیٹوریل سٹاف مرحوم نند لال کول
طالب، محمد احمد اندرابی، چمن لال چمن، محمد احسن احسن، موتی لال ساقی اور بشیر
اختر پر مشتمل تھا ۔ ڈکشنری کا یہ شعبہ صحیح معنوں میں ایک تربیت گاہ تھی جہاں
الفاظ کے باریک سے باریک معانی کی تہہ تک پہنچنے کی مسلسل اجتماعی سعی ہوتی
تھی ۔ توشخانی صاحب پیرسالی کے باوصف الفاظ کے مختلف صوتیاتی انداز عملاً
دکھانے میں خوشی محسوس کرتے تھے ۔ آنجہانی طالب صاحب کا حیوان ظریف
کبھی کبھی جاگ اٹھتا اور وہ کہہ اٹھتے : Don't take it seriously,
"You are being paid for entertainment" (اس کام

کو سنجیدگی سے نہ لیجیے۔ آپ کو تفریح کے لئے تنخواہ ملتی ہے۔

لغت سازی کا کام مکمل ہونے کو تھا تو کشمیری قاموس Encyclopaedia کی ترتیب ہاتھ میں لی گئی۔ توشخانی صاحب نے بھی "مارتنڈ" پر Kashmiriana کشمیری میں ایک نوشتہ (Entry) لکھا جو ان کی آخری تحریر بھی ہے اور یادگار بھی۔ چاہے یہ انسائیکلوپیڈیا کے لئے موزوں و مناسب ہو یا نہ ہو۔

"اننت ناگہ بیہتھ پانژھ میل دور' پہلگامچہ موٹرو تہ چھُ اکھ مشہور تیرتھ متھ' امہ بیہتھ کُن اکہ تھزر پیٹھ پانژہ ہتھر تالہ بیہتھ (آسن گژھ ونہ کھونہ منز) چھُ مارتنڈ مندر' زیٹہ شاہ تخت پیہتھ' لگ بگ ساڈہ ہتھ شتوور ژۄر ژھ بیہتھ اکِس سون درہ انگن نکیس روزتھ۔ شمالہ کنہ چھس سبز لوست ماداوُنہ تہ کھوہ منزی گرہ نیرتھ تالس منز بہژہ کھلہ گراین ماران تہ نیرتھ برونہہ لاران۔ مندرس دور سر پہ لوسنہ طرفہ چھنے سنگریالہ شینہ دستار وڈِ زِ تھ آفتابہ نیرونے گاٹ نہ اوان تہ مارتنڈس یا سری لیس وُچھ وُچھ پھولان ی"[1]

گندمی چہرہ' میانہ قد' دوہرا بدن' سڈول اعضاء' سر پہ کھچڑی سفید بال' طوطے کی چونچ جیسی خوبصورت ناک ـــ اس حلیہ والی شخصیت اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ توشخانی صاحب اعلیٰ پایہ کے ذوق جمال کے قائل تھے۔ وہ اچھا پہنتے تھے چاہے وہ لوٹ ہوتا' گھڑی ہوتی یا جیکیٹ' جب وہ اکاڈمی میں ملازم ہوئے تو اس وقت نیک ٹائی اور سیٹ کا استعمال ترک کر چکے تھے۔ انہوں نے سگریٹ اور پائپ پینا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جو کوئی بھی کپڑا پہنتے' صاف و

[1] توشخانی صاحب ـ موتی لال ساقی ـ شیرازہ اردو۔ جلد ۲۲' شمارہ ۱ (جنوری سنہ ۱۹۸۳ء) ص ۱۴۔ مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈیمی۔

شفاف پہنتے، رنگ کے لحاظ سے نشیب و شباب کی تمیز نہیں برتتے ۔ وہ اکثر غصہ پی جاتے تھے ۔ لیکن ساتھ ہی ذرا سی بات پر جھنجھلاتے[1] ۔ انہوں نے سادگی اور کم خوری کو اپنا شعار بنایا تھا ۔ اعتدال کا دامن تھامے رکھا تھا ۔ جس شادی بیاہ پر لین دین ہوتا وہاں جانے سے احتراز کرتے ۔ سماجی بدعتوں کے کٹر مخالف تھے ۔ حریص تو نہیں تھے لیکن اپنا حق چھوڑنا کار ثواب نہیں جانتے ۔ شاید اسی لئے ہر سال موسم خزاں میں کاشتکاروں سے دھان کا اپنا مالکانہ حصہ وصول کرنے جاتے تھے ۔ وقت کے پابند تھے ۔ زندگی کے آخری ایام تک سائیکل سواری کرتے تھے ۔ شاید اس لئے کہ وقت پر دفتر پہنچ پائیں اور احساس پیری کو بھی شکست دیں ۔ تحقیق کو عبادت گردانتے ۔ اپنی صحیح عمر بتانے سے وہ ہمیشہ ہی احتراز کرتے، یہاں تک دفتر سے مسلسل تقاضے کے باوجود میٹرک پاس کرنے کی اپنی سند پیش کرنے سے کتراتے رہے ۔ حالانکہ عام مشاہدہ ہے کہ صحیح عمر ظاہر نہ کرنے کی کمزوری عورت ذات میں عام ہے ۔ انسانی ہمدردی سے ان کا دل لبریز تھا ۔ اپنے آپ کو کسی بھی مذہب سے الگ گردانتے ہوئے بھی وہ اپنا ایک مذہب رکھتے تھے ۔ شیخ محمد عبداللہ کے خلاف کشمیر سازش کیس (مقدمہ) میں وہ بھی ایک سرکاری گواہ تھے[2] ۔

---

(۱) جہاں تک میں اُنکی اس کیفیت کا تجزیہ کر پایا ہوں مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں یا افسران بالا کے روبرو حق بات کہنے یا انہیں confront کرنے کا یا تو حوصلہ نہیں رکھتے تھے یا پھر از راہ مروت یا مصلحتاً ایسا نہیں کرتے تھے ۔ اسے ہمارے کچھ رفیق کار اُن کی کم ہمتی حتیٰ کہ بزدلی سے بھی تعبیر کرتے تھے (ایڈیٹر)

(۲) اس کے بارے میں ہم نے اُن سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں (شاید) حیدر آباد سے بلایا گیا اور ایک اردو شعر کی تشریح کرنے کو کہا گیا جو شیخ صاحب نے اپنی ایک تقریر میں برتا تھا ۔ اُن سے پوچھا گیا تھا کہ کیا اس سے لوگوں کو بھڑکایا جا سکتا ہے تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تھا ۔ توشخانی صاحب کو گلہ تھا کہ انہیں عدالت میں آنے کیلئے کوئی T.A/DA وغیرہ نہیں دیا گیا ۔ جب ان سے ہم نے پوچھا کہ وہ تو فلاسفی کے پروفیسر تھے پھر اُن کو اردو شعر کی تشریح کرنے کیلئے کیوں بلایا گیا تو وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دے پائے ۔ کہا بس بلالیا' میں کیا کرتا ۔۔۔ ؟ (ایڈیٹر)

بہترین مفکر تھے اور ضدی بھی۔ وہ شدت سے نظم و ضبط کے قائل تھے یشاذ و نادر کھلنے، کھلنے پر آتے تو ساری حدیں پھاند جاتے اور محفل کو زعفران زار بناتے۔ اوقات کار کے دوران کبھی اُن پر نیند کا اتنا غلبہ ہوتا کہ خرّاٹے لینے لگتے۔ عمر کا بھی کچھ ایسا ہی تقاضا تھا۔

کشمیری زبان کے علاوہ جو اُن کی مادری زبان تھی، ہندی، سنسکرت، اردو اور انگریزی پر بطور خاص دسترس رکھتے تھے۔ پہلے بھی اکادمی کے لئے کشمیری کے معروف شاعر پرمانند پر ایک مونوگراف لکھا تھا اور اس کے بعد اکادمی میں آکر بھی موتی لال ساقی کے تعاون سے پرمانند کی کلیات (دوسری جلد) ترتیب دی۔ اکثر پرمانند کا یہ شعر گنگناتے ع

لارُن کینہہ نتہ کوتاہ لارُن
تھارُن پانئے پان آسی سے

(یہ جد و جہد اور یہ تگ و دو کتنی، اور حاصل کچھ بھی نہیں، صرف تمہاری اپنی ذات ہے، جو داؤں پر لگی ہو گی)۔

جب کبھی موڈ میں ہوتے تو ماسٹر زندہ کول کی نظم "ناتیاری" جھوم جھوم کے سناتے۔ توشخانی صاحب کا حلقۂ احباب زیادہ وسیع نہیں تھا لیکن ہندوستان کے ممتاز زبان دانوں بالخصوص شد عیشور ورما سے ان کے قریبی روابط تھے۔ توشخانی صاحب ملک کی اہم لسانی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں ریاست کی نمایندگی کر چکے ہیں۔ مرکزی سرکار کے سابق وزیر داخلہ گلزاری لال نندہ آپ کے پکے دوست تھے۔ جب وہ کشمیر آتے تو توشخانی صاحب سے ملے بغیر واپس نہیں جاتے۔[1]

---

[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اردو جلد ۲۲ شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص۔ ۱۵ (مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی)

توشخانی صاحب نے دو شادیاں کی تھیں۔ دونوں بیویاں یکے بعد دیگرے اللہ کو پیاری ہوئیں۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا تھا جو عنفوانِ شباب ہی میں توشخانی صاحب کو داغِ مفارقت دے گیا۔ اسی کے بطن سے ہوئی لڑکی لکھنؤ میں بیاہی گئی ہے۔ دوسری بیوی سے تین بچے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوئے ڈاکٹر ششی شیکھر توشخانی کے نام سے سبھی واقف ہیں۔ ششی شیکھر کو عہدِ بڈشاہی کے مشہور کشمیری ہندی شاعر بھٹ اوتار کی بانا سُر کتھا پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے۔ وہ آج کل دلی میں مقیم ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ توشخانی صاحب فطرتاً یاسیت پسند تھے۔ البتہ دونوں بیویوں اور ایک جوان بیٹے کے داغِ مفارقت کی وجہ سے وہ خلوت پسند ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر ہی میں سنیاس دھار لیا تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کی وضعداری کے قائل تھے اور کسی کے لئے بوجھ نہیں بننا چاہتے تھے[1]۔ مردم گزیدگی سے کون حساس طبیعت آشنا نہیں؟

کشمیر میں خواتین کی بہبودی کا جھنڈا سب سے پہلے آفتاب کول نظامت (ڈاکٹر سالگرام کول کے والد) نے اٹھایا تھا۔ مگر اس تحریک کو توشخانی صاحب ہی نے منظم کیا جس کے نقوش آج بھی وستا گرلز سکول کی صورت میں نمایاں ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے ہندو ہائی سکول کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ خواتین کی حالتِ زار پر پہلی فلم ۱۹۲۹ء میں توشخانی صاحب نے ہی بنوائی جس میں نمایاں رول شری ٹی۔ این کول (سابق سیکرٹری جنرل وزارتِ خارجہ و موجودہ سفیر حکومت ہند سوویت یونین) نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کی نمائش صرف ایک بار ہوئی جب اسے سرینگر میونسپلٹی کے دفتر میں دکھایا گیا تھا۔

---

[1] توشخانی صاحب کا معمول تھا کہ وہ اپنے کھانے پینے کے برتن خود دھوتے تھے۔ ہم نے دفتر میں اوقاتِ کار کے دوران بھی دیکھا ہے کہ وہ تھرماس میں اپنے لئے دودھ یا چائے ساتھ لاتے۔ اگر انہیں پیاس لگتی تو پانی بھی اُبال کر پیتے اور برتن خود ہی سٹرلائز کرتے۔ (ایڈیٹر)

توشخانی صاحب کو نوزولیبول کے اس رجحان سے بھی سخت نفرت تھی جس کے زیر اثر وہ کشمیری میں بات چیت کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں اور بچوں، بچیوں کو ہنکی، پنکی، پرنسی جیسے غیر مانوس ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں اب بھی دیدر (SKY LARK) بمبر (ریحان) اور کنیج (ابابیل) جیسے روایتی اور پیارے ناموں میں فطری کشش محسوس ہوتی تھی۔ وہ وویشنو تھے ان کے فرزند ششی شیکھر توشخانی نے یہ روایت قائم رکھی ہے۔

توشخانی صاحب تھیوسوفسٹ تحریک اور تھیوسوفیکل سوسائٹی آف انڈیا کی صدر مسز اینی بیسنٹ کے زبردست مداح تھے۔ تھیوسوفسٹ تحریک کے ساتھ آپ کا تعلق اس زمانے میں بھی قائم رہا جب وہ کشمیر چھوڑ کر پونا میں سنیاسی کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس تحریک کا اثر انہوں نے یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے دوران ہی قبول کیا تھا۔ جو ان کی زندگی کے آخری لمحات تک قائم رہا۔ چنانچہ وہ ہر سال سرما میں دو مہینے کی چھٹی لے کر جنوبی ہندوستان جاتے تھے اور وہاں مشہور عالم تھیوسوفسٹ شری کرشنا مورتی کے خطبات سے محظوظ ہو کر واپس آتے تھے۔ وہ اسی بہانے کسی معتبر معالج سے اپنی صحت کی جانچ بھی کراتے تھے۔ چنانچہ وہ حسب معمول جنوبی ہندوستان جاتے ہوئے دہلی میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئے رُکے تھے کہ سیڑھیاں اترتے پھسل پڑے۔ ان کو فوراً ہسپتال پہنچایا گیا جہاں وہ ۲/۳، دسمبر ۱۹۸۱ء کو سورگ سدھارے[2]۔ ان کی آخری رسوم دہلی میں ہی ادا کئے گئے۔ جو وہ چاہتے تھے وہی ہوا۔ زندگی بھر کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ ان کے مرنے وقت بھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی روایتی وضعداری قائم رکھتے چلے گئے

---

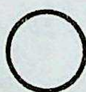
[1] توشخانی صاحب۔ موتی لال ساقی۔ شیرازہ اردو، جلد ۲۲، شمارہ ۱ (جنوری ۱۹۸۳ء) ص ۷۔ ۱۵

[2] ایضاً " " ص ۵۰

مطبوعہ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جہاں انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کشمیری زبان کے لئے وقف رکھی وہاں ان کا بیٹا صرف ٹھیٹھ ہندی میں بات کرنا باعث فخر سمجھتا ہے۔

ڈاکٹر ششی شیکھر کی اطلاع کے مطابق اُن کے سرگباشی والدسری کنٹھ توشخانی کشمیری زبان کے لسانیاتی مطالعہ کا منصوبہ (جس میں کشمیری زبان کی گرامر ترتیب دینا بھی شامل تھا) ہاتھ میں لینے کا ارادہ رکھتے تھے جس کا ابتدائی خاکہ انہوں نے تیار کر کے رکھا تھا صرف چھٹیاں گذار کر جنوبی ہند سے واپس آنے کی دیر تھی کہ مجوزہ منصوبہ پر کام شروع ہوتا۔ کسے معلوم تھا کہ توشخانی صاحب یہ بہت اہم کام ہاتھ میں لینے سے پہلے ہی ہم سے جُدا ہو جائیں گے۔



ارجن دیو مجبور

ٹھاکر پونچھی

"دہلی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا ہو تو خالی بس میں سفر کرنے سے کام نہیں بنے گا، ٹیکسی، سکوٹر، تانگہ، جو کچھ ملے کام میں لاؤ۔" یہ ٹھاکر پونچھی کا مخلصانہ مشورہ تھا۔ بات تب کی ہے جب میں پہلی بار اس پُرخلوص ادیب سے ملا تھا کوئی ستائیس برس پہلے — ٹھاکر واقعی ایک پُرخلوص شخصیت کے مالک تھے۔ پہاڑوں میں جنمے ٹھاکر دہلی میں ہی اُردو ادب کے آسمان پر ایک تارے کی طرح چمکے اور ایک اچھے ناول نگار کی حیثیت سے مشہور رہے۔

آج جب میں ٹھاکر کے بارے میں لکھنے جا رہا ہوں تو وہ سبھی دن میری آنکھوں کے سامنے دوبارہ جنم لے رہے ہیں جن دنوں مجھے انہیں اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ صبح چار بجے وہ بستر سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ کپڑے پہنتے اور آل انڈیا ریڈیو کے لئے روانہ ہوتے۔ نہانا، کھانا پینا سب دفتر کے آس پاس ہی ہوتا جب وہ شام گئے آتے تو خوب باتیں ہوتیں۔ وہ میرے لئے اچھے سے اچھے سگریٹ لاتے اور اپنے ساتھ گھومنے لے جاتے۔

ظاہرا طور پر ٹھاکر ایک مطمئن صورت لئے نظر آتے لیکن اُن سے باتیں کرتے وقت مجھے احساس ہوتا کہ اس حساس ادیب کے اندر ایک زبردست آتش فشاں دہک رہا ہے جس کی حدت، حرارت اور تپش کو برداشت کرنا ایک عام آدمی کا کام نہیں۔

ٹھاکر پونچھی کا جنم ۳۱ دسمبر ۱۹۲۲ء کو پونچھ شہر کے محلہ جرنیلاں میں ہوا۔ ان کے والد ٹھاکر بھیم سنگھ وزیر اُس وقت پونچھ کے راجہ سکھ دیو سنگھ کے اے۔ڈی۔سی تھے۔ انہوں نے ادب نواز طبیعت پائی تھی خورشید یومینی کی کتاب "پونچھ" کے مطابق ٹھاکر پونچھی کو سنگیت سے کافی دلچسپی تھی اور اسی وجہ سے انہوں نے چھٹی جماعت سے ہی ہارمونیم بجانا سیکھ لیا تھا۔ سولہ[16] سال کی عمر میں انہوں نے پونچھ میں ہی میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنے جموں روانہ ہو گئے اور پرنس آف ویلز کالج میں زیر تعلیم رہے۔ وہ ڈراموں میں دلچسپی رکھتے تھے اور کالج کے زمانے میں ہی انہوں نے اپنی پہلی کہانی "کالی مکھی جو جموں کے اردو ہفتہ وار "چاند" میں شائع ہوئی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کی کتاب "کشمیر میں اردو" کے مطابق ٹھاکر کا پہلا افسانہ "راجہ" کالج کے رسالے "توی" میں شائع ہوا۔ اور خود ٹھاکر کے مطابق ان کا پہلا افسانہ "خانہ بدوش" تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انہوں نے پونچھ میں کرشنا ڈراماٹک کلب کی بنیاد ڈالی۔ اور شاردا، چتر لیکھا اور سکندر نامی ڈرامے اسٹیج کئے۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد وہ محکمہ فوڈ اینڈ سپلائز جموں میں بحیثیت ایک کلرک کے بھرتی ہو گئے۔ ان ہی دنوں وہ ریاست جموں و کشمیر سے باہر کے رسالوں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں انکی شادی جموں کے ایک امیر ترین وزیر خاندان میں ہوئی۔ سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد ریڈیو کشمیر جموں سے وابستہ ہو گئے اور بحیثیت ایک ڈوگری نیوز ریڈر کے

کام کرنے لگے ۔ اس وقت جموں ریڈیو کے ڈائریکٹر مشہور اُردو افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی تھے ۔ جب آل انڈیا ریڈیو میں کشمیری اور ڈوگری نیوز یونٹ قائم ہوئے تو سنہ ۱۹۵۰ء میں وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے اور دہلی کی وسعتوں میں زندگی کے بے شمار تجربوں سے اکتساب فن کرتے ہوئے اُردو ادب کی اپنے افسانوں اور ناولوں سے خدمت کرنے لگے ۔

پروفیسر سروری کے مطابق ٹھاکر کے "بیشتر افسانوں میں بڑی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے ۔ افسانے کی ہئیت میں مصنف ایک کہنہ مشق ایکٹر کی طرح اپنی شعوری پختگی سے کام لیتا ہے اور زبان کا بہاؤ پورے رکھ رکھاؤ سے آگے بڑھتا ہے" ۔

ٹھاکر نے کئی کامیاب افسانے لکھے ۔ ان افسانوں میں "زندگی کے موڑ" "چناروں کے چاند" ۔ "موت کے سائے تلے" ۔ "ڈھولک بجتی ہے" ۔ "اندھے کی بیوی" ۔ "معاوضہ" ۔ "زعفران" ۔ "وسوندھا سنگھ زردی" ۔ "بے خواب کواڑ" ۔ "برف کے آنسو" ۔ "ایک بیتے یگ کی پرچھائیں" وغیرہ شامل ہیں ۔ ان کے افسانے "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" (کلچرل اکادمی سرینگر) میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں ۔

ٹھاکر کو پہاڑوں، جنگلوں اور ان کے گرد و پیش سے بے پناہ محبت ہے ۔ اور وہ ان سے کبھی بھی دُور نہیں رہتے ۔ جسمانی طور انہوں نے بائیس ۲۲ برس کا طویل عرصہ دہلی میں گزارا ۔ لیکن اُن کی روح پہاڑوں کی سوندھی مٹی، دلکش نظاروں اور اس کے آس پاس بسی زندگی میں انسانیت کے خواب دیکھتی رہی ۔ اُن کے فن پاروں میں جہاں شہر کا متوسط اور غریب طبقہ جی رہا ہے وہاں غریب پہاڑی لوگوں کی دھڑکنیں، اُن کے سکھ دکھ، انکی محبت، ان کی کہانیاں اور سب سے بڑھ کر اُن کے پیارے پیارے گیت بھرکتے نظر آتے ہیں ۔ اُن کا خلوص

انسانی ہمدردی کی اونچائیوں کو چھوتا ہے، اُن کا دل پہاڑوں پر بسے لاچار لوگوں کی بے بسی پر خون کے آنسو روتا ہے اور اس طرح وہ اپنی پہاڑی دھرتی میں پیدا ہونے کا حق ادا کرتے ہوئے ہماری نظروں کے سامنے کئی سوال پھینکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُنکی نظریں صرف پونچھ کی زندگی کا ہی احاطہ نہیں کرتیں بلکہ وہ بلتستان کی دوریوں اور کشمیر کے زعفرانی کھیتوں کو اپنے اندر سمو لیتی ہیں۔ ٹھاکر کو جاگیردارانہ نظام سے بیحد نفرت ہے اور اس نظام کے پیدا کردہ افلاس کو وہ کئی دکھوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں ایک اشتراکی ادیب ہیں اگرچہ وہ کسی بھی سیاسی نظریئے کا ڈھول پیٹتے نظر نہیں آتے۔ وہ ہر اُس انسان سے پیار کرتے ہیں جو بے بس، بے سہارا اور دُکھوں کا مارا ہے۔

"موت کی موت" افسانے میں، جو ۱۹۷۸ء کے "ہمارا ادب" میں چھپا ہے، وہ دو مزدور دوستوں کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک کشمیری ہے اور دوسرا بلتی۔ دونوں دوست ایک ساتھ رہتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں اور ایک دوسرے کے سُکھ دُکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ جب آخر میں بلتی دوست کی موت واقع ہوتی ہے تو کشمیری مزدور پانچ روپے کا نوٹ لے کر اُس کیلئے ریشمی کفن خریدنے نکلتا ہے۔ جن دکانوں پر بلتی مزدور نے کام کیا تھا اُن میں سے ایک بھی اس کے لئے پانچ روپے کی قیمت پر کفن دینے کو تیار نہیں۔ جب اس کا کشمیری یار بادلِ ناخواستہ واپس لوٹتا ہے اور اپنے دوست کو اسی کمبل میں دفن کرنا چاہتا ہے جو بلتی کے ساتھ عمر بھر رہا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ ایک امیر کا مُردہ کتا ایک شاندار جلوس میں ریشمی کفن میں ملبوس دفنانے کے لئے لیا جا رہا ہے۔ کشمیری کے دل کو کچوکیں لگتی ہیں اور آخر پر وہ اپنے دوست کو کملے کمبل میں لپیٹ کر دفن کر آتا ہے۔

ٹھاکر کے افسانے حقیقت نگاری کے بالکل قریب ہیں اگرچہ انہیں رومانیت

سے بے حد پیار ہے لیکن سچائی اُن کے کرداروں کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ آس پاس کی زندگی سے افسانے کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ ان کی زبان میں روانی اور چاشنی ہے۔ اور جب وہ کرب کو زبان دیتے ہیں تو اُن کا فن بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔ وہ آسمانوں سے اپنے افسانوں کے لئے کردار نہیں لاتے بلکہ انہیں روزمرہ کی عام زندگی سے تلاش کرکے ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے اکثر افسانے طویل ہیں لیکن دلچسپی کے لحاظ سے انہیں آخیر تک پڑھنے کو جی کرتا ہے۔

ٹھاکر کے افسانوں پر پریم چند کا اثر ضرور جھلکتا ہے۔ لیکن وہ کسی کردار کو دیوتا نہیں بناتے۔ وہ ہر کردار کی خوبیوں اور برائیوں کو پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ افسانوں کا گرد و پیش جانا پہچانا اور شناسا سا ہے۔ زبان میں سادگی ہے، برمحل محاورے ہیں، اور زبان حقیقت سے پردہ اٹھا کے ہی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ان عبارات کو پیش کیا جا سکتا ہے:

"...... اور اس کی سونی سونی اندھیری تنہا وادیاں اس جھلک کی ہلکی دھیمی نورانی ضیاؤں سے منور ہو گئی تھیں اور اس کے رُوکھے سُوکھے ذہن میں بھی ننھے منھے ادھ کھلے پھولوں کی مسکراہٹ اُبھرنے ڈوبنے لگی تھی۔ لیکن آج زندگی کی ان حسین اداؤں کے دلفریب اجتماع کو بیج کا امٹ مٹیالہ اجالا اپنے ساتھ سمیٹ کر لئے جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے سرمایۂ حیات کو لُٹتے دیکھ رہا تھا ...... وہ طوفانی رات کس قدر حسین تھی جب کیرتی اسے ملی تھی۔"

۔ (وادیاں اور ویرانے)

"آٹھ سال کے اس طویل وقفے نے ایک دوسری جنگ کو جنم دیا تھا جو ہزارہا میل دور تھی۔ لیکن جس کے خونی شعلوں کا عکس ایک ایک گاؤں،

ایک ایک وادی، ایک ایک گھاٹی پر لرز رہا تھا۔ شعلے ہزار ہا میل دُور تھے لیکن اُن میں سے نکلتا ہوا متعفن دھواں بڑھتا پھیلتا گاؤں گاؤں، وادی وادی اور گھاٹی گھاٹی کو اپنی لپیٹ میں لئے بیٹھا تھا۔"

۰ — (وادیاں اور ویرانے)

"لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ وہاں ایک اجنبی سی خوشبو ہے، اُمید کی خوشبو، ایک زندگی بخش مستقبل کی خوشبو اور خوشبو میں ڈوبا ہوا ایک اچھی ڈیل ڈول والا کھدر پوش نوجوان پہلی نظر میں لگا جیسے یہ کوئی شہر کا بڑا داداہے"۔

۰ — (ابھی بہت دُور جانا ہے)

ٹھاکر کے افسانوں میں آزادی کے بعد کے نئے حالات میں پیدا شدہ سماجی شعور کی جھلک ملتی ہے۔ جاگیرداری نظام کے باقیات سے جو دقتیں عام لوگوں کو پیش آتی ہیں اُن کی عکاسی ان کے کئی افسانوں میں بڑی بے باکی سے کی گئی ہے۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی تفاوت اور کئی طرح کے سماجی اور نفسیاتی مسائل کو ٹھاکر اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔

اپنی موت سے کوئی دو ہفتے پہلے انہوں نے مندرجہ ذیل عبارت میں اپنا دل کھول کے رکھ دیا ہے:۔

"پونچھ ریاست کشمیر کے جاگیردارانہ ماحول میں پیدا ہوا۔ بچپن اور لڑکپن محلات کی چار دیواری میں گزرا۔ جوانی نے بے در و دیوار جھونپڑے کے لئے گھناؤنی اور مسموم زندگی کے اس کرب نے کہانی کار کی نگاہ بخشی پہلی کہانی — "خانہ بدوش"۔ اور آخری کہانی "بہت دُور جانا ہے"۔ پہلا ناول "ڈیڈھی" اور آخری ناول "اب میں وہاں نہیں رہتا" (زیر طبع)

ہے۔ بائیس برس دلّی کی گلیوں کی خاک چھان کر دوبارہ پتھروں کے شہر جموں میں آگیا ہوں۔ کب تک ان پتھروں سے سر پھوڑنا پڑے گا۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ ڈیڑھ درجن چھوٹے بڑے ناول اور دو افسانوی مجموعوں کے علاوہ کئی اچھی بُری کہانیاں اسٹیج اور ریڈیائی ڈرامے لکھنے کے بعد کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جانے اس عمر تک ابھی کچھ لکھا ہے یا نہیں۔ ان دنوں ناول "سورج سمندر میں ڈوبتا ہے" لکھ رہا ہوں۔ "اب میں وہاں نہیں رہتا"، پراچین کشمیر اور آج کے کشمیر یعنی پوری ریاست کا منظر لئے ہوئے ہے۔ اور بہت حد تک Autobiographical ہے"۔

بقول پروفیسر سروری "یہ ادیب اور ناول نگار اکثر سماجی نابرابری، استحصال اور استحصال کرنے والی قوتوں کے خلاف۔ خواہ وہ سیاسی ہوں، مذہبی یا سماجی احتجاج کر رہا ہے"۔

پونچھ نے کئی نظام دیکھے۔ ہندو حکمرانوں کے بعد مغل شاہنشاہ اسی راستے کشمیر وارد ہوئے اور بعد ازاں سکھوں اور ڈوگرہ حکمرانوں کے ماتحت اس ریاست نے کئی شب و روز گزارے۔ اس پہاڑی اور دُور دراز علاقے میں جنم لے کر ٹھاکر نے پونچھ کے امیر و غریب دونوں ہی طبقوں کو بغور دیکھا، پرکھا اور سمجھا۔ وہ محلات کی چکاچوند سے بھی چیخ اٹھے اور پہاڑی زندگی کی مشکلوں نے انہیں افسانہ نگار بنا دیا۔ لیکن جب وہ دلّی کی وسعتوں میں سانس لینے لگے اور ایک عجیب زندگی سے دوچار ہوئے تو افسانے ان کی فنی صلاحیتوں کے لئے تنگ دامن ثابت ہوئے اور انہوں نے بھرپور زندگی کی تصویر کشی کے لئے ناول کا سہارا لیا۔

ان کے ناولوں کی ابتدا "رات کے گھونگھٹ" سے ہوتی ہے۔ یہ ناول اس صنف میں انکی ابتدائی کوشش ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا ناول "ڈیڈی" شائع

کیا اور اس کے بعد "وادیاں اور ویرانے"۔ "یادوں کے کھنڈر"۔ "شمع ہر رنگ میں جلتی ہے"۔ "پیاسے بادل"۔ "زلف سر ہونے تک"۔ "چاندنی کے سائے" اور "اب میں وہاں نہیں رہتا" شائع ہوئے۔ "کشمیر میں اردو" جلد سوئم کے مطابق پروفیسر نیلامبر دیو شرما کی ڈوگری ادب پر تصنیف کا اُردو ترجمہ بھی ٹھاکر پونچھی نے کیا۔ اس کتاب کو ریاستی کلچرل اکادمی نے شائع کیا ہے۔ ان کے کچھ ناولوں کا ترجمہ بنگالی، پنجابی، ملیالم اور ہندی زبانوں میں بھی ہوا ہے۔ "موت کے سائے" افسانے پر انہیں ایک کل ہند افسانوی مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا۔ جس ناول نے ناول نگار کی حیثیت سے ٹھاکر کا مرتبہ بلند کیا وہ ہے ۔ "وادیاں اور ویرانے"۔ اس ناول میں پونچھ کا گرد و پیش اپنے حسن اور قدرتی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ چنانچہ "بہرام گلہ" اور "نوری چھمب" کا تذکرہ اس بات کا شاہد ہے کہ ناول نگار کو یہ مناظر کتنے پیارے ہیں۔ ناول کے اہم کرداروں میں کیرتی۔ مدن رائے سنگھ، رانی، مادھو، بلبیر، کرما، سیٹھ رادھے شام اور سروپ ہیں۔ لاہور کی شام بن نام کی نئی بستی سے لے کر یہ ناول ایک پہاڑی ریاست، جو دراصل پونچھ ہی ہے کے ایک بنگلے جس کا نام ڈوور صاحب کا بنگلہ ہے، تک اپنی منزل طے کر کے واپس لاہور لوٹتا ہے اور یہیں پر ختم ہوتا ہے۔

ناول کے کرداروں میں کیرتی اور مادھو جیسے جیتے جاگتے اور زندہ جاوید کردار ہیں۔ کیرتی ایک امیر گھرانے میں جنم لینے پر بھی مدن رائے سنگھ جیسے امیر اور عیاش نوجوان سے منگنی ہونے کے باوجود، ایک اُجڈ ان پڑھ لیکن خوبصورت اور حساس دل پہاڑی نوجوان سے محبت کرتی ہے۔ لیکن وہ اپنے خاندان کی عزت رکھنے کے لئے چاہتے ہوئے بھی اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ کرما ڈوور صاحب کے بنگلے کا چوکیدار ہے جو کیرتی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہے۔ ڈوور ایک انگریز ہونے

پر بھی ایک پہاڑی دوشیزہ موراں سے عشق کرتا ہے اور جب یہ عشق انتہا کو پہنچتا ہے تو موراں جنگل میں واقع ایک درگاہ پر اپنے لئے موت مانگتی ہے اور موراں کے مرنے کے ساتھ ہی ڈرائیور خودکشی کر لیتا ہے۔

کرما بنگلے میں رہتا ہے، چوکیداری کرتا ہے لیکن اس کا لڑکا کافی دور ایک بس اڈے کی خاک چھانتا رہتا ہے۔ کرما چاہتا ہے کہ وہ اگر اپنی زندگی سکھی نہ بنا سکا کم سے کم مادھو کی زندگی میں تو بہار آئے لیکن اس کے لئے اس کے پاس پیسہ نہیں۔ جب کیرتی دق کی بیماری سے تنگ آ کر ڈرائیور کے بنگلے میں آتی ہے تو مادھو سے اس کی دلچسپی بڑھتی ہے اور اس طرح ایک پہاڑی کا پیار پا کر وہ تندرست ہو جاتی ہے۔ اس کا عیاش اور خودغرض منگیتر کیرتی کو کھوجتے ہوئے اسی بنگلے پر پہنچتا ہے۔ یہاں پر آ کر وہ کیرتی کو صحت یاب دیکھ کر اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ جنگلوں کی سیر کرتا ہے اور اپنے دوستوں کے ساتھ عیش و طرب کے جام لٹاتا ہے۔ ایک بار جب ساری پارٹی ریچھ کا شکار کرنے جاتی ہے تو مادھو مدن رائے کی جان بچا لیتا ہے۔ مدن رائے شادی سے قبل ہی کیرتی کی عصمت لوٹنے پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن مادھو آ کر کیرتی کو بچا لیتا ہے۔ آخر مدن رائے اور کیرتی واپس شہر روانہ ہوتے ہیں۔ مادھو کیرتی کے عشق میں گھلتا رہتا ہے۔ جب اس کا باپ کرما اس کے لئے دلہن لانے کی تیاری کرتا ہے تو مادھو ایک لاری ڈرائیور کی وساطت سے لاہور آ جاتا ہے۔ وہ کیرتی سے ملتا ہے۔ کیرتی بہت خوش ہوتی ہے۔ وہ اُسے کچھ دن رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کے لئے اچھے خاصے کپڑے سلواتی ہے اور اُسے شہری زندگی سے واقف کراتی ہے۔ اس بیچ کیرتی کا باپ سیٹھ مادھے شام مدن رائے سے شادی کی تاریخ طے کرتا ہے۔ سیٹھ مادھو کو واپس گھر جانے کے لئے کہتا ہے۔ کیرتی کو اس سے

بے حد دکھ ہوتا ہے۔ سیٹھ کیرتی اور مادھو کو مدن رائے کے پاس بھیجتا ہے تاکہ اُسے پارٹی میں شرکت کرنے کے لئے لے آئیں اور اُسے ایک چیک پیش کریں۔ جب مادھو بلیسر کے بنگلے پر، جہاں مدن رائے ٹھہرا ہوتا ہے، پہنچتا ہے تو وہ کھڑکی سے دیکھتا ہے کہ مدن رائے شراب میں دُھت ہے اور وہ کیرتی کی سہیلی رانی سے گتھم گتھا ہو رہا ہے۔ رانی چاہتی ہے کہ وہ اُس سے شادی کرے لیکن مدن رائے اڑ بیٹھتا ہے۔ رانی بندوق اٹھا کر مدن رائے کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ مدن رائے بندوق چھین کر رانی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ یہ دیکھ کر مادھو اندر کودتا ہے، اور بیچ بچاؤ میں رانی کے ہاتھ سے اچانک گولی نکلتی ہے جس سے مدن رائے کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامائی ناول میں جگہ جگہ پر جو گیت مادھو کی زبان سے پھوٹ پڑتے ہیں وہ کافی گہرائی تک اُتر کر پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے:-

مکھ گوری دا چن پُنیاں، میرے نین چکور
اپنے ہتھیں آپیوں بجھیا، پائی پریمے دی ڈور

(گوری کا حسین چہرہ پونم کا چاند اور میری آنکھیں چکور کی طرح منتظر — میں نے آپ ہی پریم کی رسّی سے اپنے کو جکڑ لیا)

یا گوری دا چِت لگا چھے دیاں تھاراں

(جوان لڑکی کو چمبے کی پہاڑیوں سے پریم ہو گیا)۔

اگر آج دیکھا جائے تو پہاڑی گیت گانے کا یہ نرل انداز بہت کم ہی ملے گا ان علاقوں میں۔ اس ناول میں ناول نگار نے دلچسپ پھولوں اور پیڑوں کے نام اور گہرے سُرخ، ہرے، سپید، نیلے اور فالسے کے رنگ کا تذکرہ ایک مصوّر کی آنکھ سے کیا ہے۔ ناول میں دیہاتیوں کے اُس گہرے پریم کو اُجاگر کیا گیا ہے جو انہیں اپنے بے حد مانوس کن ماحول سے ہوتا ہے۔ انکی زندگی شہری زندگی سے بالکل الگ اور

اُن کا رہن سہن سادہ ہے پر جذبات، احساسات اور محبت میں وہ شہریوں کے مقابلے میں بہت آگے ہیں۔ اسی زندگی کو دیکھ کر کیرتی شہر کی ناسُور زدہ امیرانہ زندگی سے تنگ آکر ایک خوبصورت لیکن غیرت مند پہاڑی مزدور مادھو سے والہانہ محبت کرنے لگتی ہے۔ لاہور کی شہری زندگی میں ٹھاکر صرف امیر طبقے کی زندگی کی کثافتوں کو ہی ہمارے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ یہاں کی غریبی کی تصویر بھی بڑے ہی دلدوز انداز میں کھینچتے ہیں۔ اسی لئے وہ استحصالی نظام سے چھٹکارہ چاہتے ہیں اور ایک نئے نظام کی تمنا کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر علم دین بھی اس بحث میں شریک ہو گیا تھا۔۔۔ سب ایک ہی نظام کے خواہاں تھے۔ ایک نظام جس میں زندگی اور انسانیت پنپ سکے ...... جو زندگی اور انسانیت کے قریب ہو ..... سب ایسا ہی نظام پسند کرتے تھے۔"

ناول میں ڈوگری کے کچھ موزوں الفاظ کا استعمال بھی ہوا ہے۔ جیسے ترکالال یعنی تڑکے یا صبح۔ باؤلی (چشمہ)، ارکھ (پریم) وغیرہ۔ زندگی کا تصور ناول نگار ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"ہر انسان ایک جیسا ہے، اس کا دل اس کا خیال ایک ہے۔ بھوک اور اس کی بھڑک ایک ہے...... وہ یہی چاہتا ہے کہ جو وسوسے اس کے دل میں ہیں، وہ پورے ہوں۔ لیکن ان کا سلسلہ لامحدود ہے۔ وہ ختم ہونے کو نہیں آتے ہمیشہ پھیلتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وسوسوں اور امنگوں کا نام ہی زندگی ہے۔ اس طرح بنیادی طور پر تو انسان ایک ہے۔ جو فرق ہے وہ ہمارے ماحول اور نظام کا پیدا کردہ ہے۔"

مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمان ٹھاکر کی فنی گرفت، زندگی سے لگاؤ اور نفسیاتی اُتار چڑھاؤ کے بارے میں کہتے ہیں:۔

"مجھے ٹھاکر پونچھی کے فن میں جو رومانوی مزاج ملا ہے وہ تکنیک کے پندار کو توڑنا چاہتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ٹھاکر کی گرفت زندگی پر کسی بھی لمحہ ڈھیلی نہیں پڑتی۔ یہ دونوں باتیں موجودہ ناول نگاروں میں موجود نہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں ان میں وہ جمالیاتی رچاؤ، فنی پختگی، نفسیاتی نقطے اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کہیں نظر نہیں آتے جو مجھے ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ملتے ہیں ..... بلاشبہ جدید دور میں ٹھاکر کے ناولوں نے اردو ادب کی لاج رکھ لی ہے۔ اُن کے فن سے ہماری روایتوں کو آگے بڑھنے کا جو موقعہ ملا ہے اس کی یقیناً ایک تاریخی حیثیت ہوگی۔"

میرے خیال میں اس سے بڑھ کر Recognition ایک ناول نگار کو کیا مل سکتا ہے۔ اس کی وجہ اُن کی گہری نظر، انسان دوستی اور فنی کاوش ہے جس کے لئے وہ آخری دم تک سرگرم رہے۔ "وادیاں اور ویرانے" کی جو کاپی خود ٹھاکر نے مجھے دی تھی اس میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے کچھ حصے نکالنے کے لئے نشان لگائے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ حصے پڑھنے والے کو زبان و بیان کے اعتبار سے اپنی اور کھینچتے ہیں۔ ناول کو ماحول کی بے جا عکاسی سے بچانے کے لئے شاید وہ دوسرے ایڈیشن میں کچھ پیراگراف حذف کرنا چاہتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ناول کی ٹیکنیک کو نئے فنی تقاضوں کے مطابق استوار کرنا چاہتے تھے۔ "پیاسے بادل" ناول میں وہ افسر شاہی کے پردے سے نقاب اٹھا کر مظلوم لوگوں کا پژمردہ چہرہ ان الفاظ میں دکھاتے ہیں:

"۔۔۔جس علاقے میں تحصیلداروں اور کھامیداروں کے ڈیرے پڑتے تھے وہ علاقہ راستے کے اس پڑاؤ کی کہانی دُہراتے تھے جہاں جنگ پر جانے والی فوج رات بھر ٹھہری ہو ۔ وہ مختصر سی رات آس پاس کے لوگوں کے لئے لمبی طویل رات بن جاتی تھی۔ اس رات کی صبح کرنے کے لئے انہیں ہر چیز کی قربانی، ہر چیز کی آہوتی دینا پڑتی ۔ اور جو صبح آتی، وہ اپنے دامن میں اجاڑ، ویران اور ننگی کہانیاں لاتی ۔۔۔"

کشمیر کے چنار کا تصور لے کر وہ اپنے آخری ناول "اب میں وہاں نہیں رہتا" میں ماحول میں پھیلی بے راہ روی، فریب اور جھوٹ کا پردہ فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

"چنار کا تصور کشمیر کا تصور ہے اور کشمیر کا تصور جنت کا تصور ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں چنار کا تصور جب بھی میرے ذہن میں اُبھرا مجھے آگ کی جلن کا لمس محسوس ہوا ۔ ایسا لگا کہ میں چنار کا درخت ہوں اور میرے چاروں طرف آگ کی لپٹیں ۔ میں چار چناری ہوں اور میرے ارد گرد کی جھیل ظلم اور جھوٹ کی جھیل، ناانصافی اور گناہ کی جھیل ہے"۔

اسی ناول میں ایک جگہ وہ ۱۹۴۷ء کے فساد کی داستان بیان کرتے ہوئے انسانیت کی عُریانی پر نوحہ کرتے ہیں :۔

" بدلا ہوا ماحول، اُلجھے ہوئے حالات، ہندو شورش، مسلمان شورش اور سکھ شورش کے ہنگامے ۔ صرف ذہنوں کی سوچوں کی پیداوار سوچیں اور سیاست آج کے انسان کی زندگی ۔ کہیں مذہب کے رنگ میں رنگی ہوئی، کہیں شیطانیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے لیکن انسان ننگا ہے ۔ انسانیت عُریاں ہے"۔

ٹھاکر کی ذاتی زندگی کو جہاں تک میں نے سمجھا ہے وہ ایک بے چین، ذاتی خود غرضیوں سے بالاتر اور دردمند اور حساس دل ادیب کی زندگی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کمایا وہ یا تو اپنی کتابیں چھاپنے پر صرف کیا یا دوستوں کی نذر۔ اُن کے کئی دوست تھے اور وہ کئی ادبی حلقوں سے منسلک تھے۔ ریستورانوں کی چمک دمک میں انہیں اپنی پہاڑیاں پکارتی ہوئی نظر آتیں۔ انہیں کہتیں واپس آؤ ٹھاکر واپس آؤ، ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ لیکن جب ٹھاکر واپس آئے تو سونا بن کر پہاڑ کی دھرتی انہیں سنبھال نہ سکی۔ اُنہیں کم عمری میں ہی نگل گئی۔

۱۹۷۰ء تک وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے اور اس کے بعد ریڈیو کشمیر جموں میں ڈوگری نیوز سروس کے انچارج بنائے گئے۔

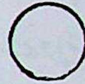
۱۴، اگست ۱۹۷۳ء کو وہ ریڈیو سٹیشن سے گھر جا رہے تھے۔ سڑک پار کر ہی رہے تھے کہ ایک جیپ نے اُن کو دبوچ لیا۔ دوسرے دن وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چل دئے۔ اُن کی زندگی اس پُرسکون سمندر کی طرح تھی جس کے نیچے ہزاروں طوفان پل رہے تھے۔ اُن کے ناول اور افسانے سچ مچ اُردو ادب کے دامن میں موتی بکھر گئے ہیں۔ اگر وہ زندہ رہتے تو کئی اور ناول تخلیق کر لیتے۔

وہ اپنے دوستوں کو لکھنے کی تحریک دیتے رہتے۔ اُن کی کتابوں کے علاوہ ایک یادگار میرے پاس موجود ہے اور وہ ہے آج سے ۲۷ برس پہلے لکھا ہوا اُن کا ایک نوازش نامہ۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ انکی نئی کتاب (ناول) "پیاسے بادل" مارکیٹ میں آگئی ہے اور وہ یہ ناول اور کچھ دیگر پرچے (رسالے) بھجوا رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ تلقین کرتے ہیں کہ میں اپنے سفرنامے کی طرف توجہ دوں اور اس سلسلے میں اُن کا تعاون مجھے حاصل ہوگا۔ خط میں اگرچہ انہوں نے کوئی تاریخ درج نہیں کی ہے لیکن ڈاک خانے کی مُہر سے عیاں ہے کہ خط شاید ۱۹۶۰ء میں

میں لکھا گیا ہے۔

ٹھاکر پونچھی ــــ اردو کا ایک جیالا رکن، کامیاب ناول نگار، دوست نواز اور لوگوں کی دکھتی رگوں کا اپنے قلم سے مداوا ڈھونڈنے والا بلند پایہ ادیب اپنے خوابوں کو پورا کئے بغیر صرف اکاون (۵۱) برس کی عمر میں ہی اپنی ادبی تابناکی دکھا کر ہم سے الگ ہو گیا ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا



نِظہ صاؔب

زندگی کی اونچی نیچی راہوں میں ہمارا سامنا بے شمار چہروں سے ہوتا ہے۔ کچھ چہرے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی ذہن سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی یادوں کی پرچھائیاں چھوڑ جاتے ہیں۔

یادوں کے آئینے میں دیکھئے تو نظہ صاؔب اپنی جمیل و جلیل شخصیت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ زندگی کی حرارتوں سے بھرپور قہقہے — جو اُن کی شخصیت کا ایک حصہ تھے آج بھی صدائے بازگشت بن کر ذہن کی وادیوں میں گونجتے ہیں۔ باغ و بہار شخصیت کے مالک "نظہ صاؔب" رومان پسند بھی تھے اور جہاں دیدہ بھی۔ زندگی کے آخری ایام میں بھی خاصے وجیہہ تھے — لڑکپن ظاہر ہے بہت حسین گذرا ہوگا۔ ازدواجی زندگی کامیاب تھی اور انہیں اپنی اولاد سے بیحد محبت تھی۔ بچوں کو آسودہ حال اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے تھے۔ دو مرتبہ ازدواجی زندگی سے بندھ جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلی بیوی سے دو لڑکے ہوئے اور دوسری بیوی سے تین لڑکیاں

اور تین لڑکے۔ زندگی کے نشیب و فراز سے "نظرِ صاحب" ہمیشہ ہی ہر قدم پر بخوشی گزرتے رہے۔ عموماً تنگدستی اور بے سروسامانی در پیش رہی لیکن بڑی ہی فراخدلی اور خندہ پیشانی سے حالات کا سامنا کیا۔ بچوں سے جب کبھی خفا ہوتے تو ان کی گھن گرج دیکھنے اور محسوس کرنے لائق ہوتی تھی۔ اُن کا پارہ چڑھتا ہی چلا جاتا، اور ایسے میں گئے دنوں کے اساتذہ کی چھڑی اُن کے ہاتھ میں لہراتی نظر آتی۔ بچے سہم کر کونوں کھدروں میں دبک جاتے۔ چھڑی سے فرش کو کافی پیٹتے اور اس کے بعد ان کا ایک بلند قہقہہ ہوا میں بکھرتا۔ بچے اطمینان کا سانس لیتے اور تھوڑی ہی دیر بعد خوشی کے ماحول میں چلا چلا کر کہتے کہ والد صاحب تو بس اداکاری کر رہے تھے۔ اداکاری ان کا جو پیشہ ٹھہرا!

"نظرِ صاحب" — (نظام الدین) کا یوم ولادت ۱۹۰۵ء بتایا جاتا ہے اور تاریخ وفات دسمبر ۱۹۶۷ء ہے۔ جو لوگ ریڈیو کشمیر کی نشریات سے برسوں سے مانوس رہے ہیں وہ مشہور و معروف فیچر "نظرِ صاحب" اب بھی نہیں بھولے ہوں گے۔ "نظرِ صاحب" ایک آن بان والی شخصیت — گفتار کے غازی، بزلہ سنج۔ الفاظ اور اشعار تو دریا کی روانی کی طرح ان کی زبان پر آجاتے۔ ایک خاص وضع سے دستار باندھتے تھے۔ خوبرو، خوش لباس، واسکٹ کی جیب میں رئیسوں کی طرح گھڑی رکھتے — اس کی زنجیر ہر پل چمکتی رہتی۔ "نظرِ صاحب" بنیادی طور پر ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جہاں صوم و صلوٰۃ کی پابندی لازمی تھی۔ غرض اس کنبے کی زندگی روایتی انداز میں ایک خاص طرز پر گذرتی تھی۔ لیکن "نظرِ صاحب" کی سرمست شخصیت ایک دوسرے راستے پر گامزن ہونا چاہتی تھی۔ ان کے اندر چھپا ہوا فنکار باہر آنے کے لئے بضد تھا، بے قرار تھا۔

میں نے ۱۹۵۲ء میں جب ریڈیو کشمیر سرینگر کی ملازمت اختیار کی تو نظرِ صاحب

اُس وقت صوفیانہ کلام پیش کرنے والی ایک منڈلی سے وابستہ تھے۔ اسی سال جناب میر غلام رسول نازکی کی رہنمائی میں ایک فیچر پیش کیا جانے لگا۔ چونکہ یہ فیچر طنز و مزاح سے بھرپور تھا' اس لئے "نظہ صاب" کو ہی اس فیچر میں مرکزی کردار ادا کرنے کے لئے مناسب سمجھا گیا اور انہیں کے نام پہ یہ فیچر "نظہ صاب" کے نام سے نشر کیا گیا۔ سن ۱۹۵۲ء سے ہی انہوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا۔ اور اپنے اندر چھپے فن کار کو پالیا اور سامعین سے اس کا وجود منوالیا۔ اُن کے لئے یہ فیچر سب کچھ تھا ــــ اُن کا اوڑھنا بچھونا ــــ وہ بحیثیت ایک کردار کے اپنی لامثال اداکاری سے فیچر میں روح پھونک دیتے ــــ کون ان کے زندگی آمیز قہقہوں کو فراموش کرسکتا ہے ــــ قہقہے جن کی حدت اور حرارت ایک تحریک بخشتے تھے !!

آج سے سال ہا پہلے جب پہلی بار کشمیری زبان میں گراموفون ریکارڈ سُننے کو ملے تو نظہ صاحب کی صدا بند آواز بھی مارکیٹ میں ملی۔ اس ریکارڈ میں مرحوم تبت بقال مرحوم نظہ صاب سے آغاز میں یہ استدعا کرتے ہیں کہ دلبر کے بارے میں کچھ تو کہیں اور اس کے بعد تینوں فن کار تبت بقال، نظہ صاب اور قادر مجاور اکٹھے مل کر یہ گانا شروع کرتے ہیں۔

زلیم از دل مئے تامنہ شرہ

شہ دلبر واہ ڈیشن کرہ

(کب نکلیگی میرے دل کی حسرت، کب میرے محبوب سے میرا سامنا ہوگا)

افسوس کہ آج ان تین میں سے کوئی بھی فن کار ہمارے درمیان نہیں:

چھوٹے موٹے ڈراموں کے لئے بھی نظہ صاب کی آواز حاصل کی گئی جس کیلئے انہیں گھر سے دور جانا پڑا تھا۔ گراموفون ریکارڈ لاہور اور امرتسر میں

تیار ہوتے تھے اور یہ زمانہ تھا آزادی سے پہلے کا ـــــ ڈرامچوں کا نام تھا کوکری کا پکھ "شوہد" وغیرہ وغیرہ۔

نظر صاحب، جو میرے دوست تھے، رفیق تھے، ہم سفر تھے، ایک بہترین اداکار ایک بلند قامت فن کار تھے ـــــ ایک بار ہم لوگ ایک اسٹیج ڈرامہ کرنے جارہے تھے۔ ریڈیو ڈراموں کے برعکس یہاں اداکار اپنے رول کی مناسبت سے میک اپ کرتا ہے اور زیب تن کرتا ہے۔ ڈرامہ ختم ہوا تو نظر صاحب کو ایک پیاری سی شرارت سوجھی۔ میک اپ کے ساتھ ہی گھر کی طرف چل پڑے۔ رات کا وقت تھا۔ دروازے پر دستک دی۔ بیوی، جو پہلے ہی سے منتظر تھی، نے آواز دی۔

"کون؟"

"دروازہ کھولو۔ میں ہوں" اپنی آواز بدل کر

"میں کون؟" وہ سراسیمگی کے عالم میں بولیں۔

"میں ہوں میں" نظر صاحب شرارت آمیز سنجیدگی کے ساتھ گویا ہوئے۔ دروازے کے اُس طرف تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی!

"ہم بولتا جلدی کرو۔ یہ بتاؤ نظر صاحب کدھر؟"

"ہم کی بولتا تم کی کون؟ اوپر ہے کوئی جلدی نیچے آؤ۔" اندر سے گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

دوسرے ہی لمحے "نظر صاحب" کے نیچے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی کو اپنے سامنے پاکر کچھ حیران، کچھ پریشان ہوئے۔ معاملہ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تو غصے میں آستین چڑھالی اور دو دو ہاتھ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ نظر صاحب نے جب یہ سب دیکھا تو ہوش ٹھکانے آ گئے

اور اپنی identity ظاہر کرنے میں ہی عافیت جان لی!

"ارے بھائی غصہ کاہے کو کرتے ہو؟ — میں ہوں میں — تم لوگوں کا بابا"!

نظرِ صاحب کی حسِ ظرافت تو تیز تھی ہی ان کا مشاہدہ بھی کچھ کم قابلِ رشک نہ تھا۔ آدمی کو نس دیکھتے ہی بھانپ لیتے کہ اس کے من میں کیا ہے۔ چلتے پھرتے افراد کی حرکات و سکنات کی نقل اس کامیابی سے اتارتے کہ ان کی اداکاری کا قائل ہونا ہی پڑتا۔

فیچر "نظرِ صاحب" جو ان کی شہرت اور مقبولیت کا موجب بنا خوش قسمتی سے میرا ہی تحریر کردہ تھا جو گیارہ برس تک بلاناغہ نشر ہوتا رہا۔ اس فیچر میں میں بھی ایک کردار "کینٹھ کاک" کا رول ادا کرتا تھا (کچھ لوگ شاید اب بھی اس کردار کو یاد کرتے ہوں) ۔ "زونہ ڈب" کی روحِ رواں آغا بائے (مریم بیگم) فیچر "نظرِ صاحب" کی بھی جان تھیں ۔ محمد عبداللہ جو میری ہی طرح ریڈیو کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے ہیں فیچر میں نوکر "غلاما" کا رول فنکارانہ چابکدستی سے ادا کرتے تھے ۔

اپنے کام سے کام رکھنے والے "نظرِ صاحب" دوسروں کے نجی معاملات میں دخل دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ خانگی امور اور بچوں کا مستقبل ہمیشہ ہی ان کے مدِنظر رہتا تھا۔ اضطراری لمحوں میں بچوں کے مستقبل کی بات بے ساختہ ہونٹوں پر آجاتی تھی۔ پیسہ جیب میں رہے تو آدمی اطمینان کا سانس تو لیتا ہی ہے لیکن نظرِ صاحب پیسہ نہ ہونے کی صورت میں بھی خود کو خوش رکھنا جانتے تھے۔ روپے پیسے کی بات ہو رہی ہے تو ایک واقعہ یاد آرہا ہے مجھے — مہینے کی پہلی تاریخ ہے۔ واسکٹ کی اندرونی جیب میں تنخواہ رکھتے ہوئے نظرِ صاحب، مجھ سے کہتے ہیں:

"گھر تک جا رہا ہوں لیکن جی۔ کچھ ضروری اشیا گھر لے جانی ہیں گھنٹے بھر تک

واپس آجاؤں گا۔"

بس پندرہ منٹ کے بعد ہی "نفط صاحب" واپس آتے ہیں تو مجھے کچھ گمان سا گزرتا ہے۔

"ارے آپ گئے نہیں گھر؟"

مُنہ سے کچھ کہنے کی بجائے نفط صاحب اپنا داہنا ہاتھ واسکٹ کی اس جیب میں ڈالتے ہیں جس میں بڑے احتیاط سے تنخواہ رکھی تھی۔ لیکن اب جیب کہاں اور تنخواہ کہاں۔؟ "جیب کترا کمال ہوشیاری سے اپنا کام کر گیا ہے"۔ دوسرے ہی لمحے نفط صاحب قہقہوں کا دریا بہاتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ارے جانے بھی دو۔ کون جانے اُس گدھے کی اولاد کو مجھ سے زیادہ حاجت رہی ہو پیسے کی!"

اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُنہیں دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

نفط صاحب نے اُس مہینے کا خرچہ کیسے پورا کیا، مجھے نہیں معلوم۔ میں نے انہیں کبھی کسی سے قرض مانگتے نہیں دیکھا۔ وہ خوش رہنے کے گُر سے واقف تھے۔ ہاں جب کبھی روایتی انداز میں ڈونگے میں جھیل ڈل جانے کا پروگرام بنتا اور کچھ لوگ میٹھ کے حساب لگاتے کہ کتنا خرچہ آئے گا تو نفط صاحب کا چہرہ کئی رنگ بدلتا۔ اگھر کا بجٹ اس "عیاشی" کی اجازت کہاں دیتا ہے بھلا؟ لیکن "نفط صاحب کا اندازِ بیان دیکھئے..... قوتِ تخیّل دیکھئے کہ بیٹھے بٹھائے ہی ہم سب کو جھیل ڈل کی سیر کراتے! تھوڑی دیر کے لئے یہ محسوس ہوتا کہ وازہ وان بھی کھالیا۔ نمکین چائے بھی نوش کی اور نظاروں سے بھی لطف اندوز ہو لئے۔

مجھے ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے۔ اُن دنوں نچلے متوسط طبقے میں ریڈیو سیٹ ہونا باعثِ فخر ہوتا تھا۔ ایک دن کی بات ہے۔ نفط صاحب۔ محمد سلطان

پنڈت، غلام نبی بابا اور راقم الحروف نظر صاحب کی بزرگانہ قیادت میں ایک ریڈیو دکان میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ بہت دیر تک نظر صاحب کبھی ایک تو کبھی دوسرے ریڈیو سیٹ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ بالآخر نگاہِ انتخاب ایک چھوٹے سے سیٹ پر مرکوز ہو کے رہ گئی اور دکاندار نے گویا اطمینان کا سانس لیا۔

"بڑے خوش قسمت ہیں آپ واللہ۔" نظر صاحب نے ایک اچٹتی نگاہ دکاندار پر ڈالی۔

"جانتے ہیں آپ ۔۔۔ ہم سب ریڈیو کشمیر کے ملازم ہیں۔ وقت کے پابند۔ لین دین کے معاملے میں دیانتدار اور ......"

"جناب آپ کی ایمانداری پر کس کو شک ہے۔؟" دکاندار کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"یہ ریڈیو سیٹ ہمیں بہت پسند آیا۔ ہم ایک نہیں پورے چھ سیٹ آپ سے خریدیں گے۔ مگر ایک شرط پر۔"

"شرط ۔۔۔؟ وہ کیا ۔۔۔؟" دکاندار اب بھی کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔

"ہم آپ سے INSTALATION کی بنیاد پر سیٹ خریدیں گے۔" نظر صاحب اپنے مخصوص انداز میں خاصے اعتماد کے ساتھ غلط انگریزی بول گئے۔

"کیا ۔۔۔؟ INSTALMENT BASIS پر خریدیں گے؟ لوکل سیٹ بھی کوئی قسطوں میں خریدتا ہے ۔۔۔؟" دکاندار گویا آپے سے باہر ہو گیا۔

"آپ برادری میں اور بھائی چارے میں یقین نہیں رکھتے واللہ ......" نظر صاحب اعتماد اور اطمینان کے ساتھ بولے اور دکاندار کچھ بکھر کے لئے بڑبڑا گیا۔

ایک روز میں نے ان سے پائے کھانے کی خواہش ظاہر کی اور نظر صاحب

سے کہا۔ "کیا خیال ہے۔؟" دو ایک روز بعد نظر صاحب کچھ قریبی لوگوں کو گھر لے گئے۔ دعوت کا ایسا اہتمام تھا کہ کچھ پوچھئے نہیں۔ اگر آپ اسے میری مبالغہ آمیزی سے تعبیر نہ کریں تو سچ تو یہ ہے کہ ان کے ہاں پکے پایوں کی لذت گویا آج تک بھی نہ بھول پایا ہوں۔

جوانی لغزشوں کا دوسرا نام ہے۔ اور نظر صاحب اپنی جوانی میں بھی بہت حسین و جمیل ۔ ریاست سے باہر کی ایک خاتون انہیں غالباً دل دے بیٹھیں۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ نظر صاحب صاحبِ خانہ ہیں اور صاحب اولاد بھی۔ یہ خاتون صاحب جائیداد تھیں اور ایک طرح سے رئیس ۔ ایک مرتبہ نظر صاحب کو پورے ملک کی سیر کرانے اپنے ساتھ لے گئیں۔ وہ نظر صاحب پر گویا دل و جان سے فدا تھیں۔ جلد ہی نظر صاحب کو احساس ہوا کہ عشق و محبت کے راستے اتنے سہل اتنے آسان نہیں۔ وہ پہلی ترجیح گھر کو دیتے اور گھر کے سکھ کو وہ کسی بھی قیمت پر تیاگنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ بوالہوسی سے خود کو ہمیشہ کے لئے الگ کر لیا۔

زندگی کا قافلہ کبھی رکتا نہیں اور وقت کا دریا ہے کہ بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ وقت کے آئینے میں دیکھئے تو کچھ چہروں، کچھ یادوں کے دھندلے دھندلے نقوش ملتے ہیں اور بس ۔ نظر صاحب آج ہمارے درمیان نہیں لیکن آج بھی ان کے زندگی آمیز قہقہے صدائے بازگشت بن کر ذہن کی وادیوں میں بے ساختہ گونجتے ہیں، ع

اے زاغ دریں باغ تماشا چہ مے کنی
دنیا سرائے فانی است غوغا چہ مے کنی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر